تاریخ پبلی کیشنز کا کتابی سلسلہ (30)

سہ ماہی

تاریخ

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلی کیشنز

18- مزنگ روڈ لاہور

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ الیف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون: 042-6665997

ای میل: mubarakali21@yahoo.com

خط و کتابت (برائے سرکولیشن)

پبلشرز		تاریخ پبلی کیشنز
		18-مزنگ روڈ، لاہور
فون	:	042-7236634
قیمت فی شمارہ	:	100 روپے
سالانہ	:	400 روپے
قیمت مجلد شمارہ	:	150 روپے
بیرون ممالک	:	2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)
		رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	اکرم پرنٹرز لاہور
سرورق		عباس
تاریخ اشاعت		جولائی 2006ء
تقسیم کار	:	فکشن ہاؤس
		18-مزنگ روڈ، لاہور
فون	:	042-7249218-7237430
ای میل		fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

مضامین

☆ بیسویں صدی میں تاریخ نویسی — جیری اے پینیلے/ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی — 7

☆ ایک مختلف جنگی رقص: ہندوستان میں حکومت اور طبقات — اندیوار کامتیکار/ترجمہ: نیئر عباس زیدی — 17

☆ ہندوازم (ہندومت) کا تاریخی ارتقاء — اشفاق سلیم مرزا — 48

☆ درگاہ حضرت علی ہجویریؒ: رسومات، روایات اور تقریبات — غافر شہزاد — 59

☆ ظہیر الدین محمد بابر — پروفیسر قمر رئیس — 69

تحقیق کے نئے زاویئے

☆ امپیریل ازم کے بدلتے نظریات — ڈاکٹر مبارک علی — 137

☆ مغل ریاست — ڈاکٹر مبارک علی — 144

تاریخ کے بنیادی مآخذ

مآثر عالمگیری

مصنف: محمد ساقی مستعد خاں

ترجمہ: مولوی محمد فدا علی طالبؔ

مضامین

بیسویں صدی میں تاریخ نویسی

جیری اے بینٹلے/ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی

جب سے تاریخ نویسی کی ابتداء ہوئی ہے، اس وقت سے مورخ عالمی تاریخ کو اپنا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ قدیم زمانے میں اگرچہ مورخوں اور لوگوں کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ دور دراز کے علاقوں اور ان کے رہنے والوں کے بارے میں معلومات کر سکیں۔ لیکن وہ اپنے تجربات کی بنیاد پر لوگوں کے بارے میں رائے قائم کر لیتے تھے۔ ہیروڈوٹس نے بڑی دلچسپی کے ساتھ ان رسم ورواج اور عادات کے بارے میں لکھا ہے کہ جو اس نے دوسری اقوام میں یا تو خود دیکھے تھے یا جن کے بارے میں اس نے سنا تھا۔ لیکن اس کی تحریروں کا اصل موضوع یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان تصادم تھا۔ سم کیان (Sim Qian) اور بان گو (Ban Gu) جو کہ چینی تاریخ نویسی کے بانیوں میں سے ہیں، انہوں نے اپنی توجہ ہان خاندان کی تاریخ پر رکھی، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے وسط ایشیا کے قبائل اور چین کے ساتھ ان کے تعلقات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اگرچہ تاریخی طور پر تو نہیں، مگر عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو مذہبی کتابیں، دیومالائی داستانیں اور قصے، جو کہ قدیم عہد میں مشہور ہوئے، ان سب میں عالمی تاریخ کا وژن نظر آئے گا۔ مثلاً دنیا کی پیدائش، اس کی آبادی، مختلف اقوام کی تہذیب، اور ان کا کلچر، ان سب کو عالمی پس منظر میں دیکھا گیا ہے۔

دنیا کے بارے میں لوگوں کی یہ دلچسپی برقرار رہی۔ آج بھی لوگ قدیم کلچر، اس کی اہمیت، اور مختلف کلچروں کے درمیان ہونے والے اشتراک سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ عہد وسطیٰ کے مورخ تاریخ نویسی میں ابتداء کرتے ہوئے، یہودیوں، رومیوں، اور عیسائیوں کے بارے

میں لکھتے تھے۔ سم کیان اور بان گو دونوں خاندان کی تاریخ لکھتے ہوئے خانہ بدوش قبائل کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ابن خلدون تاریخ لکھتے ہوئے ریاست، اور سماج کے بارے میں گہرائی کے ساتھ لکھتا ہے۔

یورپ میں روشن خیالی کے زمانے میں والٹیر، مان ٹسکو، اور لائب نز، نے کوشش کی ہے کہ چین اور ایران کی تہذیب اور ان کی روایات کے بارے میں لکھیں، اور اسے دنیا کی قدیم تاریخ سے جوڑ دیں۔

جدید عہد میں عالمی تاریخ کو جس تناظر میں لکھا جا رہا ہے، وہ اس سے مختلف ہے کہ جو ماضی میں مورخ لکھ رہے تھے۔ ان کا موضوع مجموعی طور پر انسانی سماج کا ارتقاء، ترقی، اور اس کے ساتھ کلچر کی بوقلمونیوں کو مرکز بنانا تھا۔ لیکن جدید مورخوں کو اس سے دلچسپی نہیں ہے کہ تاریخی واقعات کو ترتیب وار بیان کر کے تاریخی عمل کو سمجھا جائے۔ ان کی تحریروں میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے، ان میں جنگیں، تکنالوجی، مختلف کلچروں میں باہمی روابط، تجارت، بیماریوں کا پھیلنا وغیرہ شامل ہیں۔ ان مورخوں کے لئے ان موضوعات پر لکھنا اس لئے ممکن ہو سکا ہے، کیونکہ اب انہیں تحقیق کی سہولتیں میسر ہیں، اور کام کرنے کے لئے مواد بھی دستیاب ہے۔

جدید مورخ اب تاریخ لکھتے ہوئے موضوعات کو تھیوری کی بنیاد پر بیان کرتے ہیں، اور تاریخی عمل میں مفہوم تلاش کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی بھی کوشش کر رہے ہیں، کہ ان لوگوں کی تاریخ کو بیان کریں کہ جو اب تک تاریخ سے غائب تھے۔

ابتدائی مورخوں میں ہم تعصب اور تنگ نظری کو بھی دیکھتے ہیں، اگر چہ آج کے مورخ بھی اس سے بالکل مبرّا نہیں ہیں، اور ان میں بھی اپنی قوم اور ملک کے بارے میں احساس برتری کے جذبات نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود جب وہ دوسری قوموں اور ملکوں کے بارے میں لکھتے ہیں تو ان میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ ان کی تاریخ کو منصفانہ انداز میں تعصب سے دور رہتے ہوئے پیش کریں۔

اس کی ایک مثال والٹیر کی ہے کہ جو یقیناً یورپی تہذیب کو چینی تہذیب پر فوقیت دیتا تھا، مگر جب وہ دونوں کے مذاہب کا مقابلہ کرتا ہے تو عیسائیت پر تنقید کرتا ہے اور اس کے مقابلہ میں چین کے کنفیوشس مذہب کی تعریف کرتا ہے۔ یہاں پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ والٹیر نے یورپ کو ذہن میں

رکھتے ہوئے چین کا تجزیہ کیا۔ اس طرح یورپی مرکزیت اس کے ذہن میں تھی۔

لیکن اب بیسویں صدی میں تجزیاتی اور پیشہ وارانہ طور پر لکھی ہوئی دنیا کی تاریخ سامنے آئی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں: ایک تو علم کا پھیلاؤ ہے، جس کی وجہ سے مورخوں کو اب دنیا کے بارے میں بہت زیادہ معلومات مل گئی ہیں جس نے انہیں دنیا کی تاریخ کے بارے میں وسیع اور گہرا مفہوم دیا ہے۔ دنیا کی تاریخ کے بارے میں یہ عالم ماہر آثار قدیمہ، ماہر لسانیات، ماہر بشریات، اور جغرافیہ داں ہیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں معلومات کو اکٹھا کر کے، مورخوں کے لئے اس قدر مواد فراہم کر دیا ہے کہ جو اس سے پہلے انہیں میسر نہیں تھا۔

اس کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں پیشہ وارانہ مورخ ابھرے کہ جنہوں نے اپنے مضمون کو انتہائی سنجیدگی سے لیا۔ اسی دوران دو خوفناک جنگوں نے مورخوں کی توجہ اس امر پر دلائی کہ وہ کلچروں کے درمیان اختلافات کو دیکھیں، اور دوسرے ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کر کے، ان کی روایات اور رسم و رواج کو سمجھیں۔ اس تناظر میں انہوں نے بحیثیت مجموعی پوری انسانی تہذیب، اس کے ارتقاء اور ترقی کا مطالعہ کیا۔

بہرحال اسکالرز اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ عالمی تاریخ کو ایک نئے اور تازہ نقطہء نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو کر آتی ہے کہ دنیا کی تاریخ کی تشکیل میں تقریباً ہر قوم اور ملک کا حصہ ہے۔ اس لئے عالمی تاریخ کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی اقوام اور ان کے تجربوں کو کہ جن سے عالمی تہذیب کی تعمیر ہوئی، اس کو سامنے لایا جائے۔ اس مرحلہ پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تاریخ کو کس طرح سے لکھا جائے؟ کیونکہ عالمی تاریخ کا مطلب مختلف لوگوں کے لئے، مختلف سوچ اور فکر کا ہے، ہر قوم اسے اپنی نظر سے دیکھتی ہے، اور اس کا مطلب نکالتی ہے۔ اس لئے خاص طور سے بیسویں صدی میں اس کی بہت سی شکلیں بنیں گی۔

اس مضمون میں قدیم ماضی کا تجزیہ، ان اسکالرز کی تحریروں کی روشنی میں کیا جائے گا کہ جنہوں نے تاریخ کے موضوعات پر لکھا ہے۔ یہ لکھنے والے تین قسم کے ہیں: فلسفہ تاریخ کے ماہر، سماجی علوم کے ماہر، اور پیشہ ورانہ مورخ، اور آخر میں اس کا جائزہ لیا جائے گا کہ بیسویں صدی میں تاریخ نویسی کے کیا رجحانات ہیں؟

فلسفہء تاریخ کے ماہر یا مفکرین

اس کی ابتداء، آسوالڈ اشپینگلر اور آرنلڈ ٹوائن بی کی تحریروں سے ہوتی ہے کہ جنہوں نے عالمی تاریخ کو وسیع تناظر میں دیکھا۔ ان کے بعد جن لوگوں نے ذرا محدود انداز میں عالمی تاریخ کا جائزہ لیا ان میں ایچ۔ جی۔ ویلز (H. G. Wells)، پی ٹی رم سوروئے کن (Pitirim Sorokin)، کارل جیسپرس (Karl Jaspers) اور دوسرے مفکرین شامل ہیں۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی کہ جنہوں نے دنیا کو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران دیکھا تھا۔ اس ماحول میں انہوں نے یورپی تہذیب کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں تجزیہ کیا۔ لیکن ان کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے یورپ کے علاوہ دنیا کی دوسری اقوام اور ان کے سماجوں کا مطالعہ کیا، جس نے ان کی تحریروں کو عالمی تاریخ کی تشکیل میں مدد دی۔

لیکن ان میں کوئی بھی، تاریخ داں، یا مورخ نہیں تھا۔ مثلاً ٹوئن بی، کلاسیکل ادب کا ماہر ہونے کی وجہ سے تاریخی اسکالرشپ سے مانوس تھا۔ مگر ویلز تو ایک ناول نگار تھا، اور سوروئے کن عمرانیات کا ماہر تھا۔ اس طرح سے دوسرے مفکرین کا حال تھا کہ جن میں فلسفی، مذہبی علوم پر دسترس رکھنے والے، یا سیاسیات کے اسکالرز تھے اس لئے ان میں سے کسی نے ان ذرائع اور طریقوں کو استعمال نہیں کیا کہ جو پروفیشنل مورخ اختیار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں نے تاریخ کی وسعت اور سنجیدگی کو کسی ایک نظام یا قانون میں محدود کرنے کی کوشش کی۔

لیکن دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے تاریخ کے ان مفکرین نے عالمی تاریخ کی تشکیل میں اہم حصہ لیا۔ یہاں ان کی دو خاص باتوں کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ ان مفکرین نے سماج کے پیچیدہ عمل جس کو تہذیب کہا جاتا ہے اس کی پوری طرح وضاحت کی۔ اور اسے عالمی تاریخ میں شامل کر کے، تاریخی ماحول میں اس کا تجزیہ کیا (موجودہ دور میں کافی اسکالرز تہذیب کی جگہ پیچیدہ سماج کی اصطلاح کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ تہذیب کی اصطلاح میں مغرب کے نقطہء نظر سے بہت سے معاشرے شامل نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے ان اسکالرز کے نزدیک عالمی تاریخ کے تجزیہ کے لئے یہ درست نہیں ہے)

دوسرے یہ مفکرین اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ لوگوں اور مختلف سماجوں کے درمیان روابط کی

وجہ سے تاریخی عمل پر ان کا گہرا اثر ہوا ہے۔ اگر چہ یہ تہذیبوں کے ملاپ کے قائل نہیں ہیں، لیکن وہ ایسے پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں کہ جن کی مدد سے کلچروں کے اشتراک اور ٹکراؤ کو سمجھا جا سکے۔

بیسویں صدی سے پہلے کے مورخوں نے تاریخ میں معاشروں کے سماجی پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ انیسویں صدی میں جب کہ قومی ریاست کا ادارہ اپنی بھرپور دلکشی کے ساتھ ابھرا تو مورخوں کی توجہ اس کی جانب ہوگئی اور انہوں نے قومی ریاست کے ارتقا، اس کی اہمیت، اور اس کے فنکشن کے بارے میں تجزیہ کیا، اور اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی کہ اس کے نتیجہ میں ایک بین الاقوامی نظام کیسے وجود میں آیا۔ اس تناظر میں مورخوں نے سیاسی، معاشی اور سماجی قومی فریم ورک میں تجزیہ کرتے ہوئے، تاریخی عمل کی نشان دہی کی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں احساس تھا کہ تاریخی عمل کو سمجھنے کے لئے قومی ریاست سے زیادہ وسیع اور پیچیدہ یونٹ کی ضرورت ہے۔

جب ایک پیچیدہ سماج کا تصور ابھرا، تو اس نے تجزیہ کے لئے وسیع تناظر میں مورخوں کو موقع دیا کہ وہ انسانی سماج اور اس کے عوامل اور ارتقاء کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکیں۔ اگر چہ ''پیچیدہ سماج'' کا تصور ہر مصنف کے نزدیک جدا جدا ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں اصولی طور پر تسلسل ضرور موجود ہے۔ مثلاً اپنی کتاب ''زوال مغرب'' میں اوسوالڈ اشپینگلر نے جن پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے وہ انہیں کلچر کا نام دیتا ہے جو کسی بھی سماج کی توانائی اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعہ ابھرتا اور پروان چڑھتا ہے۔ اس لئے ہر تاریخی کلچر اپنا علیحدہ اسلوب اور طرز رکھتا ہے، جس سے اس کے مختلف پہلو جن میں آرٹ، موسیقی، فلسفہ، مذہب، سائنس، سیاسیات اور معیشت شامل ہیں۔ اس کے زیر اثر تشکیل پاتے ہیں۔ اپنے ابتدائی دنوں میں ایک ابھرتا اور ترقی کرتا ہوا کلچر توانائی سے بھرپور ذہنی ورثہ نہ چھوڑتا ہے، لیکن آخری دنوں میں جب کلچر کی توانائی خستہ ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ بنجر اور تقلیدی تخلیق اپنی اصطلاحات کے اس فرق کے باوجود اشپینگلر ''تہذیب'' کا نام دیتا ہے اپنی اصطلاحات کے اس فرق کے باوجود اشپینگلر کلچر اور تہذیب دونوں کو ایک شکل اور پیچیدہ سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی عناصر کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

انسانی سماج کو وہ ایک نامیاتی یونٹ سمجھتا ہے، جو کہ انہیں ارتقائی ادوار سے گذارتا ہے جیسے کہ ایک فرد۔۔۔ پیدائش، اور پھر ارتقائی مراحل سے گذرنے کے بعد یہ زوال پذیر ہو جاتا ہے، اور بالآخر اپنے وجود کو ختم کر دیتا ہے۔

اشپینگلر کے نزدیک کلچر اور تہذیب، اپنی علیحدہ خصوصیات کے باعث دوسروں سے بالکل علیحدہ ہوتے ہیں، ان کی ابتداء اور ترقی بھی علیحدگی ہی میں ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے کردار اور خصوصیات سے ان کی شناخت کا تعین کیا جاتا ہے۔

اشپینگلر نے اپنی اس تھیوری کو دنیا کے دوسرے معاشروں پر نہیں آزمایا۔ درحقیقت اسے ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ لیکن جن سماجوں کا اس نے تجزیہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے ان کی ابتداء، ترقی اور زوال کے بارے میں کافی معلومات تھیں۔ ان کو وہ تین میں تقسیم کرتا ہے، پہلی کو اپولینین (Appollinian) کہتا ہے، اس سے اس کا مقصد ان کے کلاسیکل کردار سے ہے، جن میں یونان اور روم شامل ہیں۔ اس کے بعد ماگین (Magian) سماج جو کہ ابتدائی یہودیت، عیسائیت، اسلام اور بازنطینی اقدار پر پروان چڑھا۔ تیسری فاؤسٹین (Foustian)۔ اس میں جدید مغربی تہذیب ہے۔

وہ اپولینین کو عقلیت پسند قرار دیتا ہے کہ جس کی بنیاد پر موجودہ عہد جارہا ہے، ماگین تصوف پر مبنی اور آخرت کے بارے میں متفکر رہتی ہے۔ فاؤسٹین ایک عملی سماج ہے جو برابر متحرک ہے اور ہر شے پر انسانی تسلط کا خواہش مند ہے۔

ان تینوں تہذیبوں کی یہ خصوصیات ان کے کلچر کے ہر پہلو میں نظر آئیں گے، مثلاً فن تعمیر میں اپالونین سماج کی عمارات میں ہم آہنگی، مضبوطی، ماگین عمارتیں کم روشنی والی اور گنبدوں میں محصور ملیں گی جیسے آرتھوڈوکس عیسائیوں کے چرچ اور مسلمانوں کی مسجدیں، فاؤسٹین بلند و بالا گوتھک طرز کے کیتھڈرل تعمیر کراتے ہیں، جن سے لافانی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

ریاضی میں اپالونین اپنی توجہ جیومیٹری پر مرکوز رکھتے ہیں تاکہ وہ جگہ کے استعمال کو بہتر طریقہ سے استعمال کرسکیں۔ ماگین نے الجبرا میں دلچسپی لی جو کہ غیر معلوم مقدار کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ فاؤسٹین نے کال کولس (Calculus) ایجاد کیا تاکہ وہ لامحدود کو محدود کرسکیں۔

اس طرح اشپینگلر نے ہر سماج کی علیحدہ خصوصیات اور ان کے کرداروں کی وضاحت کرتے ہوئے، ان کی علیحدگی کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر دیا ہے۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سماج ایک دوسرے سے رابطے میں آتے ہیں اور ان کے کلچروں کا اشتراک ہوتا ہے تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ کیونکہ لوگوں کا آپس میں ملنا اور کلچرل

روایات کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا، تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ اس لئے کسی ایک ایسے نقطۂ نظر یا تھیوری کی ضرورت ہے کہ جو کلچروں کے اس ملاپ کو درست اور تنقیدی انداز میں دیکھ سکے۔ اشپینگلر کا استدلال ہے کہ سماج دنیا کو اپنی عینک سے دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ دوسرے سماج کے نقطۂ نظر کو جس سے وہ دنیا کو دیکھ رہا ہے، سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس لئے ایسی تمام کوششوں کو کہ جس میں ایک کلچر سے باہر کی دنیا کو دیکھا جائے، اسے اشپینگلر گمراہ کن عمل کہتا ہے۔ کیونکہ کوئی سماج دوسرے کی زندگی میں داخل نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے اگر کوئی کلچر اپنی حدود سے باہر نکل کر پھیلنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کے نتیجہ میں وہ متاثر علاقوں اور لوگوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اس لئے کلچر کے پھیلاؤ کے اس عمل سے دوسری سماج اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کی مثال وہ روس سے دیتا ہے کہ جس کا کلچر بنیادی طور پر ماگین ہے، مگر موجودہ صدیوں میں اس نے مغرب سے متاثر ہو کر فاسٹین کلچر کو اختیار کر لیا ہے۔ اشپینگلر اگرچہ یہ نہیں بتاتا ہے کہ کلچروں کے اس تصادم کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مگر دوسری طرف وہ واضح طور پر کہتا ہے کہ اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔

اشپینگلر کے نقطۂ نظر میں کئی کمزوریاں ہیں۔ اس کے تنقید نگار اس کی انتہا پسندی، سطحیت اور اس دکھاوے کی علمیت، اور کبھی کبھی احمقانہ دلائل کا مذاق اڑاتے ہیں موجودہ زمانے میں کم ہی اسکالرز ہوں گے جو اشپینگلر کی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ ہر کلچر کی ذات بالکل علیحدہ ہوتی ہے کہ جس کے زیر اثر سماج کے معیشت، سیاست اور دوسری خصوصیات پروان چڑھتی ہیں۔ بہت سے اس پر بھی اعتراض کرتے ہیں کہ جہاں اشپینگلر کہتا ہے کہ مختلف سماج اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت نہیں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اشپینگلر کے تصورات اور نظریات میں بہت سے مسائل ہیں، مثلاً وہ کلچر اور تہذیب کی کوئی ایک مکمل تعریف کرنے سے قاصر ہے، اور نہ ہی اس نے ان دونوں کا صحیح طور پر تجزیہ کیا ہے۔

لیکن ان کمزوریوں کے باوجود اشپینگلر کے کام کا عالمی تاریخ کے ابھار اور ترقی پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اس کی پہلی اہمیت تو یہ ہے کہ اس کے پاس ایک وسیع اور پھیلی ہوئی کینوٹی کا ذکر ہے کہ جو ایک پیچیدہ سماج ہے کہ جس کے تاریخی، سماجی، معاشی، اور کلچر پہلو مل کر اس کی شناخت کو متعین کرتے ہیں۔

آرنلڈ جے۔ٹوئن بی

اشپنگلر کے بعد آنے والے مفکرین اس کے نظریات سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ جب ٹوئن بی نے اس کی کتاب ''زوال مغرب'' پہلی بار پڑھی تو اس کو خیال ہوا کہ اس موضوع پر مزید لکھنا بیکار ہے لیکن اس نے تاریخ کا تجزیہ جاری رکھا اور 12 جلدوں میں ''مطالعہ تاریخ'' کے عنوان سے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار واضح اور صاف انداز میں کیا اس نے وضاحت کی کہ ایک پیچیدہ اور وسیع سماج اس کو کبھی وہ سوسائٹی کہتا ہے اور کبھی تہذیب تاکہ مورخ اس کا بھرپور اور پر معنی تجزیہ کر سکیں۔ ٹوئن بی نے اشپنگلر کے برخلاف یہ دلیل دی کہ قومی ریاست کا موضوع، ان مورخوں کے لئے کہ جو سوسائٹی کا وسیع تناظر میں تجزیہ کرنا چاہتے ہیں مناسب مواد فراہم نہیں کرتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب پھیلے ہوئے یونٹ، جیسے ہندو انڈیا، کنفیوشس کا چین، یا مغرب کی عیسائیت کا مطالعہ کیا جائے۔ اس مطالعہ کے نتیجہ میں سماج کی پیدائش، بلوغیت اور زوال کے عمل کو سمجھا جا سکے گا۔

ٹوئن بی نے دنیا کی ان تمام سوسائٹیز کا مطالعہ کیا کہ جو اب تک اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے جس قدر مواد ممکن تھا اسے حاصل کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے ان سوسائٹیز کی پیدائش، عروج اور زوال کا تجزیہ کیا۔ اس پورے عمل میں اس نے جس کا مشاہدہ کیا وہ ''چیلنج اور اس کے جواب'' کا فارمولا تھا کہ جس کے زیر اثر ہر سماج رہا ہے۔ اشپنگلر کے برعکس ٹوئن بی تاریخ کے عمل کو ایک چکر یا گردش میں گرفتار دیکھتا ہے۔ لیکن وہ اس کا قائل ہے کہ افراد کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت سماج میں تبدیلی کا ذریعہ ہو سکتی ہے، اور یہ اقلیتی افراد اپنے سماج کو زوال کے عمل سے دور لے جا سکتے ہیں، اور اس میں لڑائی کی نئی روح پھونک کر، نئی روایات اور قدریں تشکیل دے سکتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں سماج امن وامان اور خوش حالی سے دوچار ہو سکتا ہے۔ تاریخ میں مختلف سوسائٹیز کے مطالعہ کے بعد ٹوئن بی اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ سماج یا تو زوال پذیر ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں، یا پھر ایک نئی شکل میں دوبارہ سے جنم لیتے ہیں لیکن وہ پیدائش، جوانی اور موت کے عمل کو سماج پر منطبق نہیں کرتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ سماج میں تبدیلی کے عناصر موجود ہوتے ہیں، جو اسے ایک نئی زندگی دے سکتے ہیں۔

دیکھا جائے تو کئی لحاظ سے ٹوئن بی کی کتاب ''مطالعہ تاریخ'' نے اشپینگلر کے دیئے ہوئے نظریات کو بہتر طریقہ سے سمجھنے میں مدد دی۔ ٹوئن بی نے اشپینگلر کے مقابلہ میں انسانی سوسائٹی کا زیادہ منظم اور وسیع تناظر میں تجزیہ کیا ہے۔ اس نے یورپ اور ایشیا کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ لیکن اس نے جنوبی وشمالی امریکہ کے بارے میں بہت کم لکھا ہے اور افریقہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اس نے اشپینگلر کی طرح انتہا پسندانہ، الجھے ہوئے، اور تصوراتی بیانات نہیں دیئے بلکہ دلائل اور عام فہم زبان کے ساتھ تاریخی عمل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

ٹوئن بی نے، اشپینگلر کے برخلاف، بہتر انداز میں مختلف لوگوں، اور کلچروں کے آپس میں اشتراک پر بھی بحث کی ہے۔ اشپینگلر کے ہاں مختلف کمیونٹیز ہیں باہمی میل ملاپ کی بہت کم گنجائش ہے۔ مختلف کلچروں کے ملاپ سے مثبت نتائج نکلنے کے بجائے، مضر اثرات ہوتے ہیں۔

ٹائن بی بھی کلچروں کے آپس میں اشتراک کو امید افزا نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک جب باہر کا کلچر کسی سماج میں آتا ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ یہ سماج کی اپنی قدروں اور روایات کی نفی کرتا ہے، اور اپنے تسلط کو قائم کرتا ہے۔ لیکن وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ کس طرح سے ٹکنالوجیکل، سیاسی اور کلچرل اثرات اپنی سرحدوں سے نکل کر دوسرے علاقوں میں جاتے ہیں۔ اور وہاں تبدیلی کے عمل کو پیدا کرتے ہیں۔

لیکن وہ اس عمل کو قابل تحسین نہیں سمجھتا ہے کہ ایک کلچر اپنے علاقہ سے نکل کر دوسرے میں جائے اور وہاں اثر انداز ہو۔ جیسے کہ افریقی امریکی..... یورپی امریکی موسیقی پر اثر انداز ہوئے۔

لیکن پروفیشنل مورخوں نے ٹوئن بی کے کام کو بڑی سرد مہری کے ساتھ لیا۔ انہوں نے اس وسیع مطالعہ، اور علمیت کو تو تسلیم کیا، مگر اس کی تحریروں کو کئی اعتبار سے تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ اس نے ماضی کی بوقلمونی اور پیچیدگی کو اپنے ایک خاص نظام اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بیان کر کے، تاریخی عمل کو سادہ اور چند قوانین کا پابند بنا دیا ہے۔ ٹوئن بی کے بقول اس نے دوسری سوسائٹیز کو بھی یونانی ماڈل پر پرکھا، اور اس طرح اس نے انسانی سماج کی ایک عمومی تعریف کر کے، دوسری سوسائٹیز کی اندرونی کارروائیوں اور عمل کو نظر انداز کر دیا۔ اس لئے، جو مورخ کے اپنے اپنے دائرہ کے ماہر ہیں، انہوں نے کہا کہ ٹوئن بی نے چین، شمالی وجنوبی امریکہ، اور اسی طرح سے دوسرے سماجوں کے بارے میں غلط اطلاعات دیں اور غلط نتائج

نکالے۔اس وجہ سے ٹوئن بی کی علمیت، اس کے تجزیئے، اس کی فکر ونظر، یہ سب پیشہ ور مورخوں کو متاثر کرنے میں ناکام رہے۔

1950 کی دہائی سے فلسفہء تاریخ سے لوگوں کو جو دلچسپی اور لگاؤ تھا، وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا، اگر چہ یہ پوری طرح سے ختم تو نہیں ہوا ہے۔اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حال ہی میں ''ارک فوگ لن'' (Eric Vogelin) فلسفہء تاریخ کے موضوع پر 5 جلدوں پر مشتمل کتاب لکھی ہے، جس کا ٹائٹل ہے ''آرڈر اینڈ ہسٹری'' (Order and History)۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مورخ اور مفکر دونوں اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ تاریخ کے عمل کو کسی خاص منصوبے یا قوانین کے اندر رہتے ہوئے دیکھنا فائدہ مند نہیں ہے۔اس لئے اب کئی دہائیوں سے وہ عالمی تاریخ اور تاریخی عمل کو سمجھنے کے لئے کسی تصوراتی منصوبے کے بجائے اس عمل کو اس سے علیحدہ کر کے دیکھ رہے ہیں۔اس سلسلہ میں سماجی علوم کی نئی تحقیقات سے متاثر ہو رہے ہیں کہ جنہوں نے گلوبل مسائل کو جدید دنیا کے تناظر میں مطالعہ کیا ہے۔

❁❁❁❁❁

ایک مختلف جنگی رقص:

ہندوستان میں حکومت اور طبقات

(1939-1945ء)

اندیوار کامتیکار/ترجمہ: نیّر عباس زیدی

شہنشاہیت اور قوم پرستی کے زیر اثر، ایک تسلسل کے ساتھ، جدید تاریخ لکھی گئی۔ وہ کیف آور اشیاء، جو بسا اوقات سماجی ہم آہنگی، یک جہتی اور فخر و مباہات کے القا میں مددگار ہوتی ہیں، کثر ان راہوں کا منظر دھندلا کر دیتی ہیں جو شناخت میں تو آسان ہیں مگر ان کی تصحیح مشکل ہے۔ یہاں دو اصولیاتی تحریکوں کو عمل میں لایا گیا، انھیں یہیں تجویز کیا گیا اور ان کے لیے مشترکہ طور پر کوششیں کی گئیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی جدید تاریخ میں کچھ مبہم موضوعات کو زیر بحث لایا جائے۔ پہلی تحریک کا تعلق دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور ہندوستان کی حکومتی قوتوں کی سرگرمیوں کا موازنہ ہے؛ جبکہ دوسری کا تعلق خط متدیر کے موازنے سے ہے..... ایک ہی وقت میں، ہندوستان میں موجود سماجی طبقات اور خطوں کی خوش قسمتی اور بدقسمتی سے متعلق۔ کسی ایک قوم یا ملک کا تاریخی تجزیہ کرنے کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ..... ''قوم''..... کس نظریے کے تحت (اس کام میں) سدِ راہ ہے۔ وہ معاملات جن کی وضاحت کی جائے گی ان کا تعلق دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاملات اور نو آبادیاتی حکومتی قوت کی نوعیت سے ہے۔ اس میں معاملات کی اہمیت کا تبدیل ہونا شامل ہے۔ متعدد جلدوں پر مبنی ہندوستانی

افواج کی دوسری جنگ عظیم کی سرکاری تاریخی دستاویز (Official History of the Indian Armed Forces in the IInd Worldwar) کی اشاعت کے بعد ان مورخین نے جو 1940ء کی دہائی کے ہندوستان سے متعلق لکھ رہے تھے، اپنی تمام توجہ تقسیم ہند اور 1947ء میں ہندوستان کی آزادی کی طرف مبذول کر دی۔ انھوں نے آئینی مباحث اور بڑے پیمانے پر سیاسی لام بندی کی تفصیلات کا ہی تجزیہ کیا۔ دستاویزی مواد کی ایک ضخیم مقدار نیکولس مینسرگ (Nicholas Mansergh) کی مرتب کردہ سیریز ''ٹرانسفر آف پاور'' (Transfer of power) اور انڈین کونسل برائے تحقیق تاریخ کے زیر نگرانی ''ٹوورڈز فریڈم'' (Towards Freedom) نامی منصوبے کی تکمیل کے بعد چھپی۔ ان مطبوعات کے عنوانات ان کی بنیادی دلچسپی کے موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تاریخ نویسی میں آزادی اور نوآبادیات سے متعلق موضوعات کو جنگی موضوعات پر سبقت حاصل ہے۔

معاشی اور معاشرتی تاریخ کو یکسر نظر انداز کیا گیا یا اسے ڈرامائی سیاسی واقعات کے پس منظر کے لیے پیش کیا گیا۔ تاریخ نے ہندوستان پر جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ اثرات کا جائزہ لیا، خاص طور پر 1943ء میں بنگال میں آنے والے خوفناک قسم کے قحط کی وجہ سے پیدا ہونے والے افراط زر اور چیزوں کی قلت کا۔ تاریخ دانوں نے تقسیم پنجاب کے فسادات، تشدد اور جھگڑوں پر بھی نوحہ کنی کی۔ آر سی ماجمدار کی کتاب ''ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا''، جسے کبھی اس موضوع کی مستند کتاب کا درجہ حاصل تھا، کا ایک حصہ انہی فسادات کے ماہ و سال کا احاطہ کرتا ہے۔ کتاب کے اس حصے کا عنوان ''داہارڈ لاٹ آف دا کامن پیپل'' (The Hard lot of the common people) ہے۔ سومٹ سرکار کی ایک دقیق کتاب یہ بات باور کراتی ہے کہ جب تک جنگ کے آثار نہیں تھے تو کچھ بنیادی حصول ممکن نظر آتے تھے اور کاروباری مفاد کا مطلب تھا ''ہندوستانی بورژوا طبقے کے لیے ایک قدم کی پیش رفت؛'' تاہم دیگر سماجی طبقات کے لیے جنگ مہلک اور تباہ کن اثرات لاتی تھی۔ سوگا تا بوس اور عائشہ جلال کی ایک تصنیف نے بنگال کے قحط کو، عدم تشہیر کے باوجود، دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں میں سے ایک قرار دیا۔ ''دا نیو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا'' نے اسے یوں بیان کیا ''دوسری جنگ عظیم کے، ہندوستان کی معاشی زندگی پر، تباہ کن اثرات ہوئے''۔

اس آرٹیکل میں، تناظر کو درست کرنے یا کم از کم اس کا معیار بہتر بنانے کے علاوہ، ذہنی ہندوستان کے بے لاگ اعداد و شمار بیان کرتے ہوئے، موضوعات میں ایک منطقی تبدیلی ہو گی۔ میں 1940ء کی دہائی کے ہندوستان کا تجزیہ کروں گا، سیاسی بحث و تمحیص یا مجموعی لام بندی کے حوالے سے نہیں بلکہ وسائل کے حصول اور ان کی بڑھوتری کے حوالے سے۔

میرا ابتدائی قضیہ یہ ہے کہ ریاستیں جنگوں کا آغاز کرتی ہیں اور پھر وہ یہ کوشش کرتی ہیں کہ ان جنگوں کو اپنے محکوم عوام کے کاروبار کا حیلہ وسیلہ بنا دیں۔ لہٰذا جدید جنگیں ریاستوں کو نہ صرف محاذ جنگ پر بلکہ گھریلو محاذ پر بھی آزمائش کرتی ہیں۔ جنگ کے دوران کسی بھی ریاست کی وسائل کے حصول کی اشتہاء بڑھ جاتی ہے۔ دوران جنگ ریاست یہ ضرورت محسوس کرتی ہے کہ وہ معاشرے سے غیر معمولی مطالبات کرے اور معمول سے زیادہ وسائل حاصل کرے۔ ریاست یہ کام جس حد تک اور جس انداز میں کرے وہ اس کے لیے مفید ہو سکتا ہے: توانائی اور سرگرمی کے ریاستی انشقاق سے روشنی کی ایک ایسی جھلک نظر آتی ہے کہ ہم اس معاشرے کے خدوخال واضح انداز میں دیکھ سکتے ہیں۔

روشنی کی اسی جھلک کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ مضمون دریافت کرتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران ریاست نے وسائل میں کس طرح اضافہ کیا، جنگی معاملات کو کس طرح جاری و ساری رکھا گیا اور اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ ہندوستان کی راج دھانی برطانیہ کی جنگی امور سے متعلق کارکردگی کا جائزہ لینے سے ہندوستان کی صورت حال کا ادراک بہتر انداز میں ہو سکتا ہے۔ کسی بھی ملک پر باقاعدہ قبضہ نہیں کیا گیا اور دو ریاستیں اس انداز سے نہیں لڑیں۔ میں اس معاملے میں دلائل دوں گا کہ نوآبادیاتی ریاست کا جنگی رقص ہندوستان میں ریاستی قوت کے کردار کو آشکار کرنے میں مدد دیتا ہے۔

1- ریاستی سرگرمیاں

دوسری جنگ عظیم نے نوآبادیاتی ریاست کی غلط سمت پکڑ لی۔ کئی دہائیوں تک ان کی دفاعی پالیسی اس توقع پر کاربند رہی کہ حملہ آور روسی ہوں گے اور حملہ شمال مغربی سمت سے، افغانستان کے راستے ہوگا؛ جب عملاً حملہ ہوا تو حملہ آور جاپانی تھے اور وہ برما کے راستے، مشرق کی

سمت سے آئے۔ جاپانیوں نے آسام پر قبضہ کرلیا، منی پور اور ناگا کی پہاڑیوں پر چڑھ دوڑے؛ کوہیما اور اپھال کے دفاع کے لیے شدید لڑائی ہوئی اور یہ موضوع عارضی طور پر خبروں کی سرخی بنا رہا۔ اگرچہ آسام ہی وہ صوبہ تھا جس پر قبضہ کرنا مقصود تھا مگر اس کے ساتھ واقع بنگال بھی بری طرح متاثر ہوا۔ بنگال میں اعلیٰ پیمانے پر جنگی انتظامات کیے گئے، ہزاروں کی تعداد میں فوجی دستے برطانیہ، امریکہ، افریقی ممالک، آسٹریلیا اور چین بلوا کر یہاں تعینات کیے گئے، اور ایک خاص وقت پر، خصوصاً جب برما کے پناہ گزیں یہاں داخل ہوئے تو جاپان کا قبضہ ناگزیر دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ ہندوستان کی مشرقی پٹی ہی ان جنگی سرگرمیوں کا مرکز رہی تاہم پورا ملک ہی ان سرگرمیوں کی لپیٹ میں آتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ہندوستان کوئی بڑا میدان جنگ تو نہیں بنا لیکن دوسری جنگ عظیم میں رسد کاری کا انتہائی اہم مرکز بن گیا جہاں سے بھاری مقدار میں سرمایہ اور اشیاء مہیا کی گئیں ساتھ ہی افرادی قوت بھی غیر معینہ تعداد میں مہیا کی گئی۔

پہلے ہم افرادی قوت پر ہی نظر ڈالتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں بیس لاکھ افراد نے ہندوستانی افواج میں شمولیت اختیار کی۔ ان فوجیوں نے افریقہ، مشرق وسطیٰ، برما اور یورپ میں اپنی خدمات سرانجام دیں۔ اس فوج کے کچھ یونٹ جیسے فورتھ انڈین ڈویژن نے مثالی حیثیت اختیار کی۔ ہندوستانی فوج سے متعلق کہانیاں بڑے فخر سے سنائی جاتی تھیں کہ جیسے سنانے والے کے پس منظر میں فوجی بینڈ بج رہا ہو۔ ہندوستانی حکومت نے بھی یہ شیخی بھگاری کہ ہندوستانی فوج تاریخ کی سب سے بڑی رضاکار فوج ہے۔ قانونی نکتۂ نظر سے تو وہ تمام افراد رضاکار ہی تھے جنھوں نے اپنی رضا و رغبت سے فوج میں شمولیت اختیار کی؛ لیکن ان میں سے اکثر، بے روزگاری کی وجہ سے، ضرورتاً فوج میں بھرتی پر مجبور کیے گئے تھے۔ فوج میں افرادی قوت کی کمی کے پیشِ نظر مروجہ فوجی قوانین میں نرمی کی گئی اور بھرتی پر معمور افسران کو یہ اجازت دی کہ وہ بھرتی کے مقررہ وزن سے کم وزن رکھنے والے افراد کو بھی بھرتی کر سکتے ہیں۔ صرف ایک مرتبہ یونیفارم میں ملبوس وہ افراد فوج کے ڈاکٹروں کے سامنے آئیں۔ شمال مغربی ہندوستان کے تربیتی مراکز، جہاں شمالی ہندوستان کے زرعی محنت کشوں کی نسبت غذائیت کا معیار بہتر تھا، میں ہونے والی تحقیقات نے یہ بات عیاں کی کہ ''ہندوستان کی فوج میں بھرتی ہونے والے نوجوانوں میں سے اکثر کا وزن معیار سے کم تھا اور ان میں غذائیت کی کمی کے آثار بھی نمایاں تھے۔ بھرتی سے قبل ان کی غذائیت غیر تسلی

بخش تھی۔ ''اینمیا انویسٹیگیشن ٹیم (Anaemia Investigation Team) تشکیل دی گئی۔ خوش تعبیزی سے بے تاب فوجی ڈاکٹروں نے نئے بھرتی ہونے والے رضا کاروں پر ''غذائی تجربات'' کیے۔ ہندوستانی فوج کو انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ نے شائع کیا۔ جو نتائج سامنے آئے ان کے مطابق شمال مغربی ہندوستان میں ''عمر اور ابتدائی وزن کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہر بھرتی ہونے والے رنگروٹ نے، فوج کے راشن پر محض چار ماہ میں وزن میں پانچ سے دس پاؤنڈ کا اضافہ کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بات بالکل عیاں تھی، فوج میں بھرتی کے بعد، غذا اور دوا کی فراوانی کے نام پر ''رضا کاروں'' کی بھرتی کی گئی۔

غذائی قلت کا شکار وہ نوجوان جو فوج میں بھرتی ہوئے ان کی مماثلت برطانوی ہندوستان کے مثالی سپاہی سے تھی۔ انیسویں صدی کے آخر ہی سے بہترین ہندوستانی سپاہی کے اندر جن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے ان میں دبلی کھال والا ایک محنت کش، جو گندم کھاتا ہو، خوبرو اور صحت مند ہو، وفادار ہو، صاف گو ہو، مضبوط ہو اور اس کا تعلق ملک کے شمال مغربی حصے سے ہو ..... چھانٹی کا ایک خاص عمل جو مارشل ریس تھیوری سے مرصع ہے۔ امن کے ایّام میں بھرتی کا سلسلہ اس بات پر مبنی تھا کہ پنجاب کا محنت کش اس فوج کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ جنگ کے ایّام میں، جب ہندوستانی فوج غذائی قلت کے شکار سپاہیوں سے پُر ہو گئی تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہونے والے پنجابی محنت کشوں نے پسپائی اختیار کر لی۔ اگرچہ پنجاب سے بھرتی ہونے والے رنگروٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، ان میں سے بہت ہی کم تعداد میں زمیندار تھے: اکثریت محنت کشوں، مزدوروں اور ہنرمندوں کی تھی۔ نوجوان جاٹ سکھ کاشت کاروں نے، اجناس کی قیمتوں میں اضافے کے باعث، کاشت کاری کو ذریعۂ معاش بناتے ہوئے زمینوں پر ہی رہنا پسند کیا۔ لہٰذا پنجاب کی نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے افراد، جنہیں پہلے بھرتی نہیں کیا جاتا تھا، کا فوج میں بھرتی کا سلسلہ چل نکلا۔ دوسرے نمبر پر مدراس سے تعلق رکھنے والا طبقہ فوج میں بھرتی ہوا (ہندوستانیوں کے خیال میں یہ پنجاب کی ضد میں ہوا)۔ پنجابیوں کے برعکس، جو مدراسی فوج میں بھرتی ہوئے، جن کی تعداد تقریباً ڈھائی لاکھ تھی ان میں سے اکثر زرعی محنت کش تھے۔ وہ فوج میں ڈرائیور، بڑھئی، خانساماں اور الیکٹریشن بن گئے۔ جو بنگالی فوج میں بھرتی ہوئے ان میں سے اکثر کا تعلق چھوٹے شہروں سے تھا۔ ان میں سے اکثر تکنیکی پیشہ میں چلے گئے۔ جنگ کے اختتام تک

سپاہیوں کی تشکیل نو سے متعلق وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ اس دور کی ہندوستانی فوج میں سے بہت کم افراد زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اکثریت کا تعلق محنت کش اور دہقان طبقے سے تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہاراج جس طرح کی فوج کا عادی تھا وہ سلسلہ ختم ہوگیا کہ جہاں فوج کی نوکری میں بیٹا باپ کی جگہ لے لیتا تھا اور وفاداری یقینی سمجھی جاتی تھی۔ بہت سے پنجابی سکھ جاٹ خاندان سلطنت برطانیہ کی فوج میں نوکری روایتی اور رواجی طور پر کرتے تھے۔ اس کی تاریخ 1650ء کی دہائی میں چلی جاتی ہے؛ دوسری جنگ عظیم میں فوج میں وسعت آ جانے سے ان خاندانوں کے سپوتوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ نئے بھرتی ہونے والے سپاہی کم قابلِ اعتماد کیوں نظر آتے تھے۔ فوجی انٹیلیجنس کے مطابق، وہ فوجی اپنے گھر بار کے بارے میں سوچتے تھے، قحط اور انقلاب کی ان خبروں سے بآسانی مضطرب ہو جاتے تھے جو وہ مقامی اخبارات یا خطوط میں پڑھتے تھے۔ ایک کمانڈنگ افسر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''مجھے کبھی کبھار یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اس بٹالین کو کمانڈ نہیں کر رہا، پنجاب میں بیٹھی ہوئی چند قوتیں اسے کمانڈ کر رہی تھیں'' جنگ سے متعلقہ محکمے یہ دیکھ رہے تھے کہ ''ہندوستان کی فوج کی وسعت نے اس کی وفاداری کو اتنا کم کر دیا کہ وہ اب کسی دشمن کی تاب نہیں لا سکتی، چاہے وہ دشمن اندرونی ہو یا بیرونی، یہ فوج محتاط طریقے سے بھرتی کردہ اور تربیت یافتہ فوج کے مقابلے میں پروپیگنڈے کا آسانی سے شکار ہو سکتی تھی۔ 1943ء میں چرچل کو یہ خوف محسوس ہوا کہ ہندوستانی فوج برطانیہ کے خلاف بھی اُٹھ سکتی ہے۔ اس بات نے چرچل کو سنجیدگی سے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستانی فوج کی وسعت میں کمی کر دے۔

ایک نئی طرز کی فوج، جو پہلے سے یکسر مختلف تھی، نے نئے مسائل پیدا کر دیئے۔ کیا ہمیں فوج کے سرکاری تاریخ دان کی بات پر غور کرنا چاہیے جب وہ وثوق سے یہ کہتا ہے ''جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے رنگروٹوں کی تربیت کے لیے پنجابی انسٹرکٹر مسائل کا پیش خیمہ تھے۔ اس مسئلے کو ہم نے بتدریج قابو کیا، ان مسائل سے ذہنی انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔ کسی خطے کے افراد کا اکٹھے کام کرنا بھی بڑا مشکل مرحلہ ہے: جاٹوں نے اپنے علاقے کی نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا تھا جس سے نچلی ذاتوں کی علیحدہ رجمنٹ

تشکیل دینا پڑی۔ مسائل صرف اس حد تک نہیں تھے کہ ان لوگوں کو اکٹھے کام کرنا ہے بلکہ وہ لوگ اس لیے بھی پریشان تھے کہ انھیں جدید آلات استعمال کرنا تھے جس سے وہ بالکل آشنا نہیں تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان کی فوج مزید جدید آلات سے مرصع ہوگئی۔ گھڑسوار فوج، جو گھوڑوں کی عادی تھی، کو مشرق وسطیٰ میں ٹرک مہیا کر دیئے گئے۔ نتیجتاً وہاں بے شمار حادثات ہوئے۔ ایک جنرل نے واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک جیپ کے ڈرائیور نے جو جیپ کو ایک کھائی پار کرانا چاہتا تھا، دیدہ دانستہ، بریک کی بجائے، ایکسلریٹر دبایا اور پھر اپنے افسران سے، جو اسے ہسپتال ملنے آئے، یہ شکایت کی کہ ان کی نئی مشین ناکارہ ہے کیونکہ اس کھائی کو گھوڑا آسانی چھلانگ مار کر عبور کر سکتا تھا۔

موازنے سے صورت حال مزید صاف ہو جائے گی۔ ہندوستان کی فوج میں دس گنا اضافہ ہوا، لیکن برطانیہ میں جہاں جبری بھرتی متعارف کروائی گئی فوج کی تعداد میں پانچ گنا اضافہ ہوا یہ تعداد پچاس لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ امریکہ میں فوج کی تعداد میں آٹھ گنا اضافہ ہوا اور تعداد ایک کروڑ ساٹھ لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی۔ ہندوستانی فوج کے 180,000 افراد زخمی ہوئے جس میں سے تیس سے چالیس ہزار افراد شدید زخمی تھے۔ لیکن اسی جنگ میں تین لاکھ برطانوی اور چار لاکھ امریکی فوجی ہلاک ہوئے۔ (یہ اعداد و شمار جرمن اور روسی زخمی و ہلاک شدگان سے یقیناً کم ہیں۔ جرمنی کے بتیس لاکھ فوجی زخمی ہوئے جبکہ روس کے ستر لاکھ فوجی زخمی ہوئے)۔ مزید برآں مغربی معاشروں میں ہونے والے نقصانات 1941ء سے 1944ء تک برطانیہ کے خارجہ سیکرٹری انتھونی ایڈن کا بڑا بیٹا برما کے محاذ پر مارا گیا۔ متحدہ صوبوں کے گورنر مورپس ہیلیٹ نے لکھنو میں سالانہ پولیس پریڈ کی صدارت کی، اگلے ہی روز انھیں اطلاع دی گئی کہ ان کا بیٹا مارا گیا۔ حتیٰ کہ وائس رائے لارڈ ویول اپنے اکلوتے بیٹے کی وجہ سے خاصے فکرمند ہو گئے تھے جب انھیں ایک ٹیلی گرام موصول ہوا ''آرچی جان شدید زخمی ہو گیا، تفصیلات ندارد۔'' انھیں یہ خبر بھی ملنے والی تھی کہ ان کے بیٹے کا دایاں ہاتھ معمولی زخمی ہوا، اور برما کے محاذ پر لگنے والے زخموں کی وجہ سے بائیں ہاتھ کی بریدگی کی گئی۔ ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ جس کے لیے فوج میں جانا اختیاری تھا، ذرا کم متاثر ہوا۔

اگر ہم افرادی قوت سے جنگی پیداوار کی طرف دیکھیں تو ہمیں فوجی نکتۂ نظر ان الفاظ

میں ملے گا۔ ''جنگ کے آغاز'' پر ہماری تمام صنعتیں جو کہ اقوام متحدہ کی ہی مرہونِ منت تھیں اور ان کا مقصد پرامن تجارت تھا۔ انھوں نے ہدایت کی کہ وہ اپنی توجہ جنگی کاروبار کی طرف مبذول کر دیں۔ پہلے پہل ان کی پیداوار انتہائی معمولی تھی لیکن چند ماہ گزر جانے کے بعد، جنگی ساز وسامان کی ترسیل، طلب ورسد میں اضافے کے ساتھ ساتھ، محاذ جنگ پر موجود لوگوں کی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کاروبار میں بے انتہا اضافہ ہوا۔''

تفاصیل کا محتاط مشاہدہ کرتے ہوئے ہندوستان کے حکومتی ماہرینِ شماریات نے اندازہ کیا کہ جیومیٹری کی پرکاروں کے بننے کی تعداد 1941ء میں 499 تھی جو 1943ء میں بڑھ کر 8143 ہوگئی۔ انھوں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ فوج نے اپنی ڈیری کے کاروبار کو بھی بڑھالیا ہے بغیر اس بات کو سوچے ہوئے کہ وہ اس خاص وصف میں مہارت نہیں رکھتے۔

ہندوستانی فوج کی بندوقوں، گولہ بارود، غذا، وردیوں، چادروں، کمبلوں، خیموں، جوتوں، ادویات، مشروبات، تمباکو اور ضروریات زندگی کی دیگر اشیا کی مانگ تھی اور وہ انھیں موصول بھی ہوئیں۔ دورانِ جنگ فوج میں بھوک کی شدت تیز تر ہو جاتی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی حربی سرگرمیوں اور برما میں جنگ کے لیے ہندوستان اہم فوجی پڑاؤ تھا۔ برطانیہ اور امریکہ کی افواج کو بھی رسد ہندوستان سے ہی ہوتی تھی۔ ایک دستاویز جس کا عنوان ''سٹیٹسٹکس ریلیٹنگ ٹو انڈیاز وار ایفرٹ (Statistics relating to India's War effort) تھا، میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ ہندوستان نے تقریباً چار سو ملین سلی ہوئی اشیاء پچیس ملین جوتوں کے جوڑے، سینتیس ہزار ریشمی پیراشوٹ اور چار ملین رسد گرانے والے سوتی پیراشوٹ شامل ہیں۔ جنگ کے دوران ہندوستانی صنعت کا بیش تر حصہ سوتی کپڑے پر مشتمل تھا۔ ایک خاص وقت پر ہندوستان نے دفاعی افواج کو ایک اعشاریہ دو بلین گز سالانہ کپڑا مہیا کیا؛ یہ بھی حقیقت ہے کہ 1947ء میں یہ کہا جاتا تھا کہ نہرِ سوئیز کے مشرقی حصے کی افواج کو ہندوستان کپڑا مہیا کرتا ہے۔

اگرچہ اس وقت ہندوستان میں پیداواری صلاحیت کا خاصا مبالغہ کیا گیا حقیقتاً ضروری تجارتی مال (برعکس پرکاروں کے) کی پیداوار ساکن ہی رہی یا اس میں نہ ہونے کے برابر اضافہ ہوا۔ کوئلہ، جس پر ریلوے اور سٹیل کی صنعت کا دارومدار ہوتا ہے، کی پیداوار نے جنگ کے ایام میں تنزلی اختیار کی۔ ہندوستان میں کارخانوں میں بنے ہوئے کپڑے کی پیداوار جو جنگ شروع

ہونے سے قبل چار بلین گز تھی، وہ بڑھ کر چار اعشاریہ چھ بلین گز ہوگئی جبکہ اس کی تیاری کے لیے سابقہ مشینری ہی استعمال ہوتی تھی۔ اسی سعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشینری ناکارہ پن کا شکار ہوئی اور محنت کش تھکاوٹ کا۔ اس صنعت کا دارومدار درآمدی مشینری پر تھا زیادہ کام میں لانے کی وجہ سے وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی اور جنگ جاری ہونے کی وجہ سے اس کی درآمد میں بھی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ بڑے پیمانے پر سامان موجود نہیں وہ معیشت میں اپنا معیار برقرار نہیں رکھ سکتی۔ جہاں تک زراعت کا تعلق ہے ''زیادہ غلہ اُگاؤ'' کی تحریک چلائی گئی لیکن اس سے حاصل شدہ آمدنی تقریباً ایک جیسی ہی رہی۔

اس صورتِ حال کے برعکس برطانیہ کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، یہ اضافہ زراعت میں بھی قابلِ دید تھا۔ زرعی محنت کشوں کی تعداد میں اضافہ کر کے زیرِ کاشت رقبے میں بھی وسعت کی گئی اور یہ رقبہ بارہ ملین ایکڑ سے بڑھ کر اٹھارہ ملین ایکڑ تک جا پہنچا، جبکہ صنعتی میدان میں یہ ترقی اس سے بھی تیز تر تھی۔ 1943ء تک برطانیہ میں بندوق کی گولیوں، ٹینکوں اور بحری جہاز کی صنعت، جنگ کے ابتدائی عرصے کے مقابلے میں آٹھ گنا تجاوز کر گئی۔ برطانیہ میں تباہ کردہ ہوائی جہاز 1938ء میں 2800 تھے، 1939ء میں یہ تعداد 8000 سے کچھ کم تھی، 1941ء میں 20000 ہوئی اور 1944ء میں 26000 سے تجاوز کر گئی۔ 1939ء سے 1942ء کے عرصے میں مشینری میں استعمال ہونے والے ٹول کی تعداد میں تین گناہ اضافہ ہوا۔ برطانیہ کی جنگی استعداد 1943ء میں اپنے عروج پر تھی کیونکہ اس سطح پر فوج اور فیکٹریوں کی افرادی قوت میں مزید اضافہ کے لیے لوگ دستیاب نہیں تھے۔

کم مقدار میں دستیاب اشیاء کی ترسیل کو جاری رکھتے ہوئے برطانیہ میں راشن (مقررہ مقدار میں فراہمی) کا سلسلہ سختی سے رائج کیا گیا۔ ہندوستان میں راشن کا محور اجناس تھا جبکہ برطانیہ میں راشن کا سلسلہ غذائی اشیاء جیسے گوشت، انڈے اور مکھن تک ہی تھا، ڈبل روٹی، آٹا آلو اور جو کی اشیاء لامحدود مقدار میں دستیاب تھیں۔ برطانیہ میں راشن کے سلسلے نے عوام کی اکثریت کو متاثر کیا۔ ہندوستان میں راشن کا سلسلہ شہری آبادی تک محدود رہا اور آبادی کا محض تھوڑا ہی حصہ متاثر ہوا۔ راشن کے سلسلے نے برطانیہ میں یہ متعین کیا کہ لوگ کیا کچھ کھاتے ہیں اور ہندوستان میں یہ متعین کیا کہ لوگ کیا کچھ نہیں کھاتے۔ برطانیہ میں عوام کی اکثریت کے لیے راشن کا مفہوم

مساوات تھا؛ ہندوستان میں، عوام کی محدود تعداد کے لیے، راشن کا مفہوم بقا و وسیلہ تھا۔ ان افراد کے لیے جو ضروریات زندگی انتہائی مہنگے داموں خرید سکتے تھے، ہندوستان میں ہر چیز با آسانی دستیاب رہی۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ نو آبادیاتی ریاست کس طرح افرادی قوت کو بروئے کار لا کر اشیاء کی ترسیل ممکن بناتی تھی، ہم اپنا رُخ پیسے کے مسئلے کی طرف موڑتے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے حاصل کردہ پیسے نے دو بڑے مسئلے کھڑے کر دیئے۔ کس معاشی منصوبے و انتظام کے تحت ہندوستانی وسائل کو برطانیہ کے سپرد کیا جانا تھا؟ اور کس طرح ہندوستانی معاشرے سے ان وسائل کا حصول ممکن تھا؟ سادہ ترین معاشی انتظام تو، یقینی طور پر، ہندوستانی محصولات کی ضبطی تھا، لیکن لارڈ کلائیو کا دور تو ختم ہو چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ہندوستان نے جنگی اخراجات کی مد میں برطانیہ کو ایک بڑی رقم ادا کی۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران جون مینارڈ کینیس کے مطابق، جس نے اختیاری صورتِ حال کو بھی مدنظر رکھا، ''سیاسی طور پر ایسا کرنا آسان کام تھا۔'' ایسا اس لیے تھا کہ ہندوستانی افسران اور صنعت کاروں کی رائے کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا سے تعلق رکھنے والے وہ فوجی دستے جنھوں نے دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا ان کے تمام تر اخراجات ان کے ممالک نے برداشت کیے، لیکن ہندوستانی فوج کے اخراجات، جزوی ہی سہی، برطانیہ نے برداشت کرنے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ، کسی نہ کسی صورت، حکومت ہندوستان کو پیسوں کی ادائیگی ناگزیر تھی۔

جنگ کے ابتدائی ایام میں ہونے والے ایک معاہدے نے حکومتِ ہندوستان اور برطانیہ کے محکمۂ محاصل کے اخراجات تقسیم کیے۔ وہ اخراجات جو ہندوستان کو ادا کیے جانے تھے، ان کی ادائیگی پاؤنڈ میں ہونا تھی اور یہ ادائیگی لندن میں کی جانی تھی، لیکن یہ ادائیگی ایسے اکاؤنٹ میں کی جاتی تھی جسے منجمد کیا جا سکے تا کہ ہندوستان اس سے محروم رہے۔ اس طرح سٹرلنگ پاؤنڈ کے زمرے میں مسئلہ کھڑا ہوا۔ اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کو پیسوں کی ادائیگی ناگزیر تھی۔

جنگ کے ابتدائی ایام میں ہونے والے ایک معاہدے نے حکومتِ ہندوستان اور برطانیہ کے محکمۂ محاصل نے اخراجات تقسیم کیے۔ وہ اخراجات جو ہندوستان کو ادا کیے جاتے تھے، ان کی ادائیگی پاؤنڈ میں ہونا تھی اور یہ ادائیگی لندن میں کی جاتی تھی، لیکن یہ ادائیگی ایسے اکاؤنٹ

میں کی جاتی تھی جسے منجمد کیا جا سکے تا کہ ہندوستان اس سے محروم رہے۔ اس طرح سٹرلنگ پاؤنڈ کے زمرے میں مسئلہ کھڑا ہوا۔ اگر چہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کو اس کی خدمات کے صلے میں ادائیگی کی گئی لیکن حقیقتاً اس وقت کسی قسم کی ادائیگی نہیں ہوئی۔ بالفاظ دیگر اس وقت ایک رضا کارانہ معاشی حصے کا سوال خارج از امکان تھا، اور لوٹ مار بھی ناممکن تھی۔ ایک جبری قرضے سے اس بات کا جواب مل گیا۔ میں یہ سوچ کر ہی آسودہ ہوتا رہا کہ یہ محض التوا ہی ہے؛ کہ ہندوستان برآمدات کر رہا ہے اور یہ ایک خدمت ہے جس کے عوض اسے ادائیگی ہو رہی ہے، جسے جنگ ختم ہونے کے بعد بروئے کار لایا جائے گا، یہ ادراک، دس سال، بعد وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک فنانس ممبر کو ہوا۔

اس طریقہ کار سے متعلق بدگمانیاں بھی کی گئیں۔ چرچل اس بات کا قائل تھا کہ یہ تمام انتظامات یکسر ہندوستان کے حق میں ہیں، اسی نظریے کے پیش نظر اس نے معاشی انتظامات پر از سر نو غور کرنے کا کہا۔ چرچل کو یہ بھی بتایا کہ یہ نادانشمندی ہوگی: ہندوستان مزاحمت کرے گا اور یوں جنگ کے معاملات مجروح ہوں گے۔ ہندوستان کے وفاقی سیکرٹری کی حیثیت سے، لیوایمری نے تجزیہ پیش کیا کہ کسی ریل گاڑی کو پکڑنے کی غرض سے اگر آپ ٹیکسی میں بیٹھ کر سٹیشن کی طرف جا رہے ہیں تو آپ اس بات کا اعلان نہ کریں کہ آپ کے ذہن میں کرایہ کی ادائیگی کے حوالے سے شکوک وشبہات ہیں۔ رقم کا واجب الادا ہونا برطانیہ کے لیے بہتر تھا۔ جنگ کے اختتام تک حکومتِ ہندوستان نے دو ہزار ملین پاؤنڈ خرچ کر دیئے تھے؛ کیونکہ معاہدے کی رو سے ہر فریق کو آدھی رقم ادا کرنا تھی۔ لہٰذا جنگ نے ہندوستان کو ایک مقروض ملک کی بجائے ایک قرض دہندہ بنا دیا، جس کے حسابات ایک ملین پاؤنڈ سے زیادہ تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جہاں سلطنتِ برطانیہ اپنے سمندر پار اثاثوں سے دستبردار ہوئی، ہندوستان نے اپنے بیرونی قرضہ جات پر قابو پا لیا۔

جوں جوں جنگ جاری رہی، یہ حکومتِ ہندوستان ہی تھی جسے تمام اخراجات کرنے کا کہا گیا۔ پی ایس لوکا ناتھن، جو ایک معاصر ماہر اقتصادیات تھے اور بعد ازاں ہندوستان کے نیشنل کونسل آف اپلائیڈ اکنامک ریسرچ بھی بنے، نے اندازہ لگایا کہ ایک غیر محتاط اندازے کے مطابق جنگ کی وجہ سے مالی دباؤ تین گنا ہو گیا۔ بالفاظ دیگر، قبل از جنگ ایام کے اخراجات کے

مقابلے میں جنگ کے اختتام تک نوآبادیاتی ریاست نے تین گنا اخراجات کیے۔ حکومت نے یہ بھی اعلان کیا کہ ''جنگ کے دوران عوامی اخراجات میں انقلابی تبدیلی آئی''۔ نوکا ناتھن مزید کہتا ہے کہ اس قسم کے عوامی اخراجات کی مثال ہماری معاشی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس طرح ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ نوآبادیاتی ریاست مالی وسائل اکٹھے کرنے کی بھرپور صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ جنگ بندی کے بعد امن کے ایام میں بھی اپنے معمول کے اخراجات کے لیے بھی سلطنتِ برطانیہ اس کام میں کامل نہ بن سکی۔ جبکہ اسی دھرتی پر حکمرانی کرتے ہوئے مغل بادشاہان نے سلطنت برطانیہ کی نسبت زیادہ ٹیکس وصول کر لیے تھے۔ نوآبادیاتی بجٹ اگرچہ، مقابلتاً، بہت کم ہوتا تھا لیکن اس بجٹ میں توازن پیدا کرنا ہمیشہ ہی ایک مسئلہ بنا رہا۔ مغربی ریاستوں نے اپنے معاشی پھیلاؤ میں بے پناہ اضافہ کیا لیکن بیسویں صدی تک ہندوستان میں نوآبادیاتی ریاست کا معاشی احاطہ ساکن ہی رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بیس سال گزر جانے کے بعد تک سول آبادی پر اخراجات تقریباً ساکن ہی رہے جبکہ دفاعی خدمات پر اخراجات میں پچیس کروڑ روپے کی کمی واقع ہوئی۔ جنگی سرگرمیوں کے اخراجات برداشت کرنا ہمیشہ سے چیلنج رہا۔ اس کا مطلب محدود وسائل کی ایک قوم سے اسراف کی توقع رکھنا تھا۔

سلطنت برطانیہ نے برطانوی عوام سے وسائل کے حصول کا ذریعہ ٹیکس کاری اور قرضوں کا حصول وضع کیا ہوا تھا۔ برطانیہ میں ٹیکسوں کی مد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا: ایکسس پرافٹ ٹیکس، جو جنگ کے آغاز پر 60% تھا وہ مئی 1940ء تک 100% تک بڑھ گیا جو یقیناً ناقابل برداشت تھا۔ پریشانی کی اس گھڑی میں سیونگ سرٹیفکیٹ، پوسٹ آفس سیونگ بنک اور دفاعی بونڈز کی صورت میں ریاست کو سرمایہ کی فراہمی ایک حب وطن کے جذبے کے تحت متعارف کروائی گئی۔ جو رقم حکومت نے اکٹھی کی وہ خاصی بڑی تھی لگ بھگ تین سو ملین پاؤنڈ کی رقم ایک سال میں اکٹھی ہوئی جو سالانہ ٹیکس کاری کے برابر ہی تھی۔

اسی طرح کے تجربات ہندوستان میں بھی کیے گئے: ٹیکسوں کی شرح میں اضافہ کیا گیا اور بچت کی سکیمیں بھی متعارف کروائی گئیں لیکن یہاں ان لوگوں نے بھی ان سکیموں میں عدم دلچسپی کا اظہار کیا جو ٹیکس کے ضمرے میں اچھی خاصی رقم ادا کرتے تھے اور انھوں نے حکومتی خزانے میں اضافہ کرنے کی غرض سے پیسے جمع کروانے سے انکار کر دیا بلکہ پوسٹ آفس بنکوں میں، ان

سکیموں کے متعارف کروانے کے بعد لوگوں نے رقوم نکلوانی شروع کر دیں۔ بلکہ لوگوں میں کرنسی نوٹوں کو چاندی کے ایک روپے سے تبدیل کروانے کے لیے بے چینی بڑھ گئی اور وہ کرنسی نوٹ عملی طور پر مارکیٹ سے غائب ہو گئے۔ 1940ء میں ہندوستان میں جنگی سرمایے کے سنجیدہ مسئلے پر کینیس (Keynes) یوں تحریر کرتا ہے: ''حکومت ہندوستان کا اہم مسئلہ اس وقت شروع ہوا..... کہ انھوں نے جنگ کے دوران سرمایہ اکٹھا کرنے کے سلسلے میں غیر تسلی بخش کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔'' کینیس (Keynes) کے اعداد و شمار کے مطابق ''عوام سے جو رقم حاصل کی گئی اس سے زیادہ عوام کو دے دی گئی۔'' یہ صورت حال برطانیہ سے یکسر مختلف تھی: ہندوستان کے عوام پر بڑے پیمانے پر، جنگ کا اثر یہ ہوا کہ ان کے اور حکومتی مالی محکموں کے درمیان فاصلے آ گئے۔

محصولات اور قرضہ جات کی وصولی ہندوستان میں ہونے والے جنگی اخراجات کے برابر نہ ہو سکی۔ صرف ایک ہی حل باقی تھا: کرنسی نوٹ چھاپنے کی پریس مشینوں کی قلت کی وجہ سے ہندوستان میں صنعتی ترقی ممکن نہیں تھی، لیکن ایک مشین ایسی تھی جس سے نوآبادیاتی حکومت کی بچت ہو سکتی تھی۔ اگر جنگی سرمایے کو برطانیہ میں ٹیکس یا محصولات کہا جا سکتا تھا تو ہندوستان میں اسے پرنٹنگ کا کاروبار کہا جا سکتا تھا۔ کاغذ کی کرنسی کا بہاؤ آ گیا۔ جنگ کے ایام میں ہندوستان میں گردش کرنے والے کرنسی میں 6.5 گنا اضافہ ہو گیا۔ اس صورت حال سے نوآبادیاتی ریاست کی نوعیت عیاں ہو گئی: یہ محصولات کا نظام کامیابی سے نہیں چلا سکی، راشن کے نظام کو بھی لاگو نہیں کر سکی اور قیمتوں پر بھی قابو نہ رکھ سکی۔ لہٰذا اس نے کاغذ کے کرنسی نوٹ چھاپنے پر ہی اکتفا کیا۔ ہندوستان میں پرنٹنگ پریس شاید سب سے کامیاب پیداواری مشین بن گئی۔

اس کا نتیجہ یقینی طور پر افراط زر تھا۔ مئی 1943ء میں کینیس (Keynes) نے اس خطرناک صورتِ حال سے متعلق تحریر کیا کہ کس طرح برطانیہ کی ایک بہت بڑی فوج پر ہونے والے جنگی اخراجات پر ہندوستان سے اکٹھے ہونے والے محصولات کے باوجود بھی قابو نہیں پایا جا سکا۔ وہ کہتا ہے ''ہم اپنے نقطۂ شکستگی تک پہنچا دیئے گئے اور ہندوستان و مشرق وسطیٰ میں جنگی اخراجات برداشت کرنے کے لیے کاغذی کرنسی چھاپی گئی تا کہ کم ہوتی ہوئی اشیاء ضروریات کو خریدا جا سکے۔ ایسوسی ایشن آف اکانومسٹس کے صدارتی خطاب میں وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ نے نشاندہی کی کہ جنگی معیشت کی بھدی وارثت کو افراطِ زر نے سرمایہ دیا اور اس کی پیداواری

صلاحیت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا۔ 1945ء میں قیمتوں کی شرح جنگ کے ابتدائی ایام کی نسبت اڑھائی گنا بڑھ گئی۔ برطانیہ میں جنگ کے ایام میں خوردنی اشیاء کی قیمتوں میں اعانت کے ذریعے کنٹرول کیا گیا، ان قیمتوں میں 18% اضافہ ہوا جبکہ ہندوستان میں، ایک محتاط اندازے کے مطابق راشن کے تحت ملنے والی اشیاء خوردنی کی قیمتوں میں 300% اضافہ ہوا۔

2- معاشرتی نتائج

نوآبادیاتی ریاست کی ان سرگرمیوں کا معاشرتی اثر کیا ہوا؟ جو تصویر سامنے آتی ہے وہ علاقائی اور معاشرتی طبقے میں مختلف ہے۔ ہندوستان میں، دنیا کے تمام معاشروں سے ہٹ کر، معاشرے کے اعلیٰ طبقات کو سمجھنا، ادنیٰ طبقات کے مقابلے میں مشکل ہے۔ ایک دہقان یا صنعتی مزدور سے پوچھ گچھ کرنا انتہائی آسان ہے بہ نسبت ایک جاگیردار اور کارخانہ دار کے۔ وہ چیزیں جو دولت کے ساتھ ساتھ بڑھ جاتی ہیں ان میں سے ایک جانچ پڑتال سے بچ نکلنے کا گُر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر نچلی ذاتوں کے لیے شماریاتی اعداد و شمار کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے تو اعلیٰ ذاتوں کے لیے افسانوی اعداد و شمار زیادہ مستند ہوں گے۔

اس جنگ سے ہندوستان کے تجارتی طبقے کو بہت فائدہ ہوا۔ جنگ سے پہلے کاروبار میں مندی کا رجحان تھا۔ مثلاً پارچہ بافی کی صنعت میں مصنوعات کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، جنگ شروع ہوتے ہی حکومت کی طرف سے بڑے پیمانے پر آرڈر وصول ہوئے اور سٹاک شدہ اشیاء جلد ہی فروخت ہو گئیں۔ ایک برطانوی تاجر کو ایسا محسوس ہوتا ہوگا کہ اس کے ہندوستانی ہم منصب جنگ کے دوران مضبوط سے مضبوط تر ہو رہے ہیں۔ جنگ کے بعد قائم کردہ انکم ٹیکس انویسٹیگیشن کمیشن کے مطابق: ''جنگ کے بعد پیدا شدہ صورت حال نے انکم ٹیکس کے شعبے کی کارکردگی کو خاصا متاثر کیا۔ تاجروں اور سٹہ بازوں نے قانونی اور غیر قانونی طریقے سے خوب پیسہ کمایا، اصول و ضوابط کے لاگو کرنے سے ڈیلروں نے اپنی تجارت اشیاء حکام کے علم میں لائے بغیر ہی فروخت کر دیں اور خاصا منافع کمایا۔''

ہندوستان میں بدعنوانی کے تدارک کے لیے بنائی گئی کمیٹی نے جنگ ختم ہونے کے بیس سال بعد یعنی 1964ء میں اپنی رپورٹ پیش کی اس رپورٹ میں یہ جائزہ لیا گیا کہ کیسے موقعہ

پرستوں اور سٹہ بازوں نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا، ٹیکس بچائے اور ڈھیروں روپیہ اکٹھا کیا۔ جنگ کے دوران کھاتہ میں اندراج اور اس کی طرف دیکھنے کو بھی فرصت نہ تھی۔ اس وقت زبردست بزنس دہلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز کمپنی لمیٹڈ کا تھا جسے اس وقت کی بااثر شخصیت لالہ شری رام چلاتے تھے۔ لالہ شری رام کی آپ بیتی میں جنگ کے ایام میں اکٹھی ہونے والی دولت کو ''بے مثال فائدہ'' اور ''عظیم ترین منافع'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اس ملز نے مسلح افواج کو خیمے اور سلے ہوئے کپڑے فروخت کر کے بے انتہا منافع کمایا۔ اسی گروپ کے چینی کے شعبے نے بھی نہایت عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ خاص طور پر ہندوستان کے مشرق بعید میں واقع چینی کی پیداوار والے علاقوں پر جاپانی قبضے کے بعد اس کے منافع کی کوئی حد نہ رہی۔ لالہ شری رام کی سوانح حیات ڈی سی ایم گروپ کی بے مثال کارکردگی بیان کرتی ہے لیکن دیگر صنعتی اداروں کو سخت الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ صنعت کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے وہ کئی مقام پر بڑھتی ہوئی ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کا ذکر: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 1943ء میں جب ٹیکسٹائل کنٹرول آرڈر نافذ کیا گیا۔ اور یہ کہا گیا کہ کارخانے، تھوک و پرچون فروش اپنے اپنے سٹاک دکھائیں تو دو ہزار سات سو ملین گز کپڑا (جو سات مہینے کی قومی سپلائی کے برابر تھی) دریافت کیا گیا۔ اگرچہ 1943ء کا زمانہ کپڑے کی شدید قلت کا دور تھا تاہم ہندوستان کی کپڑے کی صنعت کو اپنے قیام کے بعد سب سے زیادہ منافع ہوا۔ عمومی تاثر تو یہ تھا کہ وہ منافع جسے مخفی رکھا گیا ہے تشہیر کردہ منافع سے تین یا چار گنا ہے۔

صنعت کاروں میں جوش و ولولے کی لہر دوڑ گئی تھی۔ صنعت نے اچھی کارکردگی اس لیے دکھائی کہ ذرائع آمد و رفت کی کمی کے باعث درآمدات میں رکاوٹ پیش آ رہی تھی، جاپان کا شمار دشمنوں میں ہو گیا تھا، حکومتی سطح پر بڑے پیمانے پر، خریداری کی گئی اور عوامی طبقات میں بھی قوت خرید میں اضافہ ہوا۔ فوجی تعمیرات کے لیے کئی کمپنیوں کو ٹھیکے ملے۔ کیمیاء، مشینوں اور گاڑیوں کے میدان میں نئی کمپنیاں معرض وجود میں آئیں۔ ٹاٹا کیمیکلز اور ٹاٹا انجینئرنگ اینڈ لوکوموٹیو کمپنی (TELCO) بھی جنگ کے دنوں میں بنی اسی طرح جی ڈی برلا کی ہندوستان موٹرز کا آغاز بھی 1942ء میں ہوا۔ چونکہ اشیاء ضرورت کی قلت واقع ہو گئی تھی لہٰذا تاجروں کے لیے یہ موقع تھا کہ وہ چاہے جن اشیاء کی تجارت ہی سہی، زیادہ سے زیادہ منافع کما سکیں۔ بمبئی میں انڈین

سوشیالوجیکل سوسائٹی کی تقریب سے خطاب کرنے کے لیے ایک تاجر کو دعوت دی گئی۔ یہ تقریب 1950ء کی دہائی میں منعقد ہوئی، اس تاجر نے اپنے خطاب میں بڑے واضح الفاظ میں کہا: ''میں چالیس کی دہائی کا تاجر ہوں اور مجھے تجارت میں خوشحالی کے علاوہ کسی چیز کا علم نہیں۔''

اس خوشحالی کو قواعد کی پابندی کے ساتھ ہندوستانی صنعت کی فروخت کردہ اشیاء کے حوالے سے بھی بیان کیا گیا ہے۔ کپڑے کی قیمت میں، جنگ سے قبل کے ایام کی نسبت پانچ گنا اضافہ ہوا حتیٰ کہ حکومت کو قیمتوں کے کنٹرول کرنے کے لیے مداخلت کرنا پڑی۔ مداخلت کے بعد صنعت کاروں کا تعاون شرائط کے بعد ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح قیمتوں پر تو کنٹرول کر لیا گیا لیکن کپڑے کی قیمت پر قابو نہ پایا جا سکا اور اس سے بہت بڑا منافع کمایا جاتا رہا۔ جیسا کہ ہم نے جائزہ لیا جنگی سرگرمیوں میں اتحادی افواج کے لیے ہندوستان سے سب سے اہم چیز کپڑا ہی تھی۔ لہٰذا ہندوستانی صنعت کاروں کو اس کا بڑا شاندار معاوضہ دیا گیا۔ حکومت ہندوستان نے دعویٰ کیا تھا کہ قیمتوں پر کنٹرول عوام کے مفاد میں کیا گیا ہے؛ بمبئی یونیورسٹی کے سکول آف اکنامکس اینڈ سوشیالوجی کے شعبے نے استدلال پیش کیا کہ اگر عوامی مفاد ملحوظ خاطر ہوتا تو ''یہ مجاز محکمہ ان عوامی اراکین پر مشتمل ہوتا جو عوامی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے اس صورت حال کا غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کرتے۔ لیکن اس محکمے کو تشکیل دیتے ہوئے اس اہم بات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ کنٹرول بورڈ ان افراد کی نمائندگی کر رہا تھا جن کے مفادات وابستہ تھے۔''

صنعت کاروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے ہی مفادات کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے محض ماورائی بات ہی ہوگی۔ اس کنٹرول اتھارٹی کی تشکیل سے ہی ہمیں اس کی متعین کردہ قیمتوں کی حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ جس اتھارٹی نے منافع کی ایک بہت بڑی شرح رکھ دی تھی۔ حکومت ہندوستان کے ٹیکسٹائل کمشنر نے بعد ازاں یہ تسلیم کیا کہ 1943ء میں ''بورڈ تشکیل دے دیا گیا..... اور اس میں صنعت کی بالادستی قائم کی..... اس کے بعد کئی کمیٹیاں بھی بن گئیں..... ان کمیٹیوں میں سب سے اہم کمیٹی انڈسٹریز کمیٹی تھی، جس کے تمام اراکین صنعت کے نمائندے تھے اور اس کمیٹی کا اصل مقصد حکومت کو قیمتوں کے تعین میں مشاورت کرنا اور پیداوار کا معیار بنانا اور اس کی مساوی ترسیل کرنا تھا۔

ایک سرکاری افسر، جو ان تمام معاملات میں خاصی دلچسپی لیتا تھا، نے یہ بات نوٹ کی

یہ کپڑا اور اس سے متعلق امور کنٹرول کرنے میں ایک عام سرکاری افسر'' کامیاب نہیں رہا، وہ افسر جو غیر رسمی تعاون کرتا تھا وہ پسند کیا جاتا تھا، وہ 'تعاون' یقینی طور پر بڑے پیمانے پر ہوتا تھا اور یہی پارٹیاں اپنے مقدمات اور معاملات میں انہی افسران کو ثالث بناتے تھے جو (حکومتی سطح پر) ایک سنگین غلطی تھی۔ اس ابتدائی غلطی کی وجہ سے سارا نظم وضبط متاثر ہو گیا۔''

کوئلے کی قیمتیں بھی اسی طرح وضع کی گئیں۔ صنعت کاروں سے شرائط طے کرنے کے بعد قیمتوں میں بڑھوتری کو روکا گیا۔ لہٰذا صنعت کاروں کو بے پناہ منافع کمانے کا موقع ملا۔

برطانیہ میں صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ وہاں اس طرح کے منافع جات نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ برطانیہ کے تاجر ایک منظم معیشت میں کام کر رہے تھے، اور وہ ٹیکسوں سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اضافی منافع میں ٹیکس کی شرح 100% تک بڑھ گئی تھی جو تاجروں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ چور بازاری تو یقینی طور پر شروع ہوئی لیکن ایک مقتدر شخص کے بقول: ''وہ چور بازاری بڑے پیمانے پر نہیں ہوئی، اور لوگوں کو جنگ کے دوران بے ایمانی کرنے کا بڑے پیمانے پر موقع نہیں ملا۔'' ہندوستان میں پیداوار میں سست روی سے اضافہ ہوا جبکہ منافع جات میں بے پناہ اضافہ ہوا: جبکہ برطانیہ میں پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہوا اور منافع میں اس حد تک اضافہ نہیں ہوا۔

ہندوستان کے بیشتر کسانوں کے لیے دوسری جنگ عظیم 1930ء کی دہائی کے بحران سے بحالی کا ایک شاندار موقع تھا، 1930ء کی دہائی میں کسان شدید دباؤ و پریشانی کا شکار رہے۔ اس دوران زرعی پیداوار کی قیمتیں کر گئیں اور کسانوں کے اثاثے اونے پونے بک گئے لیکن 1940ء کی دہائی میں زرعی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا اور اس طرح کسانوں کا جوش و جذبہ بلند ہو گیا۔

افراطِ زر سے قرضوں، کرایوں اور محصولات کا بوجھ کم ہو گیا۔ 1940ء کی دہائی میں زرعی اشیاء کی قیمتوں میں، گذشتہ پانچ سالوں کے مقابلے میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ لہٰذا کاشت کاروں کی آمدن میں بھی اسی طرح اضافہ ہوا۔ اخراجات مالی لحاظ سے اپنی جگہ پر بھی رہے اور ان اخراجات سے ماضی کے مقابلے میں، آدھی اجناس فروخت کر کے ہی نبرد آزما ہوا جا سکتا تھا۔ دیہی قرضہ جات پر حکومت کی توجہ نہیں رہی اور ریزرو بنک آف انڈیا کے اعداد و شمار کے مطابق

ان سے غفلت برتی گئی۔ ماہر اقتصادیات پی جی تھامس کے شائع کردہ پمفلٹ ''وارٹائم پرائسس'' کے مطابق ''ہندوستان میں چھوٹے پیمانے پر پیداواری یونٹ موجود ہیں جس کی وجہ سے پیداکاروں کی تعداد زیادہ ہے اور زیادہ قیمتوں اور منافع کی وجہ سے وہ منافع زیادہ افراد میں تقسیم ہو جاتا ہے''۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ''کاشت کار طبقے نے پہلے سے زیادہ منافع کمایا۔'' اس طرح کے مواقع انھیں کبھی کبھار میسر آتے ہیں۔ کاشت کار طبقے نے اتفاق سے ایسے خوشحالی دیکھ لی کہ جس کا وعدہ ان کے سیاسی قائدین بھی نہیں کر سکتے۔

ہم اس طرح کی تبدیلیاں ایک ہی گاؤں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایم این سرنیواس جو اپنے عہد کے سب سے مشہور ماہر عمرانیات رہے، نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''دا ریمیمبرڈ ولیج'' (The Remembered Village) میں میسور نامی گاؤں کا ذکر کیا جس میں وہ 1948ء میں اپنے تحقیقی کام کے دوران مقیم رہے۔ سرنیسواس سے گفتگو کرتے ہوئے اسی گاؤں کے کئی افراد نے اپنی حالیہ خوشحالی کا موازنہ 1939-1918ء کے ایام جنگ کی غربت سے کیا۔ چاول انتہائی منافع بخش تھے اور اسی طرح گنے کی فصل تھی۔ کسان اپنی اجناس چور بازاروں میں فروخت کرتے جہاں منافع کی شرح بہت زیادہ تھی۔ صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کے لیے نظام تشکیل دیا گیا مگر اسے محض نظرانداز کرنے کا ذریعہ بنایا گیا۔ ہر کسان نے اپنی استطاعت کے مطابق چور بازاروں میں اپنی اجناس فروخت کیں۔ سرنیواس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے زرعی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہوا اسی اضافے نے اس گاؤں کی معاشی حالت کو بہتر بنایا۔

ہندوستان کے کئی علاقوں میں چور بازاری نے وہاں کی دیہی زندگی کو مزید رنگین بنا دیا کہ وہاں اخراجات کے لیے لوگوں کے پاس اضافی رقم آ گئی۔ دیہات سے تعلق رکھنے والے افراد نے شہروں کا سفر کثرت سے کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا بسوں کے ذریعے سفر میں اضافہ ہو گیا۔ دیہی لوگوں کی اولاد تعلیم کی غرض سے شہروں میں آنے لگی۔ شہروں سے ان روابط کی بدولت دیہی اقدار میں تبدیلی رونما ہوئی۔ دیہی آبادی میں امیر طبقہ اپنی اضافی رقم زیورات اور زرعی اراضی کی خریداری میں صرف کرتا تھا؛ جنگ کے بعد، اسی جنگ کی بدولت اکٹھی کی ہوئی اضافی رقم مکانوں اور چاولوں کی فیکٹریوں کی مد میں خرچ کی جانے لگی۔ سرنیواس کی تحقیق کے مطابق جو لوگ صرف

زمیندار تھے وہ اب ''سرمایہ داری'' کی فہرست میں آنے لگے۔ جنگ نے امیر دیہی لوگوں کی آمدنی میں اضافہ کیا اور اس کی ظاہری زندگی بھی تبدیل کی۔

اس کی بہترین عکاسی نوآبادیاتی حکومتی مرکز ومحور صوبہ پنجاب سے ہوتی تھی۔ محاذ جنگ سے خاصی دور واقع ہونے کے باوجود پنجاب جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ فوج میں بھرتی کا روایتی علاقہ ہونے کے ناطے اس دھرتی سے بے شمار افراد کو بھرتی کر کے مختلف محاذوں پر بھیجا گیا، انھوں نے اپنے گھروں میں جو رقم بھیجی اور اضافی فصلوں کے کاشت کا علاقہ ہونے کے ناطے یہاں سے بہت بڑی مقدار میں گندم بیچی گئی۔ میلکوم ڈارلنگ پنجاب میں انڈین سول افسر کی حیثیت سے تعینات رہے اور انھوں نے پنجاب کے کسان کے بارے میں شاندار مقالہ جات لکھے۔ ان کی رائے میں دیگر علامات کے ساتھ ساتھ اس خطے میں خوشحالی کا اندازہ خواتین میں پہنے جانے والے چاندی کے زیورات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسی خوشحالی کا چسکہ لینے کے لیے چائے پینے کا رواج پڑ گیا۔ حتیٰ کہ شام کو دیہی آبادی کی اکثریت چائے پینے لگی۔ اس روایت کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہوا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ روایت شمال کے تمام دیہاتوں میں رواج پا گئی۔ ڈارلنگ اس بات سے اخذ کرتا ہے کہ: ''مالی نکتۂ نظر سے بہتری کی بہت سی مثالیں تھیں، قیمتوں میں تین سو فی صد اضافہ ہوا۔ اس سے کاشت کاروں کی جیبوں میں اتنی رقم آ گئی کہ جتنی رقم کا انھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس کاشت کار نے اس رقم کو دانشمندی سے استعمال کرتے ہوئے اپنے قرضے اتارے، اپنی زمینوں کا رہن چھڑوایا۔ محکمہ انہار پنجاب کی کالونیوں میں سرمایہ کاری کی، بہاولپور، بیکانیر اور سندھ میں زرعی اراضی خرید کی۔ کاشت کار کے سر سے تقریباً دو نسلوں کے قرضوں کا بوجھ اور اس کی پریشانی ختم ہو گئی۔ قرضہ دینے والوں کی شرح منافع میں کمی واقع ہوئی، کاشت کار اور اس کے اہلِ خانہ کے لیے خاصا مال بچنے لگا۔''

بنکوں اور ساہوکاروں کے قرضہ جات کی ادائیگی کی گئی۔ ''بہتر ہے کہ قرضہ لینے والے بن جاؤ۔ بجائے قرضہ دینے والے کے'' ایک پنجابی کسان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی، یہ قرضہ لینے کا بڑا بہترین وقت ہے۔''

ضلع لدھیانہ کے دیہاتوں کی معاشی صورت حال کا جائزہ لینے والے رام سوارپ نکرا نے ایک ہی تاثر دینے والے مختلف الفاظ تلاش کیے۔ مثلاً انھوں نے عوام کے لیے جنگ کو

''نعمت'' قرار دیا۔ جبکہ کاشت کاروں کے لیے ''خوش بختی'' قرار دیا اور بڑے واضح انداز میں اس بات کا اظہار کیا کہ ''مجموعی طور پر اس تمام صورت حال میں کاشت کار بڑا کامیاب رہا۔'' اس بات کا عکس پنجابی کی دو ضرب الامثال سے جھلکتا ہے جنھیں نکرانے نوٹ کیا، ان ضرب الامثال کا تعلق خوشحالی سے ہے: ''تمام لوگ روٹی کھانے کے قابل ہو گئے ہیں (سارے روٹی کھان لگ گئے نیں)؛ ''جس جاٹ نے آج کل پیسہ نہیں دیکھا وہ جاٹ کہلانے کے لائق نہیں'' (جس جاٹ نیں اج پیسہ نئیں ویکھیا جٹ کیوں اکھواندا اے)۔

پنجاب پر کیے جانے والے تبصروں نے اس وقت کے پنجاب کو تخیلاتی سرزمین قرار دیا ہے۔ جہاں سونے اور چاندی کے زیورات پہنے جاتے تھے اور چائے کے ساتھ اصلی گھی پیا جاتا تھا، غرض کہ پنجاب میں خوشحالی کا مطلب زیادہ سے زیادہ کھانا پینا تھا۔ حتیٰ کہ اگر چائے کے ساتھ گھی اور نمک کی چٹکی بھی لی جا رہی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگ ان کھیتوں کھلیانوں میں خوشحالی لے کر آئی ہے۔

ہندوستان کے درمیانے طبقے میں جنگ کے ملے جلے اثرات تھے۔ نوجوانوں کے لیے جنگ کا دور آسان تھا۔ اس معاشرے میں اوسط درجے کی ملازمتیں مفقود تھیں اور 1930ء کی دہائی میں یہ بحرانی صورت اختیار کر گئیں اور اس بات کی تصدیق پڑھے لکھے نوجوانوں کے حوالے سے تیار کی گئیں صوبائی رپورٹوں سے کی جا سکتی ہے۔ کئی کالج یا ہائی سکول کے طالب علم کے لیے ملازمت کا حصول، مثلاً کسی حکومتی بحری جہاز پر ملازمت حاصل کر لینا، زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تصور کی جاتی تھی۔ گورنمنٹ کی ملازمت آمدنی کے علاوہ، برطرفی سے تحفظ اور مناسب پنشن کی دستیابی ایک تحفے سے کم شمار نہیں کی جاتی تھی۔ جنگ کے آغاز سے ہی وہ کچھ شروع ہو گیا جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اوسط درجے کی ملازمتوں کی بڑے پیمانے پر دستیابی ہوئی۔ پہلے بے روزگار لوگ ملازمتیں تلاش کرتے تھے۔ جنگ شروع ہوتے ہی ملازمتیں دینے والے افراد تلاش کرنے لگے۔ ایک حکومتی رپورٹ کے مطابق ''ایک وقت ایسا آیا کہ دفاتر میں کام کرنے کے لیے پڑھے لکھے افراد دستیاب نہیں ہوتے تھے، بھرتی کے قوانین میں نرمی کرنا پڑی۔'' کالجوں کے ہاسٹل جو پڑھے لکھے بے روزگار افراد سے بھرے ہوئے تھے، خالی ہونا شروع ہو گئے۔ شمالی ہند کی مخصوص بولی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ہر بیمار کے لیے ایک انار تھا'' (ہر فرد کی دیکھ بھال کی جانے لگی

تھی)۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کو فوج اور فوجی رسد سے منسلک محکموں میں بھرتی کیا جانے لگا۔ تعلیم یافتہ افراد کے لیے روزگار کا مسئلہ تقریباً ایک دھائی کے لیے حل ہو گیا حتیٰ کہ 1953ء میں یہ دوبارہ ابھرا۔

وہ لوگ جو پہلے ہی برسرروزگار تھے جنگ عظیم نے ان کا معیار زندگی گرا دیا: افراط زر نے محدود آمدنی والے شخص کو بہت متاثر کیا۔ کلکتہ میں بھارتی شماریاتی ادارے نے بالترتیب 1939ء اور 1945ء میں سروے کیے۔ ان میں بنگالی متوسط طبقے کی حالت زار کو بیان کیا گیا ہے۔ گوشت اور مچھلی کی کھپت آدھی ہو گئی اور دودھ کی آدھی سے بھی کم اور انڈوں کی کھپت جنگ سے قبل کے ایام میں ہونے والی کھپت سے ایک چوتھائی کم ہو گئی۔ متوسط طبقے کی زیادہ تر آمدن غذائی اشیاء پر صرف ہوتی تھی اور غذا بھی لذت سے عاری ہو گئی تھی۔ غذائی اشیاء پر زیادہ رقم خرچ ہونے کا مطلب تھا کہ باقی اشیاء کے لیے رقم نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس طبقے کے لیے ملازمین کی تعداد آدھی رہ گئی تھی۔ خاندان کی سابقہ آمدن میں سے تقریباً آدھی تو کپڑوں کی خریداری پر خرچ ہو گئی۔ ہندوستان کا عظیم تاریخ دان جدوناتھ سرکار، جنھوں نے اپنی بیشتر زندگی ایک سرکاری ٹیچر کی حیثیت سے گزاری، نے 1949ء میں اپنے ایک دوست کو 78 سال کی عمر میں ایک خط لکھا ''موجودہ اور اس سے قبل کی حکومتِ ہندوستان نے مجھے لوٹ لیا اور 47-1939 کے دوران مجھے جعلی کرنسی نوٹ اور کھوٹے سکے دیئے، میں اس بڑھاپے میں بھی کمائی کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ میں اپنے ماہانہ اخراجات پر اپنی گزشتہ بچت سے اخراجات کرنے کے قابل نہیں۔''

نچلی سطح کے حکومتی ملازمین میں اس طرح کی ترشی پیدا ہو گئی کہ اس کا مداوا ممکن نہیں تھا۔ نوجوان روزگار ملنے پر خوش تھے؛ لیکن پہلے سے ملازمت شدہ افراد جن میں کلرک اور اساتذہ شامل تھے ان کی مفلسی میں اضافہ ہوا اور وہ خاصے برانگیختہ ہوئے۔ یہی ماہ و سال صنعتی محنت کشوں کے لیے پریشان کن تھے۔ ہم پہلے ہی یہ ذکر کر چکے ہیں ایام جنگ بے پناہ صنعتی منافع جات کا زمانہ تھا؛ اگرچہ یہ بات لوگوں کی توقعات کے برعکس تھی، مجموعی طور پر شہری محنت کش جنگ کے زمانے سے بہتر طور پر مستفید نہیں ہو سکے۔ روزگار میں تو اضافہ ہوا، کام کرنے کے اوقات میں بھی اضافہ ہوا لیکن معاوضہ ان کے مطابق ادا نہیں کیا گیا۔ ایس اے پالیکر، جو محنت کشوں کے معیار زندگی سے متعلق (50-1939) کے دور میں تجزیہ نگار رہے، کی تحقیق کے مطابق 43-1939ء کے عہد میں

صنعتی محنت کشوں کے معاوضوں میں 30% تک کمی واقع ہوئی۔ سال 1943ء صنعت کاروں کے لیے منافع کمانے کا سال تھا مگر صنعتی محنت کشوں کو اس سال زیادہ محنت و مشقت کے باوجود انتہائی کم معاوضہ ملا۔ یہ صورت حال برطانیہ سے برعکس تھی مشہور ٹریڈ یونینسٹ ارنسٹ بیون افرادی قوت کے وزیر بن گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ میں محنت کشوں کے معاوضوں میں 80% اضافہ ہوا جبکہ ان کے معیار زندگی میں 31% تک اضافہ ہوا۔ برطانیہ کے محنت کش طبقے کی حالت بہتر ہوئی جبکہ ہندوستان کے محنت کش طبقے کی حالت ابتر ہوگئی۔ اس طبقے نے قبل از جنگ کے معیار زندگی کو بحال کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جس کو انھوں نے محض سال 1949ء میں حاصل کیا۔

پنجاب کو خوشحال علاقہ بیان کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ زرعی محنت کشوں اور کاشت کار طبقے کی تعداد کم تھی۔ 51-1950ء میں ہونے والی ایگریکلچر لیبر انکوائری، جس نے تمام متحدہ ہندوستان کی ریاستوں کا احاطہ کیا تھا (اور جو معاشرے کے اس طبقے کا اپنی نوعیت کا پہلا سروے تھا)، کے مطابق ان محنت کشوں کی آمدن کا 85% غذائی اشیاء پر صرف ہوتا تھا اور ان گھرانوں میں سے 96% میں مطلوبہ کیلوریز سے کم ہی حاصل ہو پاتی تھیں۔ ماہر اقتصادیات وی ایم دانیکر اپنے اعداد و شمار میں لکھتے ہیں: ''اگر یہ غربت نہیں تو اور کیا ہے؟'' دوران جنگ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں گندم کی قیمت اس سے حاصل شدہ آمدن سے بھی بڑھ گئی اور اس مفلس طبقے کی پریشانی میں اور اضافہ ہوگیا۔ اگر سال 1939ء کو ابتدائی سال قرار دیا جائے تو 1949ء کے آخر میں صوبہ مدراس میں آمدن کا اشاریہ 287 تھا جبکہ غذائی اشیاء کا اعشاریہ 413 تھا جو ایک سو تیرہ پوائنٹ آگے تھا۔ مفلس کاشت کار مزید غربت کا شکار ہوگئے۔

مفلسی کا یہ سلسلہ بنگال میں عروج پر چلا گیا اور اس نے ملک کے سب سے بڑے بحران کی صورت اختیار کرلی جسے 1943ء کے ''قحطِ بنگال'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بنگال میں غذا کا مطلب ہے چاول اور بنگال کے دیہی علاقوں میں رہنے والے بیشتر افراد کو چاول خریدنا پڑتا تھا۔ چاول کی قیمت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور اس کی قیمت غریب افراد کی بساط سے باہر ہوگئی۔ چاول مارکیٹ سے بھی غائب ہوگیا۔ اگرچہ بنگال میں سب سے زیادہ بحران کا شکار زرعی محنت کش ہی تھا تاہم ماہی گیر، ٹرانسپورٹ کارکنان اور دیہی دستکار بھی اس صورتِ حال سے متاثر ہوئے۔

دیہی علاقوں میں غذائی اشیاء کی خریداری کرنے والے متاثرین میں سے تھے جبکہ وہ کاشت کار، جن کے پاس گندم برائے فروخت تھی، اس بحرانی کیفیت سے بچ نکلنے کی کوشش میں لگے رہے۔ دیہی علاقوں میں قحط سال 1943ء کے ابتدائی ایّام میں شروع ہوا اور جولائی کے مہینے تک شدت اختیار کر گیا۔ اور متاثرین کو مجبور کیا کہ وہ ریل گاڑیوں میں بیٹھ کر ان مقامات کی طرف منتقل ہو جائیں جہاں غذائی اشیاء دستیاب ہیں۔ ان میں سے اکثر افراد کلکتہ آ گئے۔ بنگال کے گورنر نے ہوشربا خبریں بھیجی تھیں وائسرائے نے ابتداء میں اس سلسلے کو شکوک وشبہات کے ساتھ ہی لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر کسی پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ ایک گھمبیر المیہ پیش آ رہا ہے: فوجی جوانوں کو روزانہ گھروں اور گلیوں سے لاشیں اٹھا کر لے جانا پڑتی تھیں۔ قحط کے بعد وبائی امراض پھیل گئے؛ ملیریا سے بے شمار افراد جاں بحق ہوئے۔ اس کے علاوہ لوگ ہیضہ، پیچش، اسہال، معیادی بخار اور چیچک وغیرہ کا بھی شکار ہوئے۔ قحط سے زیادہ لوگ بیماریوں کی وجہ سے موت کے منہ میں گئے۔ مجموعی طور پر بنگال کا قحط دوسری جنگ عظیم کے دوران رونما ہونے والے کسی سانحے کے مقابلے میں کم نہیں اور اس عہد میں ہندوستان کا کوئی بھی سانحہ اس کے مقابلے میں چھوٹا نظر آتا ہے۔ اس قحط میں مرنے والوں کی زیادہ تعداد کا تعلق ہندوستان کے صنعتی محنت کش طبقے سے تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستانی فوج کے تیس ہزار افراد مارے گئے جبکہ بنگال کے قحط کی وجہ سے مرنے والوں کی تعداد اس کے مقابلے میں ڈیڑھ سو گنا تھی۔

برطانیہ کی سماجی تاریخ اس کے برعکس صورت حال سے گزرتی ہے۔ برطانوی حکومت یہ توقع رکھتی تھی کہ غذا میں راشن کا سلسلہ، محنت کشوں کا طویل دورانیہ اور جنگ کی عمومی پریشانیاں صحتِ عامہ کو متاثر کریں گی۔ بالکل اس کے الٹ ہوا، شاید یہ جنگ کے عجائب میں سے ایک تھا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جنگی سرگرمیوں کو بروئے کار لانے کے لیے صحت مند افراد کی ضرورت ہے، حکومت نے صحت عامہ کی کڑی نگرانی کی۔ غذائی ترسیل پر پہلے کی نسبت بہتر نظر رکھی گئی۔ قیمتیں مستحکم رہیں: معیار زندگی میں بڑھوتری کی شرح بھی کم رہی (ایک اندازے کے مطابق 31%)۔ زرعی اور صنعتی محنت کشوں کے لیے غذائی اشیاء وافر مقدار میں دستیاب رہیں اور یہ طبقہ، بہتر نتائج کے ساتھ اپنے معیار زندگی کو بہتر بناتا رہا۔ سالی 1942ء میں متعدی امراض میں کمی وقع ہوئی اور یہ شرح ریکارڈ کی حد تک گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی ماں اور بچے کی شرح اموات، شرح

مردہ زاد، شرح اسقاط اور شہری آبادی کی عمومی شرح اموات میں برطانیہ کی تاریخ میں ریکارڈ حد تک کمی واقع ہوئی۔ 1950ء کی دہائی کے وسط میں برطانیہ کی نیشنل فوڈ سروے کمیٹی نے ایک رپورٹ شائع کی جس کے مطابق: ''غذائی نقطۂ نظر سے برطانیہ میں محنت کش طبقے کی غذا 1944ء میں، جنگ سے پہلے کی نسبت زیادہ تسلی بخش تھی۔'' ہندوستان میں قحط زدہ افراد، غیر مفید تعداد میں موت کی وادی میں چلے گئے جبکہ برطانیہ کے کم مراعات یافتہ طبقے نے اپنا معیار زندگی بہتر بنایا۔

برطانیہ کے طبقۂ امراء کو ٹیکس کی مد میں ایک بڑی رقم ادا کرنا پڑتی تھی۔ راشن کے سلسلے نے پورے ملک کا احاطہ کرتے ہوئے ''تمام افراد کے لیے مساوی حصہ'' کا نعرہ استعمال کیا اور یہ نعرہ ملک کی شفاف پالیسی کی علامت بن گیا۔ برطانیہ کی نیشنل فوڈ سروے کمیٹی کے چیئرمین نارمن رائیٹ کے مطابق ''بھرپور روزگار کی فراہمی کے ساتھ، منضبط معیشت اور غذائی اجناس پر راشن کا کڑا سلسلہ برطانوی معاشرے کو معاشرتی عدم تفریق کی طرف لے آیا۔''

اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ آبادی کی اکثریت بہتر مالی حیثیت رکھتی تھی، اے جے ٹیلر کہتے ہیں: ''ملک کی بیشتر آبادی ماہر ہنرمندوں کے معیار زندگی پر گزارا کر رہے تھے۔ یوں امراء کے طبقہ کا معیار ذرا کم ہو گیا..... عوام کے لیے یہ صورت حال انہونی تھی۔'' پالی ایڈلین اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں، ''یہ نظریہ کہ جنگ کے ایام میں کسی قسم کا ''سماجی انقلاب'' رونما ہو رہا تھا، مبالغہ آرائی پر مبنی تھا۔ لیکن یہ بات بالکل درست تھی کہ 1930ء کی دہائی کی نسبت برطانوی معاشرہ عقیدہ مساواتِ انسانی اور اجتماعیت سے بھرپور نظر آتا تھا۔ برطانوی تاریخ دانوں نے ''طبقاتی ہم آہنگی'' کے مسئلے پر بحث کی ہے کہ آیا ایسا ہوا، کس حد تک ہوا اور کتنے عرصے کے لیے ہوا۔ اگر جائیداد کی تقسیم کو طبقات وضع کرنے کا معیار سمجھ لیا جائے تو تبدیلی انتہائی معدوم تھی؛ اگر آمدن کو معیار قرار دیا جائے تو خاصی تبدیلی رونما ہوئی تھی اور اگر روزمرہ کی کھپت کو شرح سمجھا جائے تو مساوات کا بہتر طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس طرح کی بحث کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہندوستانی معاشرے کی سمت کچھ اور ہے۔ قحط کی شرح بھی موجود تھی اور خوشحالی کی بھی اور وہ دونوں بیّن اور ظاہر تھیں لیکن یہ شرحیں نئی تھیں: یہ شرحیں طبقات کے درمیان تھیں اور ان میں غذائی کھپت کے معیار میں واضح فرق موجود تھا۔

3-اختتامیہ

1943ء میں آر ایچ ٹاؤنے (R.H. Tawney) نے پہلی جنگ عظیم کے ماحصل کے حوالے سے ایک شاندار مضمون تحریر کیا جس میں انھوں نے انکشاف کیا کہ ''سنسنی پھیلانا اور اس میں اضافہ کرنا جدید جنگی نوعیت کا تقاضا تھا اور اس اضافے کا مقصد حکومتی قوت واختیار کی معاشی زندگی پر بالادستی تھا۔ حکومتی قوت میں جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ تبدیلیوں کو بڑی سطح پر تسلیم کیا گیا۔ آزاد ہندوستان کی معاشی پالیسیاں بھی اپنے اوپر جنگ کی چھاپ رکھتی تھیں۔ انڈین سول سروس کے ایک ملازم نے کئی دھائیوں کے بعد تحریر کیا کہ ''آزادی کے بعد سے ہندوستان میں لاگو ہونے والا یہ ضابطہ حتیٰ کہ وہ ضابطے جن پر آج بھی عمل ہو رہا ہے، ان کا آغاز جنگ کے ایام میں ہوا۔'' مائیکل ہاورڈ کے مطابق دوسری جنگ عظیم کا ایک دیرپا اثر عوام پر حکومت کا بڑھتا ہوا اور تسلیم کردہ اثر تھا اور دوسرے عوام میں بڑھتا ہوا احساس ذمہ داری تھا۔'' گالاگر نے اپنے فورڈ لیکچرز میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سلطنت برطانیہ کے اثر کی تجدید کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں ہونے والے ایک سروے نے گالاگر کے نقطۂ نظر کی توثیق کر دی جس کے مطابق دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی سلطنت برطانیہ نے ایک کامیاب اور مضبوط تر حکومتی نظام کے حصول کو ممکن بنایا۔

یہ بات بہت دور تک چلی جاتی ہے۔ ہندوستان میں نو آبادیاتی ریاست کی حدود کا تعین کرتے ہوئے اس مضمون کی حیثیت تعریفی نہیں رہتی۔ تاہم اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ فوج میں بھرتی کے ذریعے، اتحادی افواج کی قوت کے ذریعے، قوانین کے نفاذ اور راشن سسٹم کے ذریعے برطانوی سامراج نے ہندوستانی معاشرے میں اپنا اثر ونفوذ بڑھالیا۔ 1940ء کی دھائی کے حوالے سے میرے ابتدائی کام میں اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ کس طرح دوسری جنگ عظیم کے دوران نو آبادیاتی ریاست نے اپنی سلطنت میں وسعت پیدا کی اور اپنی سرگرمیوں کا جال مزید پھیلایا۔ اس طرح یہ بات منظر عام پر آئی کہ کس طرح نو آبادیاتی ریاست نے ایام جنگ میں اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے، عوامی سطح پر، نئے معنی ومفہوم حاصل کیے، ریاستی ذرائع استعمال کر کے اعتراضات کا شکار ہوئے اور لام شکنی کی وجہ سے معاشرتی بے چینی کا شکار ہوئے۔ آزادی اور تقسیم کی عظیم سیاست سے ذرا بالا ہو کر میرا پہلا تجزیہ 1940ء کی دہائی میں ہندوستان

میں حکومتی قوت واختیار کے بحران کا از سرنو جائزہ پیش کرتا ہے اور اس بحران کے نتائج کا بھی احاطہ کرتا ہے؛ لیکن وہ تجزیہ، اس مضمون کی طرح، جنگ عظیم میں ہندوستان کی شمولیت، شرائط اور جنگ کے مختلف اثرات کا سلسلہ وار جائزہ پیش نہیں کرتا۔

وہ شرائط وحالات کہ جن کی وجہ سے ہندوستان جنگ میں شامل ہوا ان سے محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان نے خود اعتمادی سے دستبرداری اختیار کی۔ آر ایس سیرز (R.S.Sayers) کی تحریر کردہ برطانوی جنگی سرمایہ کی تاریخ میں حکومت ہندوستان کے جبری واکراہی رویے کا جائزہ لیا ہے ''ہندوستان کی طرف سے دی جانے والی سرکاری مالی امداد وشمار نے مالی بندوبست کا از سرنو جائزہ لینے کی تمام تر تجاویز پر پانی پھیر دیا..... ہندوستان کے حکومتی حلقوں میں ہونے والی کوئی بھی تفصیلی بحث سلطنت برطانیہ کے خلاف جائے گی اور ہندوستان کے صنعت کار تاجر جن پر جنگی پیداوار کا انحصار تھا، بھی تنقید کا نشانہ بنیں گے۔''

قیمتوں کی شرح اصل کہانی بتا دیتی ہے۔ ایک مشہور ماہر اقتصادیات اور اقتصادی تاریخ دان ڈی۔ آر گیڈگل (D.R.Gadgil) نے مشاہدہ کیا کہ ایام جنگ میں قیمتوں کا تعین کرنے کے لیے روایتی طریقہ کار مثلاً لاگت اور منافع کو نہیں دیکھا گیا؛ اشیاء کی قیمتیں وہ قرار پاتی تھیں جو پیداکاروں اور صنعت کاروں کے لیے قابل قبول ہوں۔ اس نے حکومت ہندوستان کی، غیر ضروری منافع کی رکاوٹ کے سلسلے میں ناکامی کا جائزہ لیا ہے..... کہ جن کی وجہ سے زرعی اور صنعتی پیداوار کی قیمتیں متاثر ہوئیں۔ پنجاب سے زرعی اجناس سستے داموں فراہم نہیں کی جاسکیں اور صنعتی پیداوار پر کنٹرول کرنے کے لیے بھی حکومتِ ہندوستان سرمایہ داروں کے دباؤ برداشت کرنے میں ناکام رہی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگ کے دوران ہندوستان میں زرعی اور صنعتی اشیاء کی قیمتوں کا تعین کینیڈین وار ٹائم پرائسس بورڈ یا وزارت رسد برطانیہ اور او پی اے (O.P.A) امریکہ سے یکسر مختلف تھا۔ ہندوستان میں دیگر اہم ممالک کی طرح کا باضابطہ ڈھانچہ تھا لیکن اس نے انوکھے انداز میں کام کیا اور ایسے انداز میں نتائج اخذ کیے جو کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آئے۔

یہاں پر ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں قیمتوں کے تعین کی پالیسیاں مختلف طبقات کی قوت (یا عدم قوت واختیارات) کو ظاہر کرتی ہیں۔

کچھ لوگ فاقہ کشی کا شکار ہوئے؛ اور کچھ لوگوں نے اتنا کھایا کہ زندگی میں اتنا کبھی نہ

کھایا تھا۔ خطوں میں اور اسی طرح سماجی طبقات میں جنگ کے متاثرین بھی تھے اور جنگ سے مفاد اٹھانے والے بھی، اور بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں خوشحالی آئی اور بنگال میں بدحالی۔ ایام جنگ میں ہونے والی کاروباری ترقی، خصوصاً پنجاب کی زرعی ترقی جسے تاریخ نگاری میں فراموش کیا گیا ہے، اس کی وضاحت اس مضمون میں کی گئی ہے۔

ایام جنگ میں پنجاب کی خوشحالی کی بڑی واضح شہادتیں ہیں لیکن تاریخ میں ان کی عکاسی موجود نہیں۔ اسے کیوں نظر انداز کیا گیا؟ شاید اس لیے کہ بنگال میں قحط سالی سے متعلق شعوری طور پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھنے والوں کا رجحان اسی طرف رہا۔ پنجاب میں خوشحالی کا اظہار کرنے کی بجائے اس سے لطف اندوز ہونا زیادہ مناسب نہیں سمجھا گیا پھر کچھ ہی عرصے بعد 1947ء میں صوبہ پنجاب تقسیم ہو کر پاکستان اور ہندوستان کا حصہ بن گیا اور اسی صوبے کی 34 ملین آبادی کو ہنگاموں اور ہجرت کا شکار ہو کر تاریخ میں ایک خاص قسم کے المیے کا شکار ہونا پڑا، ان تمام واقعات سے ادبی کتب کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اس مضمون میں بیان کردہ پنجاب کی خوشحالی تاریخی تحریروں میں فراموش کی گئی ہے۔ شاید اسی وقت ہندوستان کے کسی حصے میں رونما ہونے والے المیہ کی وجہ سے یا چند سال بعد پنجاب کی سرزمین میں ہونے والے سانحے کی وجہ سے دو مرتبہ اس کی اہمیت کو ماند کیا گیا اور پھر فراموش کر دیا گیا۔

اس کے برعکس بنگال کے قحط کی تشہیر کی گئی۔ یہاں سامراجیت کی چالوں کی دلیل مل جاتی ہے۔ بنگال کا قحط ہندوستانی قوم پرستی کے پیغام کی توثیق کے طور پر اجاگر کیا گیا اور پنجاب کی خوشحالی کو، قوم پرستی کے نقطۂ نظر سے، پر زحمت سمجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ اس قحط کی وجوہات اور (مرنے والوں کی) تعداد سے متعلق دلائل کا سلسلہ سالوں تک جاری رہا۔ فیمائن انکوائری کمیشن (Femine Enquiry Commission) کی سرکاری رپورٹ کے مطابق مرنے والوں کی تعداد 1.5 ملین تھی؛ بعد ازاں ایک ماہر اقتصادیات اے کے سن (A.K.Sen) کے اعداد و شمار کے مطابق مرنے والوں کی تعداد تین ملین تک پہنچ گئی تھی؛ اور بعد میں ہونے والے ایک تجزیے نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ 2.1 ملین کی تعداد درست تھی۔ قحط کی وجوہات سے متعلق ایک عام خیال یہ ہے کہ برما سے چاول کی درآمد کا شکار ہو گئی تھی اور بڑھتی ہوئی فوج کی غذائی ضروریات پوری کرنے کی وجہ سے چاول کی قلت واقع ہوئی۔ سین (Sen) اس نظریے کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے

''ایک محتاط اندازے کے مطابق بنگال کا مہلک قحط اس صوبے میں ہونے والی مجموعی غذائی قلت کا نتیجہ نہیں تھا۔ پیداوار میں معمولی کمی مارکیٹ میں شدید قلت کے طور پر ظاہر کی گئی۔'' گزشتہ قحط خشک سالی کی وجہ سے تھے جبکہ بنگال کا یہ قحط جنگی سرگرمیوں کی وجہ سے پیدا شدہ افراطِ زر کی وجہ سے تھا۔ اس رو سے یہ انسانوں کا بنایا ہوا قحط تھا۔ اس پر بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی غذائی پیداوار شرح آبادی کی نسبت کم تھی اور یہ بات بھی بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کم پیداوار کے باوجود کبھی بھی اس خطے کو قحط کا سامنا نہ ہوا۔ اعداد وشمار میں تمام تر احتیاط برتنے کے باوجود مرنے والوں کی تعداد ایک ملین (دس لاکھ) سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔

یہ پہلو قابلِ توجہ ہے۔ مرنے والوں سے متعلق بہت کم معلومات میسر ہیں۔ یہ لوگ نوآبادیاتی ریاست کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ جہاں تعداد کا درست علم نہ ہو آوازوں کا سنا جانا بعید از قیاس ہے۔ اگر ہم کسی واقعے کی اہمیت شرح اموات سے لگائیں تو بلاشک وشبہ بنگال کا قحط ہندوستان میں سال 1940ء کا سب سے اہم واقعہ ہے اور اگر ہم حکومتی قوت واقتدار کے حوالے سے دیکھیں تو اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ قحط کی وجہ سے مرنے والوں میں زیادہ تر زرعی محنت کش تھے اور ان کا تعلق دیہات کے غریب طبقے سے تھا۔ ایک ایسی صورت حال میں جہاں حق رائے دہی کے لیے ملکیت اور تعلیم کو بنیاد بنایا گیا تھا، مرنے والوں کی اکثریت کا اندراج صوبائی ووٹر لسٹ میں نہیں تھا۔ اگرچہ اکثر لوگ کلکتہ کی گلیوں میں فوت ہوئے۔ درحقیقت ان کا تعلق شہروں سے نہیں تھا۔ غذائی سکیموں کے رائج ہونے کی وجہ سے شہروں کے رہنے والے محفوظ تھے۔ یہ بیچارے غریب لوگ تھے جو مرنے کے لیے شہروں میں آئے تھے۔ اس تمام تر مصیبت اور پریشانی کے باوجود ان کی حیثیت حاشیائی ہی رہی۔ مرنے والے جدید سیاست کے تھیٹر میں کوئی اداکار نہیں تھے۔ 1946ء میں کلکتہ میں قتل عام کی وجہ سے پانچ ہزار افراد مارے گئے۔ اس سے بنگالی ''بھدرالوک'' کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور زبردست ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا لیکن بنگال کی نشاط ثانیہ کے سپوت بنگال کے قحط سے ناآشنا رہے۔ اگر کوئی بھکاری دہلیز پر وفات پا جائے تو یہ یقیناً مقام افسوس ہے لیکن ہندوستان کے متوسط اور اعلیٰ طبقات کی پرورش وتربیت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ مفلس کی دہائی سے غفلت برتتے ہیں۔ بنگال کا عظیم قحط ایک دلخراش انسانی سانحہ تھا لیکن، کلیتی

نقطۂ نظر سے، سیاسی ابتری کے لیے کسی اہمیت کا حامل نہیں۔ بنگال کے قحط میں مارے جانے والوں کا شمار بھی نہیں ہوسکا۔ اس لیے کہ وہ زندگی میں بھی کسی شمار میں نہ تھے۔

اگرچہ بے شمار ہندوستانی جنگ سے متاثر ہوئے مگر ہندوستان متاثر نہیں ہوا۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے اساسی اور بنیادی تمہید کی ضرورت ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں ایسا بہت کچھ ہے جو سامراجی یا قوم پرستی کے نقطۂ نظر کی عکاسی کرتا ہے۔ قوم پرست اور سرمایہ دار تاریخ، چاہے اس کے تناظر میں کوئی خطہ ہی کیوں نہ ہو، اپنے خطے کو نمائندہ سمجھتے ہوئے اسے کُل کا ایک جزو سمجھتی ہے۔ ایک خاص حوالے سے تجزیے کا ایک جزو ہے۔ لیکن، جیسا ہم نے دیکھا، مختلف خطوں اور مختلف سماجی طبقات کے تجربات میں ڈرامائی حد تک تبدیلی آسکتی ہے۔ ایک قومی سطح کی سوچ جذباتی اور ہیجانی کیفیت پیدا کرسکتی ہے؛ علاقائی اور طبقائی تجزیہ..... بین الاقوامی موازنہ۔ کبھی کبھار ادراک بھی پیدا کرسکتا ہے۔

بین الاقوامی موازنہ جات مفید ہوتے ہیں۔ اگر فوری نہیں تو یہ ذرا دیر سے مدد ضرور کرتے ہیں۔ اتحادی ممالک کے لیے جنگیں عام سرگرمی کے مبالغے کا کام کرتی تھیں: یہ مضمون میں مبالغہ نامی چیز نہیں اور حکومتی قوت واختیار کو بروئے کار لا کر لفظ ''جنگی سرگرمیاں'' اور ''راشن سسٹم'' کے مفہوم ومعانی کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا۔ راشن سسٹم کا ہندوستان اور برطانیہ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ابلے ہوئے چاول اور تلے ہوئے سور کے گوشت میں۔ حکومتی سربراہان چاہے لندن میں ہوں یا دہلی میں ان کی زبان ایک ہی ہوتی ہے؛ لیکن یہ دو حکومتیں مختلف انداز میں امور سرانجام دیتی تھیں۔ نوآبادیاتی سیاست پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اسے برطانوی سیاسی ثقافت نے تبدیل کر دیا ہے تاہم ان کی شناسائی اور ہیجان کے لیے تفریق بہت ضروری ہے اور ایسے وقت میں جب دیگر الفاظ جیسے ''معاشی منصوبہ بندی''، ''نج کاری'' اور ''عالمگیریت'' کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جارہا تھا، تو تفریق کو یاد رکھنا بالکل مناسب تھا۔ اسی طرح کا ذخیرۂ الفاظ مختلف حقائق پر پردہ ڈال سکتا ہے۔

اس مضمون میں اس تضاد کو اُجاگر کرنا مقصود ہے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران حکومتی سطح پر سلطنتِ برطانیہ میں اور نوآبادیاتی حکومت کے زیرِ اثر ہندوستان میں دیکھا گیا تھا۔ ان دونوں حکومتی سرگرمیوں کا علیحدہ سے بڑا واضح مشاہدہ کر کے ان کی درجہ بندی یا ان میں تفریق کی جا

سکتی ہے۔ اگر ان دونوں میں تفریق کی جائے تو تصویر زیادہ بہتر نظر آ سکتی ہے۔ یہ تضاد ہمیں بتائے گا کہ حکومت اور سماجی طبقات کے درمیان کیا رشتے ہیں۔ یہ دعوے کہ نوآبادیاتی دور حکمرانی مہذب اور بہتر تھا، یا آہ و بکا کا یہ سلسلہ کہ وہ شعلہ فشاں اور ظالم تھا، اسے ان کہا ہی چھوڑ دیں۔ برطانیہ میں حکومت اس امر میں کامیاب ہوگئی کہ وہ، ملک کی اشرافیہ سمیت، معاشرے کے تمام طبقات کو فوج میں بھرتی کر سکے۔ نوآبادیاتی حکومت لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور نہیں کر سکی بلکہ، معاشی مفادات کا بہلاوا دے کر، لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتی رہی۔ جوں جوں جنگی سامان کی کھپت ہوتی رہی، برطانیہ نے اپنی صنعتی پیداوار میں اضافہ کیا؛ ہندوستان جہاں پیداوار کا دائرۂ کار وسیع تر نہیں تھا جنگی ضروریات کو عوامی کھپت کے زمرے میں لایا جانے لگا۔ اگرچہ پیداوار میں اضافہ ہوتا رہا، برطانیہ میں راشن سسٹم کے موثر نظام سے کھپت میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ اس سے برطانیہ کا اعلیٰ طبقہ بھی متاثر ہوا؛ ہندوستان میں بھی قیمتوں کی بڑھوتری سے کھپت میں کمی واقع ہوئی لیکن اس سے ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ متاثر نہیں ہوا۔ برطانیہ میں جنگ کے اخراجات ٹیکس کی صورت اکٹھے کیے گئے؛ ہندوستان میں جنگ کے اخراجات کاغذی (نوٹ) چھاپ کر پورے کیے گئے جس سے افراط زر واقع ہوا۔ برطانیہ میں قیمتیں مستحکم رہیں لیکن ہندوستان میں ان قیمتوں میں تین گنا اضافہ ہوا۔

اس طرح کی مختلف حکومتی سرگرمیوں کی وجہ سے مختلف سماجی نتائج سامنے آئے۔ برطانوی معاشرے میں کچھ مساوات پیدا ہوئی؛ لیکن ہندوستانی معاشرے میں موجود خلیج میں اضافہ ہوا۔ برطانیہ میں راشن سسٹم سے غذائی اشیاء کے استعمال میں برابری پیدا ہوئی، اور غذائی معیار میں بہتری پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں زرعی اجناس کی قیمتیں بڑھنے اور صنعتی میدان میں بے پناہ منافع آ جانے اور اس سے منسلک ٹیکس کی مد میں اضافے کے باوجود بنگال کے قحط سے تین ملین افراد لقمہ اجل بنے۔

دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کی اشرافیہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بچوں کو محاذ جنگ پر بھیجیں، انھیں اپنی ضروریات کو کم کرنے اور قومی خزانے میں بڑے پیمانے پر عطیات دینے کے لیے بھی کہا گیا۔ عین اسی وقت وسائل میں کمی کا شکار ہونے کے باوجود، ہندوستان کی نچلی ذاتوں سے ترش روّیہ رکھنے کے باوجود، ریاستی حکومت کا روّیہ ہندوستانی اشرافیہ کے ساتھ نرم ہی رہا۔ ان

کی ضروریات میں آسانی سے کمی نہیں لائی جاسکی اوران کے منافع جات پر بھرپور طریقے سے ٹیکس نہیں لگایا جاسکا۔ ہندوستان میں مضبوط سماجی طبقات سے تھوڑی قربانیوں کی ہی توقع رکھی گئی، اور ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ ہندوستان میں کچھ طبقات بڑی شان وشوکت سے نوازے گئے ہیں۔ دونوں حکومتیں وسائل جمع کرنے کی خواہاں تھیں لیکن اپنے مطلوبہ اہداف کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مختلف لائحہ عمل اختیار نہیں کیے۔ جنگی صورتِ حال کے مدنظر برطانیہ کی حکومت نے اشرافیہ پر کچھ پابندیاں عائد کیں جبکہ نوآبادیاتی حکومت نے ہندوستان کے نچلے طبقات کو فاقہ زدگی پر مجبور کیا۔ مزید یہ کہ برطانیہ میں جنگی سرگرمیوں کے پیش نظر اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ برطانیہ کے نچلے طبقات کی تسلی وتشفی کروائے؛ ہندوستان میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ حکومت اشرافیہ کے مفادات کا تحفظ کرے۔ مجموعی طور پر ہندوستان میں جنگی سرگرمیاں اشرافیہ کے، بلکہ ان کے مفادات کے، رحم وکرم پر تھیں؛ برطانیہ میں مسئلہ ایسا نہیں تھا۔

جب کوئی ریاست طویل جنگ لڑ رہی ہو، مزید وسائل کی توقع بھی نہ ہو، اور وہ ملک کی اشرافیہ سے یہ بھی امید نہ رکھے کہ وہ اپنے اخراجات میں کمی لے آئے گی، تو ایسی حکومت کے سامنے کون سی تجویز ہوگی؟ ایسی صورت میں حکومت اور سماجی طبقات کے درمیان قوت کے رشتے کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں اپنے آخری دور میں نوآبادیاتی حکومت، برطانوی حکومت کے مقابلے میں، ایک کمزور چیز تھی۔

اس رشتے نے ایک روایت چھوڑی۔ مابعد کی دہائیوں میں آزاد ہندوستان کی حکومت نے ضرورت سے زائد افراد کو بھرتی کر کے ان پر ضرورت سے زیادہ رقم خرچ کی؛ لیکن آج تک یہ حکومت ایسا کوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کر سکی کہ وہ اشرافیہ سے، کامیابی کے ساتھ، وسائل حاصل کر سکے۔

❁❁❁❁❁

ہندوازم (ہندومت) کا تاریخی ارتقاء

اشفاق سلیم مرزا

چند نئے مباحث

اکنامک اینڈ پولیٹکل ویکلی (انڈیا)(Political and Economic Weekly) کے 6 مئی 2006 کے شمارے میں ہندوستانی تاریخ پر جو نئی مباحث چل پڑی ہیں اُن کا ایک تجزیہ کیا گیا ہے۔ اِن کا آغاز کیلی فورنیا میں قائم شدہ چند اداروں کی طرف سے ہوا ہے۔ جن میں ویدک فاؤنڈیشن (Vedic Foundation) اور ہندو فاؤنڈیشن (The Hindu Foundation) سرفہرست ہیں۔ اِن اداروں کی طرف سے کیلی فورنیا میں ہندی تاریخ کی نصابی کتابوں میں جو تبدیلی لائی جارہی ہے اُس پر نئی مباحث کا آغاز ہوا۔ تاریخ دان، سیاسی اور مذہبی کارکن اور امریکہ میں موجود باشعور ہندی شہری اِن مباحث میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ خصوصاً اِس تحریک کے علما قدیم تاریخ اور مذہب کو نئے ڈھنگ سے پیش کررہے ہیں۔ جن موضوعات کو ہدف بنایا جارہا ہے اُن میں ذات پات کا نظام، ذات پات کے نظام کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں ہندوازم کا کردار، اور ہاں سب سے اہم بات قدیم ہندو مذہب اور احدیت کی مرکزیت کے تصور کو اہم ترین قرار دیا جارہا ہے۔ اِس صورت حال کے پیش نظر مذہب کے دوسرے مکاتیب ہائے فکر ادویتا (Advaita) وسشٹادویتا (Visishtadvaita) دیوایتا (Dwaita) اور غیر ویدک مذاہب خصوصاً بدھ مت، جین مت اور تنتر ک مذہب کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔

ویدک فاؤنڈیشن نے کیلی فورنیا کے ریاستی تعلیمی ادارے (California State

Department of Education) کو رپورٹ پیش کی۔ جس میں تاریخی اغلاط کی نشان دہی کی گئی تھی اور یہ بھی سفارشات کیں کہ نصاب میں شامل آٹھ کتابوں میں تصحیح کی جائے۔ 20 ستمبر 2005 کو کیلی فورنیا کے تعلیمی بورڈ کی (Curriculum Committe) نے سیکرمنٹو (Sacramento) میں اُن سفارشات کو سنا اور مختلف گروپوں کی طرف سے آئی ہوئی رپورٹوں کی روشنی میں ایک ایڈہاک کمیٹی قائم کی گئی۔ جس میں کریکلوم (Curriculum) کمیٹی کے اراکین کے علاوہ پینل ماہرین بھی شامل کیے گئے جو کہ نصاب میں شامل نئے موضوعات پر غور کریں گے قدیم تاریخ کے ماہر کے طور پر شوابا جپائی کا نام بھی بطور نظرِ ثانی کے لئے شامل کیا گیا۔

ہم یہاں اپنے مضمون کے حوالے سے صرف تیسرے حصے پر بات کریں گے۔ جہاں ہندو ازم کو احدیت کا پرچارک کہا گیا ہے۔ اِس بحث میں بھی کہا گیا ہے کہ وید (Vedas) تو کرم اور دیوتاؤں کی خوشنودی کی رسومات پر زور دیتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کی اِس دنیا میں خوشحالی ہو سکے اور مُکتی مل سکے۔ جبکہ اپنشد (Upanishads) ہندوستانی فلسفہ کی فکر انتہائی بلندیوں تک لے گئے۔ اِس لئے قدرتی طور پر وہ ویدک دور کی رسومات کو اِس قدر اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک اپنشد میں نرگون (Nirguna) بے صفت اور ساگون (Saguna) صفتی کے مابین ایک کھچاؤ سا پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں تعقلات خدا کے حوالے سے ہیں۔ کیونکہ اپنشدوں میں خدا کا تصور قدیم ویدک دور کے دیوتاؤں سے بالکل مختلف ہے جو اِس دھرتی پر موجود انسانوں سے مختلف انداز میں خارج میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اپنشدوں کا خدا تو لافانی حکمران ہے جس نے تار کی طرح سب چیزوں کو پرو رکھا ہے۔ اس طرح اپنشدوں کا برہمن یعنی حقیقتِ مطلق کی طرف جانا خوشنودی کی رسومات کے ذریعے عمل میں نہیں آتا بلکہ یہ خود کو پا لینے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

یہ ساری بحث شاید اِس ہدف کی طرف بڑھ رہی ہے جہاں یہ ثابت کیا جا سکے کہ قدیم ہندوستان میں واحدانیت بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اور اُس کی بھی قدیم مذہبی مماثلت مشرقِ وسطیٰ کے باقی تین مانے ہوئے الہامی مذاہب کے ساتھ ہے۔

ہندوستان میں اس وقت جو قوم پرستی کے دباؤ کے تحت تاریخ کو نئے ڈھنگ سے لکھنے کی ہوا چلی ہے اُس سے بہت سے نئے سوال پیدا ہو رہے ہیں۔ اُن میں مغربی دنیا کے مستشرقوں کی اسناد کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ جن میں (Oriental Despotism) سے لے کر ایشیائی طریقہ پیداوار

تک سب اِن کی زد میں ہیں۔ ہندوستان کے قوم پرست تاریخ نویس خصوصاً ہیگل اور مارکس کو ہدفِ تنقید بنا رہے ہیں کہ اُن کا علم ذاتی تجربات کی بنا پر نہیں تھا بلکہ وہ مغربی مستشرقوں کے تعصبانہ مشاہدات اور تحریرات کو بنیاد بنا کر نتائج اخذ کر رہے تھے۔

انہی میں ایک یہ واحدانیت کی رو بھی چل پڑی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جگہ مذہب کی نشو ونما واحدانیت سے شروع ہو۔ بلکہ اکثر یہی نتائج اخذ کئے گئے ہیں کہ بہت سے مراحل سے گذر کر مذاہب واحدانیت پر منتج ہوئے۔ جیسا کہ مصر میں اخناتون کے آتون اور حضرت موسیٰ کے یہواہ سے پہلے دیومالائی دیوتاؤں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس طرح دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بھی اپنا ایک دیومالائی نظام تھا۔ یہ بات چین، ہندوستان اور دوسرے علاقوں پر بھی صادق آتی ہے۔

واحدانیت کے بارے میں یہ بحث کوئی نئی نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی 1912 میں پادری ولہلم شمٹ (Wilhelm Schmidt) نے اپنی کتاب (The Origin of the Idea of God) میں کہا تھا کہ بہت سے دیوی، دیوتاؤں کی پرستش سے پہلے بھی قدیم ترین واحدانیت موجود تھی۔ اور وہ صرف ہستی اعلیٰ کو مانتے تھے۔ جس کا مسکن آسمانوں میں تھا۔ اور بھی بہت سے افریقی قبائل جن تک الہامی مذاہب نہیں پہنچے اپنے اپنے تئیں کسی نہ کسی ہستی اعلیٰ (Supreme being) کی پرستش کرتے ہیں۔ (اس بات کی تفصیلات کیرن آرم سٹرونگ نے اپنی کتاب میں بتائی ہیں۔ (1999:9)

ایک دوسری بات جو بیان کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے محقق یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر میں جو معاشی اور سماجی انقلابات برپا ہوئے۔ اُنہوں نے مذہبی تعقلات کو تبدیل کرنے میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ کچھ محققین موسوی حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ خروج کی کہانی دراصل مصر کی اشرافیہ اور اُن کے کنعانی حلیفوں کے خلاف کسانوں کی کامیاب بغاوت کا اساطیری بیان ہے۔

تو ہم بات کر رہے تھے ہندوستان میں واحدانیت کی۔ یہ بات اِس سے پہلے بھی اٹھارہویں صدی میں کئی ایک مستشرقین کے حوالے سے زیر بحث آئی۔ یہاں میں سکریفٹون اور کراوفرڈ (Scrafton & Craufurd) کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جو اِس بات پر مُصر

تھے کہ برہمن پجاریوں کے حوالے اور اپنشد اور آرینک کے حوالے سے جو برہمن کا تصور ہے وہ واحدانیت کا پتہ دیتا ہے۔ مثلاً کراوفرڈ یہ کہتا ہے کہ اگر ہم ہندومت کی بے راہ روی سے ہٹ کر اُس کی روح کو پہچانیں تو وہ خدائے واحد پر یقین کی طرف لے جاتا ہے ایک ایسا خدا جس کا شروع اور انت کوئی نہیں یعنی زمان و مکاں سے ماورا ہے۔ (1790:139) اُن کے نزدیک بہت سے دیوی اور دیوتاؤں کے تار پود خدائے واحد کے مختلف روپ وضع کرنے کے لئے بکھیرے گئے۔

جیسا کہ شوبھرا شرما نے کہا ہے کہ اس ہستی اعلیٰ (Paramount god) تک پہنچنے میں بہت وقت لگا۔ بہت فلسفیانہ غور وفکر اور کاثر الوہیات (Polytheism) کے مرحلوں سے گذرنے کے بعد وہ یہاں پہنچے۔ ویدک دور میں جو اعلیٰ مقام اندر اور درونا اور برہمن دور میں جو مقام پرجاپتی، رسومات اور قربانی کو حاصل تھا۔ وہ مقام برہمن یعنی ہستی اعلیٰ کو مل گیا۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ اندر اور پرجاپتی ایک مقام پر برہمن کے محل کے باہر کی حیثیت حاصل کر گئے۔ جیسا کہ کاوشی تاکی اپنشد (1:5) میں بیان کیا گیا ہے۔

''وہ الیا کے درخت کے نزدیک پہنچتا ہے۔ وہ سالجیا شہر کے نزدیک آتا ہے۔ اور برہمن کی خوشبو کو پاتا ہے۔ وہ اپرجیتا کے محل کے نزدیک آتا ہے اور برہمن کی شان وشوکت اُسے گھیر لیتی ہے۔ وہ محل کے دربانوں اندر اور پرجاپتی کے پاس پہنچتا ہے۔ وہ اُسے دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔'' (1965:277)

اِس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں کہ اِس کی تفصیلات ارتقائی مراحل میں، جب اپنشد پر آئیں گے تو پھر بیان کریں گے۔ لیکن جیسا کہ رشید ملک صاحب نے بھی بیان کیا اور اِس سے پہلے بہت سے مستشرقین نے بھی اپنشد تین الفاظ کا مرکب خیال کیا جاتا ہے۔ یعنی اپ معنی قریب نی معنی نیچے شد یا سد بمعنی بیٹھنا مراد یہ کہ شاگردوں کا اپنے گرو کے قریب بیٹھنا۔ عام معنی اِن سے مراد خفیہ تعلیمات بھی لیا جاتا ہے۔ (2002:130)

اب جو دوسری بحث کی طرف یہاں اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ اِس سے متعلق ہے کہ آریاؤں کا اصل وطن کون سا تھا۔ کیا وہ یہاں کے مقامی باشندے تھے یا پھر وسط ایشیا سے اُٹھ کر یہاں آئے۔ اِس سے بھی آگے جیسا کہ آج کل ہندوستان کے قوم پرست تاریخ داں کہہ رہے

ہیں کہ وادی سندھ کی تہذیب کا تعلق بھی آریاؤں سے ہے۔ یہ نظریہ بھی کوئی نیا نہیں ہے۔ جو مروجہ نظریہ سے اختلاف کرتا نظر آتا ہے۔ مروجہ نظریہ یا ایک (standard) نظریہ تو یہ ہے کہ آریاؤں نے وسط ایشیا سے چل کر مختلف اطراف کی طرف ہجرت کی اور وہ اِس دوران ہندوستان بھی آئے۔ لیکن اب قوم پرست اس نظریہ کی حقیقت پر بہت سے سوال اُٹھا رہے ہیں۔ ٹراوئمن کہتا ہے نہ صرف اب بلکہ بہت پہلے بھی جب آر۔سی مجمدار اور اے ڈی پوسلکر نے (History and Culture of the Indian People Vol. I) تدوین کی تھی تو مجمدار نے یہ کہا تھا جب کہ یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ہندوستان کا تاریخی دور آریاؤں کے ہندوستان آنے سے شروع ہوتا ہے تو بعض محققین اِس بات سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ وہ ہندوستان کو ہی آریاؤں کا اصل وطن سمجھتے ہیں۔ (2005-XIII)

ظاہر ہے کہ جب ہندوازم پر بحث کا آغاز ہوگا تو بحث ہندوازم تک ہی مختص رہے گی۔ ہم یہاں اِس بحث کو وادی سندھ کی تہذیب تک نہیں پھیلائیں گے کہ وہاں کے لوگ کن چیزوں کی پرستش کرتے تھے اور یہ کہ پجاری راجہ کا کیا کردار تھا۔ کیونکہ ابھی اس بات پر تحقیق اتنی آگے نہیں بڑھی ہے۔ دوسرے یہ کہ ابھی وہ تحریر بھی نہیں پڑھی گئی جسے راہ نما بنا کر بات کو آگے بڑھایا جا سکے۔

اِس لئے ہندوازم کا آغاز ویدک دور سے بھی شروع کیا جائے گا۔ کیونکہ اِس دور کے آغاز سے جو بات شروع ہوتی ہے وہ تحریری شکل میں موجود ہے۔ تاریخ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ہندوستان کے مذہب جسے ہم ہندوازم کا نام دے رہے ہیں تبدیلیوں کی زد میں رہا۔ اور اُس کی شکل میں اِس قدر تبدیلیاں آئیں اور اِس کی اتنی شاخیں ہوگئیں کہ اُن سب کو بھی احاطہ تحریر میں لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

بہر حال اصل کہانی بیان کرنے سے پہلے اِس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ کوئی دیومالائی تصور ہو وہ یا بعد میں آنے والے مذاہب کے بنیادی تعقلات اُن سب کا مرکز خیال انسان ہے۔ چونکہ وہ انسان کے خیال کا ہی پرتو ہیں۔ اس لئے وہ انسانی فلاح کے ہی گرد گھومتے ہیں۔ جیسا کہ کیرن آرم سٹرانگ نے ہندوازم کے بارے میں کہا ہے کہ مذاہب کے فوائد اور افادیت خالصتاً مادی اور اِس دنیا سے متعلق لوگ یہ چاہتے تھے کہ دیوتا اُنہیں مویشیوں، دولت

سے نوازیں اور حفظ وامان میں رکھیں۔ کیونکہ پہلے پہل آریاؤں کے ہاں بعد از ممات کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ لیکن بعد ازاں وہ سمجھنے لگے کہ جن لوگوں نے بہت سی قربانیاں دی ہیں وہ مرنے کے بعد آسمانوں میں دیوتاؤں سے جا ملیں گے۔(2006:6)

اس بات کی حمایت نراد۔سی چوہدری نے بھی کی ہے وہ کہتا ہے کہ ان کا بنیادی مقصد دنیاوی خوشحالی تھا۔ اور بار بار پیدا ہونے کا تصور اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ یہ دنیا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔(1979:10)

تاریخی مراحل

یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے پیروکار عمومی طور یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوازم یعنی ہندو مذہب بھی اس کے مذاہب کی طرح ایک (Monolithic) اور مرکب (Composite) مذہب ہے اور ہم ہندوستان میں اس مذہب کے پیروکاروں کو ہندو کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص سے یہ سوال کر ہی لیا جائے کہ ہندو کون ہوتا ہے؟ تو عام آدمی انتہائی سادگی سے یہ جواب دیتا ہے کہ وہ جو بتوں کو پوجتا ہے۔ اگر اس سے بھی بڑھ کر یہ پوچھ لیا جائے کہ وہ کون سے بتوں کو پوجتا ہے۔ تو جواب دینے والا شاید رام، کرشن یا پھر شو وغیرہ کے نام سے آگے کوئی دوسری بات نہ کر سکے۔ اس سے زیادہ نہ تو وہ کسی بحث میں پڑنا چاہتا ہے اور نہ ہی اُسے کسی دوسری بات کا پتہ ہے اور نہ ہی اُس کی عملی زندگی میں ان مباحث کا کوئی عمل دخل ہے۔ جب اُس کے منہ سے لفظ ہندو نکلتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ اُس نے قومی سطح پر ہر بات کا احاطہ کر لیا۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ میں نے ہندوستان کے کئی ایک شہروں میں عام آدمی کے ساتھ ساتھ بہت سے پڑھے لکھوں سے بھی یہ سوال کیا۔ لیکن وہاں سے بھی مجھے کوئی معقول جواب نہ مل سکا۔ اسی طرح میرے ذہن میں کئی ایک سوالات اُبھرے لیکن تشریحات کے بعد شاید ہم یہ جان لیں کہ ہندوازم ایک مرکب مذہب ہے یا پھر تاریخی ارتقا کے حوالے سے اُس کی کئی ایک جہتیں ہیں۔ ہندو لفظ کا ماخذ کیا ہے کیا یہ ایک جغرافیائی اصطلاح ہے یا مذہبی۔

اصطلاح ہندو کا ماخذ

زیادہ تر محققین اس بات پر رضامند ہیں کہ لفظ ہندو ایک مذہبی اصطلاح نہیں بلکہ ایک

جغرافیائی اصطلاح ہے اور لفظ ہندو کا ماخذ سندھو ہے۔ اس بات کی تصدیق و توثیق بہت سے محققین نے کی ہے۔ نرادی چوہدری (Nirad-1979:24) کا کہنا ہے کہ اصل میں لفظ ہندو ایک جغرافیائی اصطلاح تھا۔ جو کہ فارسی دانوں نے اُس سرزمین کے لوگوں کے لئے استعمال کیا۔ جسے آج کل باہر کے لوگ انڈیا کہتے ہیں اور انڈیا ہی یونانی اور لاطینی لوگوں کے لئے فارسی لفظ کا بدل ہے اور اسی سے ماخوذ ہے۔

دراصل جب آریائی شمال مغربی پاکستان سے اس سرزمین میں گروہ در گروہ آئے تو اُنہوں نے اس کو سپت سندھو کہا۔ عام معنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے اُن کی مراد دریائے سندھ اور اُس کے معاون دریا تھے جو شمال مغربی علاقے اور پنجاب میں بہتے ہیں۔ دراوڑی زبان میں لفظ سِڈ کے معنی ہیں بہنا۔ کیو، ڈی احمد کا یہ خیال ہے لفظ سِڈھی سندھ کا ماخذ ہے (Ahmad-1966-4) جس طرح دراوڑی زبان کا لفظ کوراگا ہندی میں آ کر کورنگا (بندر) بن گیا اور لنکا کو لنکا کہا جانے لگا۔ اس طرح سڈ بھی سندھ بن گیا۔

فارسی دان دراصل س کو ہ اور پ کو ف میں بدل دیتے ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے سپت سندھو کو ہفت ہندو کہنا شروع کر دیا۔ جس طرح سنسکرت کا سوم اس فارسی میں ہوم بن گیا اور اسورا، اہورا بن گیا۔ کیونکہ اوستا میں سوم کو ہوم کہا گیا ہے۔ رگ وید میں سڈ کے بہنے سے ہی دریائے سندھ کو دریاؤں کی ماں کہا گیا ہے (VII.36.4) اسی طرح مناجات ندی ستوتی (R.V.10.75) میں سب دریاؤں کا ذکر کیا گیا ہے سندھ (سندھو) جہلم (وتستا) چناب (اِسکنی یا چندر بھاگ) ستلج (ساتودری یا شتادرد) راوی (الراونی یا پروشنی) بیاس (وپاس) اور سرسوتی (سرسوتی) کہلاتے تھے۔

اسی طرح وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سپت اور ہفت معدوم ہوتے گئے اور سندھو اور ہندو باقی رہ گئے۔

یہ بھی اپنی جگہ درست ہے اور بہت سے محققین نے اس بات کی توثیق کی ہے کہ یونانیوں کے ہاں یہ لفظ ایرانیوں کے ذریعے متعارف ہوا اور آئیونیوں (Ionians) نے اسے ''انڈ'' کہا۔ آئیونیا ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر اولیں یونانی نوآبادی تھی جس کا مشرق کے ساتھ براہ راست زمینی رشتہ تھا۔ یونانیوں کے ہاں حروف (IA) علاقے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے

لیڈیا(Lydia) فریگیا (Phyrigia) اور سارڈونیا(Sardonia) وغیرہ۔ اس طرح ''Ind'' سے اس کی شکل مغربی دنیا کے لیۓ India بن گئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ موجودہ ارضِ ہندوستان کے قدیم زمانے میں جو نام رکھے گئے اُن میں ایک پُنیا بھومی بھی ہے جس کا مطلب ہے مقدس یا پاک سرزمین۔ اس طرح پاکستان کا مطلب بھی وہی ہے۔ باقی نام کچھ اس طرح تھے آریاورت، بھارت ورش، جمبوڈویپا وغیرہ وغیرہ۔

ویدک دور، جو اولین آریاؤں کے سماج سے متعلق ہے اُس کی جغرافیائی حدود کا تعین کرنا بھی ضروری ہے رگ وید کو مرتب کرنے والوں کے حوالے سے سپت سندھو کی جن جغرافیائی حدود کا ذکر کیا ہے اُن میں اختلاف کے باوجود عمومی طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ علاقہ افغانستان میں ہندوکش پہاڑی سلسلے سے لے کر گنگا جمنا دواب تک پھیلا ہوا تھا اور دوسری طرف کشمیر سے لے کر سندھ کی شمالی حدود تک پھیلا ہوا تھا۔ عرفان حبیب کا بھی یہی نقطہ نظر ہے(Irfan 2004-6)۔ رگ وید میں دریائے جمنا کا ذکر بمشکل تین دفعہ آیا ہے۔ جب کہ گنگا کا ذکر براہِ راست ایک دفعہ آیا ہے۔ پنجاب کے دریاؤں کے علاوہ جن دریاؤں کا ذکر آیا ہے۔ اُن میں راسا، سوسارٹو، سوتیا کوبھا، کرومو اور گومتی قابلِ ذکر ہیں۔ کرومو اور گومتی دریائے کرم اور گومل ہیں۔ جبکہ کوبھا دریائے کابل ہے۔ راسا کے ساتھ دو ایسے دریاؤں کا ذکر ہے جو افغانستان میں بہتے ہیں۔ دریائے ہری رود، ا‌ہمنداب ہلمند کا ذکر رگ وید ساریو اور سرسوتی کے طور پر آیا ہے جبکہ اوستا میں ناریوا اور ہارکادیتی کہلاتے ہیں۔ راسا دریا زرتشتیوں کے ہاں رنہا(Ranha) بھی کہلاتا تھا۔ گرس ولڈ کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ ویدک علاقے کے انتہائی شمال میں بہتا تھا اور ایک جگہ اُسے ماں راسا (Mother Rasa) بھی کہا گیا ہے۔ گرس ولڈ اُسے جیحوں یا سیحوں سمجھتا ہے(1923-29)۔

عام طور پر محققین اِسے آمو یا سرِ دریا ہی خیال کرتے ہیں۔ راسا پر تفصیل سے بات کرتے ہوۓ اس بات کا اعادہ کرنا مقصود تھا کہ رگ ویدک علاقے کی شمال مغربی حد دریائے آمو یا سرِ دریا تک تھی جنوب میں سمندر (Sumundre) کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ جس سے غالباً مراد جزیرہ عرب یا سندھ کا ڈیلٹائی علاقہ ہوسکتا ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ اِسے پنجاب کے دریاؤں کے ڈیلٹائی پاٹ ہی سمجھتے ہیں۔ یاد رہے کہ سرِ دریا اور آمو دریا کے طاس کا علاقہ ماوراالنہر کہلاتا ہے۔

ہندوازم سے متعلق جو ہمیں ادب ملتا ہے وہ ویدوں پر مشتمل ہے۔ وید کا مطلب ہے علم یا

حکمت، یا مقدس یا مذہبی علم۔ ویدوں میں کوئی ایک مجموعے کی شکل میں سامنے نہیں آئے۔ بلکہ زمانے کے ساتھ ساتھ اُن میں نشوونما ہوتی رہی۔ بہرحال ونٹرنٹز (Winternitz) کے مطابق ویدی ادب کے تحت تین قسم کی ادبی تحریریں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اور وہ درج ذیل ہیں۔(1991-53)

(1) سمہتا۔ یہ مناجاتوں، دعاؤں، منتروں، نیک خواہشات، عبادات اور قربانیوں کے طریقہ کار پر مبنی ہے۔

(2) برہمن۔ یہ زیادہ تر قربانیوں اور رسومات سے متعلق ہیں۔

(3) آریانیک۔ (جنگل کے متون) یہ آس گیان دھیان کا جو بندوں جوگیوں اور تارک دنیا لوگوں نے ہستی اعلیٰ سے لو لگانے کے لئے جنگلوں میں جا کر کیا۔ یہ ہستی اعلیٰ اور انسان کے رشتہ کو زیر بحث لاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہندو فلسفہ کے اولیں اشارے اِنہی میں ملتے ہیں۔

(4) اپنشد۔ اپنشد زیادہ تر ہستی اعلیٰ برہمن سے متعلق ہیں۔ اور دھرتی اور ہستی اعلیٰ یا خدا کے تعلقات کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنشدوں میں جو کہا گیا ہے اُس کی تلخیص کریں تو وہ یوں ہے۔ ''یہ کائنات برہمن ہے اور برہمن آتما ہے'' ونٹرنٹز اُس کی اپنے الفاظ میں یوں وضاحت کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا ہے اور خدا ہی میری روح ہے۔(1991:247)

سمہتاؤں کے یہ مجموعے بالآخر ایک زمانے میں چار ویدوں کی شکل میں ترتیب دیئے یعنی رگ وید، اتھروید، سام وید، یجروید (یجروید سیاہ اور سفید) پھر ان سے منسوب برہمن، آرینک اور اپنشد ہیں۔

ہندوستان میں مقامی سطح پر پیدا ہونے والے عام مذہبی رویئے عام طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ ویدالہامی کتابیں ہیں۔ گو ان کے بڑے حصے مختلف رشیوں کے حوالے سے سامنے آئے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ہند یورو پیائی اقوام کے پہلے دیوتاؤں یا خداؤں کے نام ملتے جلتے تھے اور وہ روشنی سے منسوب تھے۔ جیسا کہ دیوا سے ملتے جلتے الفاظ ہند یورپیائی زبانوں میں ہمیں ملتے ہیں۔ اس کی مثال پدرسری نظام میں دیوتاؤں جذ امجد سنسکرت میں دایوس پتار (Dyaus Pitar) یونانی میں زیوس (Zeus) اور لاطینی میں اُسے جوپیٹر (Jupitar) کہا جاتا ہے۔ دایوس کے ساتھ اُس کی

بیوی پرتھوی کا بھی ذکر آتا ہے۔ رگ وید میں اُن کا ذکر دوسرے دیوتاؤں کے جدِ امجد کے طور پر آتا ہے۔ بہت سی مناجات بھی اُن کے نام منسوب ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل مناجات میں دعا مانگی گئی ہیں۔

Full many are your treasures to be granted,
O Heaven and Earth, to every liberal giver,
To us may what you grant be not deficent,
Ye gods, with welfare evermore preserve us.

(R.V. VII 53:3)

یہ اولین مناجاتوں میں سے ہے اِس میں بھی دایوس اور پرتھوی سے مشترکہ طور پر جو دعا مانگی گئی ہے۔ وہ زمین پر بسنے والے انسانوں کی فلاح کے بارے میں ہے۔

اولیں دیو مالائی مناجاتیں اِس بارے میں اُلجھن کا شکار ہیں کہ پہلے کون سا دیوتا تھا اور بعدازاں کون سا تھا۔ کیونکہ ان کی ترتیب میں کوئی تسلسل نہیں ہے۔ اس لئے اکثر زمانے کے لحاظ سے مناجاتیں آگے پیچھے ہو جاتی ہیں۔ کبھی درون آگے آجاتا ہے تو کبھی اندر اور کبھی دایوس اور وشواکرمن، لیکن حتمی طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ دایوس اور پرتھوی سب سے پہلے تھے۔

یہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ رگ وید جس طرح دایوس کا ذکر ہے۔ اِس کی مماثلتیں ہمیں باقی ہندیورپیائی اقوام کی اولیں اساطیر میں ملتی ہیں۔ اِس طرح کہا جاتا ہے کہ دیواس (Dyaus) زیوس (Zeus) ڈیویس (Divus) تھیوس (Theos) ڈیوس (Deus) جونو (Juno) ڈائنا (Diana) ڈایانوس (Dianus) اور جانوس (Janus) کا ماخذ (Dyu) ہی ہے جس کا مطلب ہے روشنی۔

آئندہ ابواب میں ویدک مذہبی رویوں پر رگ وید کے حوالے اور آریاؤں کی دوسرے مذاہب کے ساتھ مماثلتوں پر بحث کی جائے گی۔

(جاری ہے!)

کتابیات

1. Armstrong, Karen. *The History of God.* Vintage, London 1999.
   The Great Transformation, Atlantic Books, London 2006.
2. Schmidt, Wilhelm. *The Origin of the Idea of God,* London 1912.
3. Renfrew, Colin. *Archaeology and Language* Cambridge University Press N.X. 1992.
4. Habib, Irfan, Thakur.V.K. The Vedic Age, Fiction House Lahore 2004.
5. Trautmann, T.R. *Aryans and the British Yoda* Press, N.Delhi 2004.
   The Aryan Debate Oxford, N. Delhi 2005.
6. Scrafton, L. *Reflection on the government of Industan,* Edinburgh, 1761.
7. Winternitz, Maurice. *History of Indian Literature* Munshiram Manoharlal Publisher N. Delhi, 1991.
8. Sharma, Shubhra. *Life in the Upanishads* abhinav N. Delhi Publications 1985.
9. Muller, Max. *The Sacred Books of The East, The Upanishads* Vol. I, Motilal Banarsidass Delhi 1965.
10. Cox, G.W. *The Muthology of The Aryan Nations.* Kegan Paul Trenchand Co. London 1887.
11. Chaudhuri, Nirad. C. *Hinduism, A Religion to live* by Chatto and Windus London 1979.

❁❁❁❁❁

درگاہ حضرت علی ہجویریؒ (1)

رسومات، روایات اور تقریبات

غافر شہزاد

جہاں جہاں مسلمان گئے اور مقامی لوگوں نے اسلام قبول کیا وہاں پانچ وقت کی نماز کی ادائیگی کے لئے ایک مسجد کا قیام لازمی عنصر کے طور پر کیا گیا مساجد کے ساتھ عبادت کا عمل منسلک کر دیا گیا اور یوں ایک تقدس کا احساس لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا۔ عبادت کے ساتھ صوفیاء نے جس ریاضت کو لازم قرار دیا یہ مساجد اس کے لئے مناسب خیال نہ کی گئیں اور یہیں سے درگاہ، خانقاہ کا تصور ابھرا اور جب کسی بھی درگاہ یا خانقاہ کا مرکزی کردار یعنی شیخ وصال کر گیا تو عمومی طور پر اسے اس کے حجرے میں دفن کر دیا گیا اور یہاں سے مزارات نے جنم لیا، جس طرح لوگ شیخ کے پاس اس کی زندگی میں رہنمائی کے لئے آتے تھے اس کے مرنے کے بعد وہ اس کی قبر پر بھی اس تعدد سے آتے رہے بلکہ اکثر اوقات یہ تناسب بڑھ گیا۔ اور یوں مسلم آبادی والے علاقے میں سے کہیں بڑھ کر مزارات پر مختلف سرگرمیاں انعقاد پذیر ہونے کے سبب زائرین کی آمد و رفت کا سلسلہ رات دن جاری ہو گیا۔ آج اکیسویں صدی میں یہ درگاہیں اور مزارات ہماری سماجی و مذہبی زندگی کا انتہائی اہم حصہ ہیں اور لوگوں کی کثیر تعداد ایک تسلسل سے ان آستانوں پر قدم بوسی کے لئے حاضری دیتی ہے۔

---

(1) درگاہ حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہور میں 1072ء سے زائرین کی عقیدت کا مرکز ہے۔

آج ان مزارات پر حاضری دینے والے دو طرح کے لوگ ہیں ایک تعداد ان لوگوں کی ہے جو یہاں انعقاد پذیر ہونے والی سرگرمیوں میں فعال شمولیت کرتے ہیں جبکہ زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی ہے جو شیخ سے اپنی دکھی زندگی، محرومیوں اور تہی دامنی کا رونا رونے آتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ شیخ ان کی مرادیں پوری کرنے میں اللہ کے حضور ایک وسیلے اور سفارشی کا کردار ادا کرے گا۔ لوگ پہلے درگاہوں پر خدا کی تلاش میں آتے تھے درگاہیں تہذیب وعلم اور مذہب کا مراکز تھیں مگر آج ان کا کردار قدرے تبدیل ہو گیا ہے۔ صوفیاء جہاں بھی گئے، انہوں نے اپنے کردار اخلاقیات اور عقیدے کی بنیاد پر مقامی لوگوں کی زندگیاں اور اعتقادات یکسر تبدیل کر دیئے۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں بھی کیا اُن کی زندگیوں پر بھی صوفیاء کی تعلیمات اثر انداز ہوئیں۔

حضرت محمدؐ نبی آخرالزماں نے اہل اسلام کو یہ خوشخبری سنا دی تھی کہ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی اور رہنمائی میں مسلمانوں کو جس ضابطہ حیات کی تکمیل کی نوید سنائی تھی اس میں مزید کسی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی مگر وقت کے ساتھ جب حالات اور معاشرت تبدیل ہوئی تہذیب کی نئی جہات روشناس ہوئیں تو یہ تبدیلی ناگزیر تھی اور آنے والی صدیوں میں صوفیاء نے ان معاملات میں رہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔ جغرافیائی حد بندیوں اور تہذیب و معاشرت میں فرق کے سبب دنیا کے مختلف خطوں میں علاقائی مذہب کی تشکیل ہوئی جس میں بنیادی اسلامی تعلیمات تو یکساں تھیں مگر تہذیب و معاشرت میں امتیاز ہونے کے سبب ایک انفرادی رنگ اور تشخص ابھر کر سامنے آیا جو انہیں اس خطے کے دیگر مذاہب کے پیروکاروں سے الگ کرتا تھا اور عالمی سطح پر اسلامی معاشرت اور مذہب اسلام سے جوڑتا تھا یہ تشخص دراصل تہذیب روایات اور رسومات سے ہی تشکیل پایا جو صوفیاء اپنے ہمراہ لے کر ہجرت کر کے آئے تھے۔ اور پھر مقامی طرزِ معاشرت اور رسم ورواج کو پہلے اپنایا اور پھر تبدیلی لائی۔

خانقاہوں میں مختلف خاندانوں گروہوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے انسانوں نے مل جل کر اجتماعی زندگی کا ضابطہ حیات تشکیل دیا اس سے قبل لوگ اپنے اپنے گھروں میں ایک خاندان کی سی زندگی بسر کرتے تھے اسلام پہلے ان لوگوں کو گھروں سے نکال کر ایک اجتماعی سماجی زندگی کے لئے مساجد میں لے کر آیا مگر یہاں مقصد صرف عبادت تھا اسی طرح صوفیاء ان لوگوں کو گھروں

سے نکال کر خانقاہوں میں لے آئے اور ان افراد نے کہ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، بغیر کسی خونی رشتے، مفاد، جبر کے ایک چھت تلے اجتماعی زندگی گزارنا شروع کر دی، چشتیوں کے ہاں جماعت خانے کے تشکیل ہوئی جہاں کھانے اور رہنے کے لئے مناسب انتظامات موجود رہتے تھے۔ اور رہنے والے سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں یہاں رہتے تھے اس طرح ایک نیا سماجی کلچر ابھر کر سامنے آیا جو کئی صدیوں تک جاری رہا بلکہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ علم بشریات کے ماہرین نے مزارات پر ہونے والی سرگرمیوں کے مطالعہ اور تجزیاتی جائزے کی جانب بہت کم توجہ دی ہے اگر چہ مخصوص تناظر میں رہتے ہوئے یہ سرگرمیاں، رسومات اور اعتقادات دین اسلام کا حصہ نہیں ہیں مگر ان کے دوررس اثرات لوگوں کی سماجی انفرادی اور مذہبی زندگی پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

شروع شروع میں ان رسومات اور روایات کا آغاز کیسے ہوا ہمیں اس سلسلے میں کہیں بھی تفصیلات نہیں ملتیں، صوفیاء اور ان کے مرکزوں کے بارے میں معلومات صرف تذکرہ جات، ملفوظات اور مکتوبات کی صورت میں موجود ہیں مگر ان میں بھی عقیدت مندی کا عنصر غالب ہے، تذکرہ جات اور ملفوظات میں عمومی طور پر شیخ کی زندگی اور اس کے فرمودات کے بارے میں معلوم پڑتا ہے، کسی بھی تذکرہ نگار نے ان رسومات اور روایات کے آغاز وارتقاء کے بارے میں کوئی خبر نہیں دی اور نہ ہی کبھی ان کے اثرات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح مختلف درگاہوں پر ان رسومات اور روایات کا آغاز ہوا، ہاں ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ان رسومات اور روایات کو جاری وساری رکھنے اور ان میں شمولیت کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے یہاں تک کہ عرس کے موقع پر ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے جبکہ عام دنوں میں جمعہ اور جمعرات کے روز حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے مزار پر زائرین کی تعداد ستر ہزار تک پہنچتی ہے، ظاہری طور پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ خدام اور گدی نشینوں نے یہ قوانین وضوابط، اصول یا روایات جو صوفیاء کی تعلیمات پر بنیاد رکھتی ہیں، تشکیل دیتے ہوئے یہ مقصد پیش نظر رکھا کہ درگاہ شریف پر ایک نظم وضبط قائم ہو، شیخ کے مہمان ایک طریقے اور سلیقے سے بغیر کسی الجھن و پریشانی کے ان سرگرمیوں میں شمولیت کریں خصوصی طور پر جبکہ سالانہ عرس کی تقریبات انعقاد پذیر ہو رہی ہوتیں ہیں یہ دراصل غیر مطبوعہ اخلاقی ضابطے ہیں جو درگاہ شریف پر وقوع پذیر ہونے والی

سرگرمیوں کو منظم کرتے ہیں۔ درگاہوں پر انتظامات کی ذمہ داری پہلے گدی نشینوں اور متولیوں کی ہوتی تھی مگر 1960ء سے پاکستان میں ایک نیم سرکاری ادارہ ایک آرڈیننس کے تحت مزارات پر تمام سرگرمیوں کو منظم کرتا ہے، عمارات کی تعمیر نو کرتا ہے زائرین کو بنیادی سہولیات کی فراہمی یقینی بناتا ہے اور عرس کے انتظامات کو احسن طریقے سے چلانے کے لئے ٹھوس حکمت عملی تیار کرتا ہے۔ عرس کے موقع پر ادارے یا زون کا سربراہ چادر پوشی و رسم غسل وغیرہ میں شرکت کرتا ہے۔

آج مزارات مذہبی رسومات و شیخ سے متعلق تقریبات کے انعقاد کے بڑے مراکز بن گئے ہیں، پہلے جو رسومات گھر یا محلے کی سطح پر انفرادی طور پر ادا کی جاتی تھیں ان کو ایک بڑے واقعے کے طور پر مشترکہ منایا جاتا ہے اس سے نہ صرف ان رسومات کی اہمیت بڑھ گئی ہے بلکہ ان کی ادائیگی میں جامعیت آ جانے کے سبب شرکت کرنے والوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے لوگوں کے مابین اخوت، بھائی چارہ اور تعلق باہمی مضبوط ہوا ہے یہ درگاہ کا دوسرا پہلو ہے جس نے آج کی مسلم معاشرت میں اسلامی جذبات و احساسات کی مجموعی و اجتماعی فضا کو اجاگر کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔

کسی بھی صوفی سلسلے کی یہ مخصوص رسومات ہی دراصل اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زندگیوں کے خدوخال تشکیل دیتی ہیں جن کو اپناتے ہوئے ہر مرید کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو پاک کر کے قرب حقیقی حاصل کر سکے گا۔ اس کی ایک عمومی مثال ''ذکر'' کی ہے صوفیاء کے ہاں اللہ تعالیٰ کے مختلف ناموں کا ذکر کرنے کے بے شمار انداز ہیں سب کا مقصد استغراق اور یکسوئی حاصل کرنا ہے اپنے ذہن کو غیر متعلق اور فالتو خیالات سے چھٹکارا دلانا ہے مگر اس کے لئے ایک تسلسل ذہنی یکسوئی اور یقین کی قوت درکار ہوتی ہے کچھ صوفیاء تنفس کے ردھم کے ساتھ ذکر کرتے ہیں کچھ قدرے اونچی آواز میں ورد کرتے ہیں اور کچھ نہایت زیریں آواز میں ریاضت کرتے ہیں یہ ذکر جلی اور ذکر خفی کہلاتا ہے ذکر کو صوفیاء نے خدا تک پہنچنے کے عمل میں ایک ریڑھ کی ہڈی کا درجہ دیا ہے، ذکر کرنے کے لئے صوفیاء کے ہاں سانس کو روکنے کی ریاضت کے مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

یوں تو موسیقی کی اسلام میں قطعی گنجائش نہیں ہے صرف قرآن اور اذان کو نہایت دلنشین آواز اور ردھم کے ساتھ ادائیگی کی اجازت دی گئی ہے خوش گلو قرآنی آیات کی تلاوت ایسے دلنشین

انداز میں کرتے ہیں کہ باطنی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ اذان اس انداز سے دی جاتی ہے کہ حجر شجر پرند انسان سبھی خاموشی سے سنتے ہیں۔ مگر موسیقی کی مختلف اشکال نے صوفیاء کی زندگیوں میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ صوفیاء نے موسیقی کی نئی جہات دریافت کی ہیں۔ موسیقی دراصل خوابیدہ جذبات اور احساسات کی بیداری میں نہایت سرعت سے معاونت کرتی ہے بلکہ استعاراتی الفاظ اور زیر و بم والی سکنات کے ساتھ موسیقی کو پیش کیا جائے تو ایک بڑی روحانی قوت جنم لیتی ہے لہٰذا قوالی خصوصاً چشتی صوفیاء کے روز و شب میں ایک اہم جزو بن کر شامل ہو گئی۔ جو لوگ قوالی کی مخالفت کرتے ہیں وہ بھی اس سے پیدا ہونے والی روحانی قوت کا اعتراف کرتے ہیں اس لئے بھی کہ کئی صوفیاء نے قوالی اور دھمال میں جان جان آفرین کے سپرد کی ہے، قوالی وجد کی کیفیت حاصل کرنے میں صوفی کی معاونت کرتی ہیں۔ صوفیاء نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دھمال سے کشف و وجد حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ زمین کی سطح سے اوپر اچھلنے کے عمل میں دراصل یہ خواہش پوشیدہ ہوتی ہے کہ زمان و مکاں کی حدود سے نکل کر روحانی وجود میں تحلیل ہو جانا ہی صوفی کے لئے معراج کا درجہ رکھتا ہے۔

ابتدائی طور پر مزارات پر انعقاد پذیر ہونے والی تقریبات و رسومات بہت سادہ اور کم ہوتی ہیں لوگ درگاہ پر سلام اور فاتحہ کے لئے حاضر ہوتے تھے، اور پھر رخصت ہو جاتے تھے مزارات سے ملحقہ مساجد یا تو ہوتی نہیں تھیں یا پھر بہت چھوٹی سی مسجد جو شیخ کی زندگی میں ہی تعمیر کی گئی ہوتی تھی، پھر درگاہ شریف پر آنے والوں کے لئے ایک ضابطہ تشکیل دیا گیا، ہر خانقاہ پر مہمان تین دن بغیر کسی کام کے رہ سکتا ہے، شام غروب آفتاب سے پہلے اس کو خانقاہ میں پہنچ جانا چاہئے وگرنہ اسے رات بھر باہر قیام کرنا پڑتا اور پھر صبح ہونے کے بعد ہی وہ خانقاہ میں داخل ہو سکتا تھا، تین دن سے زیادہ عرصہ اگر قیام کرتا ہے تو پھر مہمان کو کچھ کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی نے فاتحہ شریف کا پورا طریقہ کار اور اس دوران کیا پڑھنا چاہئے، نہایت تفصیل سے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔

یہ سادگی چودھویں پندرھویں صدی تک تھی اس کے بعد جب مغلوں کا عہد شروع ہوا تو ان درگاہوں پر ان کی متواتر حاضری کے سبب یہاں نئی رسومات شامل ہو گئیں، تقریبات و اعراس اور لنگر کے لئے خصوصی انتظامات کئے جانے لگے۔ ایک ایسا ضابطہ تشکیل دیا گیا جو اداروں کو چلانے

کے لئے لازم ہوتا ہے۔ اکبر نے پہلی مرتبہ درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پر ایک متولی کا تقرر کیا اور یوں درگاہ کے انتظامی اور مالی معاملات کا سلسلہ مسند شاہی سے جڑ گیا۔ بادشاہوں کو جب مختلف صوفیاء کے ہاں حاضری دینے کے بعد اولاد کی دولت ملی تو عقیدت اور توجہ اور بھی بڑھ گئی، سینکڑوں گاؤں سے حاصل ہونے والی آمدن اور فصلوں سے حاصل ہونے والا محصول یا ٹیکس درگاہوں کے نام مختص کر دیا گیا۔ اس عہد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی اخوت اور بھائی چارے میں اضافہ ہوا اور ایک نیا کلچر ابھر کر سامنے آیا اور درگاہوں کے انتظامی معاملات کے لئے مغل درباروں میں رائج اور مستعمل لفظیات اور اصطلاحیں اور لباس استعمال ہونے لگا۔ سالانہ اعراس یا قوالی کی محفلوں پر شامیانے لگانے، رات کے لئے مشعلچی کی خدمات حاصل کرنا، توشہ خانہ، نوبت خانہ، غلام گردش، فراش جیسی اصطلاحات کا استعمال شروع ہوا۔ مغل درباروں کی طرح درگاہوں پر خدمات سرانجام دینے والے خدام نے بھی چوب داروں جیسا لباس زیب تن کرنا شروع کر دیا۔ گویا مغل درباروں کا کلچر درگاہوں میں رائج ہو گیا، شہنشاہ اکبر نے درگاہ خواجہ معین الدین چشتیؒ پر ایک بڑی دیگ میں سینکڑوں من لنگر پکانے کی روایت کا آغاز کیا، یہ دیگ آج بھی درگاہ پر پکائی جا رہی ہے ایسی ہی دو دیگیں درگاہ خواجہ سخی سرورؒ ڈیرہ غازی خاں میں بھی موجود ہیں اگرچہ اب ان میں لنگر پکانے کا کام نہیں ہوتا، جہانگیر کے عہد میں کسی انگریز سیاح نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار کا دورہ کیا اور لکھا کہ مغل بادشاہ نے ایک وقت میں پانچ ہزار لوگوں کے لئے کھچڑی پکانے کے احکامات جاری کئے۔ اسی طرح تاریخ گواہ ہے کہ ایک مرتبہ شاہجہان نے اپنی شکار کردہ نیل گائے اسی دیگ میں پکوائی تھی۔

ہمارے ہاں مزارات پر یہ رسم ورواج کم وبیش ایک ہزار سال سے نبھائے جا رہے ہیں بلکہ وقت کے ساتھ ان کی نوعیت میں اضافہ ہوا ہے۔ پہلے میلاد النبی کی رسم صرف ہر سال 12 ربیع الاوّل کے موقع پر منائی جاتی تھی اب ان مزارات پر ہر قمری مہینے کی بارہ تاریخ کو ''بارہ وفات'' کے نام سے منائی جاتی ہے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے یوم وصال 6- رجب المرجب کی نسبت سے ہر قمری ماہ کی چھ تاریخ کو چھٹی شریف کا ختم کیا جاتا ہے اس کے لئے محفل نعت وقرآنی تلاوت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے اور زائرین کی تواضع لنگر سے کی جاتی ہے عقیدت مند اس میں شرکت کو باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ داتا دربار لاہور میں حضرت علی ہجویریؒ کے یوم وصال 19- صفر المظفر کی

نسبت سے ماہانہ ختم شریف ہر ماہ کی 19 تاریخ کو کیا جاتا ہے اس میں بھی تلاوت کلام مجید اور نعت خوانی کی محفل منعقد کی جاتی ہے۔ درود و سلام کے بعد محفل جب اختتام پذیر ہوتی ہے تو زائرین میں لنگر تقسیم کیا جاتا ہے۔ 9 محرم الحرام کو حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر تقریب غسل مزار شریف ہر سال منعقد ہوتی ہے جہاں صوبے کا وزیر اعلیٰ یا گورنر خصوصی طور پر شرکت کرتا ہے اور مزار شریف کو 50 من سے زائد عرق گلاب سے غسل دیا جاتا ہے۔

اب تو حضرت علی ہجویریؒ کے مزار شریف کے دروازے کو صبح فجر سے پہلے کھولنے اور رات عشاء کے بعد بند کرنے کی رسم بھی ایک تقریب کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے ہشت پہلو مزار شریف کا جنوبی دروازہ فجر سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل کھولا جاتا ہے۔ زائرین غلام گردش میں جمع ہو جاتے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے حضرت علی ہجویریؒ کے ایصال ثواب کے لئے ختم شریف پڑھا جاتا ہے اس کے بعد آپ کا شجرہ طریقت با آواز بلند پڑھا جاتا ہے، اس کے بعد سلام بحضور حضرت علی ہجویری اشعار کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے آخر میں آپ کی عقیدت میں تحریر کئے جانے والے اشعار کو با آواز بلند پڑھا جاتا ہے جن کے اختتام پر دروازہ کھولنے کی رسم ادا کی جاتی ہے اس کے فوراً بعد جھاڑو دے کر قبر مبارک پر تازہ پھول رکھے جاتے ہیں اور پھر دعا ہوتی ہے بالکل اسی طرح رات نماز عشاء کے بعد مزار شریف کی صفائی کر کے تقریباً دو گھنٹے بعد دربار شریف کا دروازہ بند کرنے کی رسم ادا کی جاتی ہے اس سے قبل آپ کے ایصال ثواب کے لئے دعا اور ختم شریف ہوتا ہے، لوگ بلند آواز میں یہ شعر پڑھتے ہیں: ۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

حضرت علی ہجویریؒ کے مزار شریف پر ہر جمعرات کو نماز ظہر اور نماز عصر کے دوران میں سماع خانہ میں سماع کمیٹی کے زیر اہتمام ایک محفل سماع کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں حضرت علی ہجویریؒ سے عقیدت رکھنے والے قوال منقبت پیش کرتے ہیں۔ نماز عصر کے بعد جامع مسجد میں ختم خواجگاں پڑھا جاتا ہے، محفل ذکر کے بعد دعا مانگی جاتی ہے بعد از نماز مغرب محفل نعت کا اہتمام کیا جاتا ہے نماز عشاء کے بعد ایک دوسری محفل نعت کا انعقاد ہوتا ہے جس کا آغاز تلاوت کلام پاک

سے کیا جاتا ہے۔ آخر میں زائرین میں تبرک تقسیم کیا جاتا ہے اور معمول کے مطابق دربار شریف بند کر دیا جاتا ہے۔

ہر قمری ماہ کی پہلی جمعرات کو نماز عشاء کے بعد درگاہ حضرت علی ہجویریؒ پر محفل نعت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے یہ محفل نعت کی رسم چار سال قبل شروع ہوئی تھی، بلکہ اس کے ساتھ ایک نعتیہ مشاعرہ کا بھی بعض اوقات اہتمام کیا جاتا ہے۔

9 محرم الحرام کو منعقد ہونے والی تقریب غسل مزار شریف حضرت علی ہجویریؒ پر سب سے پہلے سورہ یٰسین کی تلاوت کر کے حضرت علی ہجویریؒ کے ایصال ثواب کے لئے ختم شریف پڑھا جاتا ہے اس کے بعد بالترتیب آپ کا شجرہ طریقت اور شجرہ نسب با آواز بلند پڑھا جاتا ہے، دعا مانگ کر غسل کا آغاز کیا جاتا ہے پہلے عام پانی سے مزار شریف کو دھو کر بعد ازاں عرق گلاب سے تعویذ مبارک کو غسل دیا جاتا ہے، خصوصی کپڑوں سے خشک کر کے تمام استعمال شدہ عرق گلاب محفوظ کر لیا جاتا ہے جسے زائرین باعث شفاء سمجھ کر تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں، لحد مبارک خشک کرنے کے بعد چولی مبارک چادریں اور غلاف مبارک دوبارہ چڑھا کر تازہ پھول رکھ دیئے جاتے ہیں اور آخر میں حسب معمول دعا ہوتی ہے۔

درگاہ حضرت علی ہجویریؒ پر سب سے بڑی سالانہ تقریب عرس کی ہوتی ہے۔ حضرت علی ہجویری نے 19 صفر المظفر کو اس جہان فانی سے پردہ فرمایا۔ پہلے پہل 19 اور 20 صفر المظفر کو دو دن کے لئے عرس کی تقریبات ہوتی تھیں مگر اب یہ تقریبات باقاعدہ طور پر 18 صفر المظفر کو ہی شروع ہو جاتی ہیں اور پھر تین دن تک جاری رہتی ہیں۔ عرس کی ان تقریبات میں لاکھوں کی تعداد میں زائرین حاضری کے لئے دنیا بھر سے آتے ہیں اور دعا اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

عرس کے پہلے دن رسم چادر پوشی سے تقریبات کا آغاز ہوتا ہے اس کے لئے عموماً اعلیٰ ترین صوبائی شخصیت کو مدعو کیا جاتا ہے اس رسم میں شرکت کو وزیر اعلیٰ و گورنر پنجاب اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ تلاوت کی جاتی ہے، نعت خوانی ہوتی ہے، ختم شریف کے بعد لحد مبارک پر تازہ پھولوں کو رکھ کر اختتامی دعا کی جاتی ہے، اس کے بعد صوبائی شخصیت کو دودھ کی سبیل کے افتتاح کے لئے مدعو کیا جاتا ہے، پہلے روز عشاء کی نماز کے بعد خصوصی محفل نعت کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

دوسرا یوم جو 19 صفر المظفر کا بنتا ہے وہی دراصل حضرت علی ہجویری کے وصال کا دن ہے اس نسبت سے نماز فجر کے بعد آپ کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں بے شمار طلباء اور حفاظ شرکت کرتے ہیں۔عرس کے دوسرے روز صبح آٹھ بجے تبلیغی و روحانی اجتماعات کی محافل کا آغاز ہو جاتا ہے جہاں ملک بھر کے جید علماء کرام اور روحانی اسکالر تصوف کے مختلف موضوعات پر خطاب کرتے ہیں، ان محافل کو پانچ اجلاس میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جس میں ''ختم الانبیاء''، ''ختم غوثیہ'' اور ''ختم خواجگان'' شامل ہیں۔ رات ڈھائی بجے خصوصی اجتماعی دعا ہوتی ہے محفل کے اختتام پر لنگر تقسیم کیا جاتا ہے سماع کی رسم افتتاح دوسرے روز صبح دس بجے سماع ہال میں ادا کی جاتی ہے اس کا آغاز حضرت امیر خسروؒ کے کلام سے کیا جاتا ہے پھر حضرت علی ہجویریؒ کی منقبت پیش کی جاتی ہے اس کے بعد رات دو بجے تک ملک بھر سے قوال اپنے جوہر دکھاتے ہیں، ریڈیو پاکستان یہ محفل سماع رات گیارہ بجے سے ایک بجے تک براہ راست نشر کرتا ہے۔

عرس کے تیسرے روز بھی روحانی و تبلیغی محافل کا انعقاد جاری رہتا ہے اسی طرح پانچ حصوں پر مشتمل یہ اجلاس رات ڈھائی تین بجے اختتام پذیر ہوتے ہیں۔محفل سماع کی تقریب بھی عرس کے تیسرے روز صبح آٹھ بجے سے رات تین بجے تک جاری رہتی ہے۔ان دو دنوں میں کم و بیش تین سو قوال اپنی قوالی پیش کرتے ہیں صبح نماز فجر سے پہلے خصوصی اختتامی قوالی میں حضرت امیر خسروؒ کا کلام ''رنگ'' کے نام سے پڑھا جاتا ہے۔

ارے او ماٹی کے دیوڑو سنیو ہمری بات
مورے خواجہ گھر رنگ ہے تم جگیو ساری رات

اس کے بعد شب برات، (15 شعبان المعظم) اور معراج النبی (27 رجب المرجب) اور 12- ربیع الاوّل کو خصوصی محافل کا انعقاد حضرت علی ہجویری کی درگاہ پر کیا جاتا ہے جہاں ہزاروں لوگ ایک وقت میں جمع ہو کر ان روحانی محفلوں کو رونق بخشتے ہیں۔درود و سلام اور اختتامی دعا ہوتی ہے اور زائرین میں لنگر تقسیم کیا جاتا ہے۔

آج اکیسویں صدی میں یہ درگاہیں سیاسی و سماجی، مذہبی و روحانی محافل اور تقاریب کے

انعقاد کے اہم مراکز کی شکل میں اپنی اہمیت منوا چکی ہیں، تمام تقاریب اور رسومات کو ایک انتظامی حسن اور ذمہ داری کے ساتھ بروقت ادائیگی کو یقینی بنانے کے لئے سارا سال کوششیں جاری رہتی ہیں بلکہ اب تو بڑے درباروں کے علاوہ محلّوں و چھوٹے شہروں کے عام درباروں پر بھی ایسی تقریبات اور رسومات کا آغاز ہو چکا ہے، ہر درگاہ کے ساتھ ایک بڑی جامع مسجد کی تعمیر لازم ہوتی جارہی ہے، جہاں جمعہ کے روز زائرین خصوصی طور پر نماز پڑھنے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں اور اجتماعی دعا میں شمولیت کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے ہیں۔

ظہیر الدّین محمد بابر

شخص، شخصیّت اور شاعری

مصنف: پروفیسر قمر رئیس

معاون: ڈاکٹر محیّہ عبدالرّحمانووا

☆ بااجازت پروفیسر قمر رئیس

نام کتاب ظہیرالدین محمد بابر (شخص، شخصیت اور شاعری)
مُصنف پروفیسر قمر رئیس
سنِ اشاعت اوّل 2002ء
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (انڈیا)

فہرست

حصہ اول

1-	پیش گفتار	73
2-	ابتدائی تشکیلی عناصر	77
3-	پہلی شادی، پہلا عشق	82
4-	آزمائشوں میں شخصیت کا نکھار	84
5-	دین اور درویشوں سے عقیدت	86
6-	رومانوی تشخص کی سمت	90
7-	عیش وطرب کی ترغیبات	95
8-	زمینی اور انسانی حسن کا شیدا	102
9-	بابر اور گرونانک	109
10-	بابر اور اجودھیا کی مسجد	110
11-	ہندوستان کی زبانوں سے رشتہ	112
12-	بابر کا اردو شعر	113
13-	بابر کی شاعری	114
14-	حوالہ جات	131
15-	کتابیات	133

حصہ اول

پیش گفتار

ظہیرالدین محمد بابر کی دلآویز شخصیت اور شاعری سے میری دلچسپی کا آغاز کم وبیش بیس سال قبل اُس وقت ہوا جب میں نے علی شیر نوائی جیسے باکمال کلاسیکی ازبیک شاعر اور ہم عصر شعرا کے کلام کا مطالعہ شروع کیا۔ ساتھ ہی ان کی جو تخلیقات پسند آئیں ان کا ترجمہ بھی کرنے لگا۔ تاشقند میں اپنے دس بارہ سال کے قیام کے دوران میں نے کچھ راست اور کچھ شعروادب کے واسطہ سے، ازبیکستان کی تہذیب وثقافت کے ورثہ سے شناسائی حاصل کی۔ مجھے محسوس ہوا کہ البیرونی امام بخاری اور حکیم بوعلی ابن سینا کی طرح بابر بھی اُس سرزمین اور اس کی تہذیب کا ایسا فرزند ہے جس کے کارناموں کو نہ صرف وسطی ایشیا اور ہندوستان بلکہ ساری دنیا نے سراہا اور اُن سے فیض اٹھایا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ صدیوں سے ازبیکستان کے عوام بابر کو ایک حکمراں اور فاتح سے کہیں زیادہ ایک غنائی شاعر، نامور ادیب اور دانشور کی حیثیت سے جانتے اور پسند کرتے آئے ہیں۔ سوویت دور میں بھی جب مطلق الحکم بادشاہوں سے رشتہ جوڑنے پر پابندیاں عائد تھیں لوگوں کے گھروں اور ایوانوں میں جواں عمر بابر کی ایک ایسی تصویر آویزاں نظر آئی جس میں وہ ہاتھ میں کتاب لئے استغراق سے شعرخوانی کرتا نظر آرہا تھا۔

بابر کی شخصیت کا یہی وہ پہلو تھا جس نے آہستہ آہستہ مجھے اپنا گرویدہ بنایا اور جب میں نے اس کی خودنوشت ''تزک بابری'' اور اس کی شاعری کا مطالعہ کیا تو اس کی یہی دلآویز اور رومان انگیز شخصیت سامنے آئی۔ ایک حکمراں کی حیثیت سے اپنی مملکت یا مفتوحہ علاقوں میں انتظام اور عدل و انصاف کے مؤثر ادارے قائم کرنے میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور یہ تھا بھی مشکل۔ لیکن ایک

شاعر، ادیب، عاشق، فطرت کا پرستار، موسیقی کا دیوانہ اور رومانوی فکر و احساس رکھنے والے انسان کے روپ میں، بابر کی پہلو دار، پرکشش شخصیت دل کو چھوتی رہی۔ ایسی خلاّق شخصیتیں کسی خاص دور کی میزان اقدار اور ضابطوں سے بندھی نہیں ہوتیں اور اکثر ان سے اوپر اٹھنے کی بنا پر ہی وہ انسان کے ثقافتی ورثہ میں کچھ اضافہ کرنے یا اسے موڑ دینے کا موجب ہوتی ہیں۔

میں یہاں ہندوستان کو جغرافیائی اور سیاسی وحدت دینے اور اسے مشرق اور مغرب کے ملکوں کے مقابل اقتصادی ترقی کے بام عروج تک پہنچانے میں بابری (مغلیہ) حکومت کے سربراہوں کے کارناموں کا ذکر نہیں کروں گا کہ یہ کام مورخوں کا ہے۔ اسی طرح اس کی شجاعت، تیغ زنی، بساطِ جنگ کی مہارت اور کشورستانی، تاریخ دانوں کے لئے خواہ کتنی ہی پرکشش ہو، اس مطالعہ کے دائرہ میں نہیں آتی۔ اگرچہ اس کے کردار کا یہ رُخ بھی اس کے رومانوی مزاج کا ایک حصہ تھا اور کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ اس کی فوج کشی کی مہمات لہو کو گرم رکھنے کا ایک بہانہ تھیں۔ اس لئے کہ چنگیز اور تیمور کا جو لہو اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا بابر مرزا کو اس سے بھی تو انصاف کرنا تھا خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کم رہی ہو۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اپنی شخصیت کی بنیادی افتاد کے لحاظ سے عالمگیر شہرت کے اِن فاتحین، سے جو اس کے اجداد تھے، وہ خاصہ مختلف تھا۔ یہ سچائی تمام معتبر بابر شناسوں نے مانی ہے کہ مال و دولت اور زر و جواہر کے انبار جمع کرنے کی حرص اس میں نہیں تھی۔ قلندر کے خطاب سے اسے اسی لئے یاد کیا گیا کہ زر و مال کے جو بھی خزانے اس کے ہاتھ لگے، وہ اُس نے عوام و خواص میں لُٹا دیئے۔ یہاں تک کہ کوہ نور جیسا ہیرا بھی ایک پل سوچے بغیر بیٹے کو بخش دیا۔

ہمارے ملک میں گزشتہ دہائی میں کچھ 'جنونی' لوگوں نے بابر مرزا کے نام کے ساتھ جو اضافی صفات جوڑی ہیں وہ کسی بھی طرح جائز اور مناسب نہیں۔ یہ عاقبت نااندیش اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ رویہ ہمارے قومی مفادات کے خلاف ہے۔ ہمسایہ ملکوں مثلاً افغانستان، ازبیکستان اور نیپال وغیرہ سے قریبی دوستانہ مراسم رکھنا ہماری خارجہ پالیسی کا ایک ستون رہا ہے۔ بابر آج بھی ازبیکستان اور افغانستان کے عوام کے دلوں میں ہیرو کا درجہ رکھتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو ان کے اس جذبہ کا احترام لازم ہے جس کے بغیر ہم ان کا دل نہیں جیت سکتے۔ دوستی کے رشتہ کو عوام تک نہیں لے جا سکتے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک موقع پر کہا ہے کہ بابر کی لڑائی اس میں نہیں کہ اس نے

ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اس میں ہے کہ اس نے ہندوستانی عوام کے دلوں کو فتح کیا۔ یہاں ایک اور واقعہ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ حکومت ہند نے پانچ سال قبل لاکھوں روپے کے صرفہ سے رامائن اور مہابھارت جیسے ٹی۔ وی سیریل، ازبکستان کے قومی ٹی۔ وی چینل کو نمائش کے لئے تحفتاً دیئے۔ میں عینی شاہد ہوں کہ یہ سیریل عوام میں اس درجہ مقبول ہوئے کہ چینل کو دو بار دکھانا پڑے۔ آج رام، سیتا اور لچھمن اور مہابھارت کے ان گنت کردار ازبیک عوام کے دلوں میں گہرے نقش بنا چکے ہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ دوستی دوطرفہ عمل ہے۔ یہاں ایک اور واقعہ کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔

مئی 1999ء میں جب سابق وزیر خارجہ شری جسونت سنگھ تاشقند، انڈین کلچرل سنٹر میں تشریف لائے تو انہوں نے گفتگو کے دوران یہ خواہش ظاہر کی کہ ورود اسلام سے پہلے ہندوستان اور وسطی ایشیا کے اس خطہ (ازبکستان) کے درمیان جو تعلقات تھے اس پر ایک مذاکرہ کیا جائے۔ میں نے ہندوستانی سفارت خانہ کے تعاون سے پہلی سے تیسری مارچ 2000ء تک ایک بین الاقوامی سہ روزہ سیمینار، مذکورہ موضوع پر کیا۔ اس میں ہندوستان کے علاوہ پانچ چھ ملکوں کے ممتاز ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں نے حصہ لیا۔ پچیس مقالے پڑھے گئے۔ بعض عالموں نے بحث میں حصہ لیا۔ یہ مقالے حال ہی میں تاشقند سے کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔

اس مذاکرہ میں حتمی تحقیقی شواہد کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی کہ پہلی صدی عیسوی کے درمیان سے چوتھی صدی عیسوی کے آغاز تک یعنی کشان بادشاہوں کے دور میں، اس پورے علاقہ پر ہندوستان کا سیاسی اور تہذیبی تسلط رہا۔ گزشتہ پچھتر برسوں میں ازبکستان کے جنوبی اور وسطی علاقہ میں کھدائیوں کے دوران جو آثار اور جو اشیاء برآمد ہوئیں ان سے ثابت ہے کہ اس علاقہ میں تقریباً پانچ سو سال تک بدھ مت کی حکمرانی رہی۔ صرف یہی نہیں ہندوستان کی زبانیں اور رسم الخط بھی یہاں رائج رہے۔ بعد میں بھی ازبکستان کی تہذیبی زندگی پر اس کے وسیع اثرات پڑے۔ جس طرح پندرہویں صدی کے بعد ازبکستان کی تہذیب و تمدن نے، مغلیہ عہد سلطنت میں، ہندوستان کی زندگی اور ثقافت کو کئی سطحوں پر متاثر کیا اور نتیجہ میں مشترکہ کلچر اور مشترکہ قومیت کا تصور پروان چڑھا۔

ڈیڑھ ہزار سال قبل کشان حکمرانوں کے ہاتھوں، وسطی ایشیا اور ہندوستان کے درمیان جو تہذیبی رابطے قائم ہوئے تھے اور شاہراہ ریشم نے جنہیں مضبوط بنایا، بابر مرزا کے ہاتھوں ان کی

تجدید عمل میں آئی۔ صرف یہی نہیں بابر کے وسیع النظر ورثاء نے ان رشتوں کی ترویج اور تعمیر میں حصہ لیا۔ تاہم میرا موضوع یہ رشتے نہیں اور نہ ہی اس مطالعہ کی نوعیت تاریخی یا تحقیقی ہے۔ میری کوشش صرف یہ رہی ہے کہ بابر کی تخلیقی شخصیت کے ان تہذیبی پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے، جن کا علم عام نہیں ہے یا جن کو کسی سبب سے نظر انداز کیا گیا ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ بابر کی شخصیت کو میں نے کسی اخلاقی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے خود اپنے کردار کو، انسانوں سے اپنے رشتوں اور امورِ دنیا سے اپنے معاملوں کے حوالے سے، اپنی خودنوشت میں، جتنا بے نقاب کیا ہے، میں نے اسی حد کے اندر، اس کی شخصیت کا ایک جاندار مرقع بنانے کی دیانت دارانہ کوشش کی ہے اور بس۔

اس کا فیصلہ قارئین کریں گے کہ اس مقصد میں مجھے کتنی کامیابی مل سکی ہے۔

میں اپنے مشفق دوست ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے بابر کے تراجم کا تنقیدی زاویے سے جائزہ لیا اور مفید مشورے دیئے۔

سرورق کی زینت، بابر مرزا کی تصویر کے لئے میں ازبکستان کے نامور مصور جناب عمر بیکوو اور ازبکستان کی آرٹس اکیڈمی کے صدر پروفیسر ترسون علی کزیف کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

آخر میں مجھے برادرم مجتبیٰ خان صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے یہ کتاب خاص اہتمام سے اور اتنے کم وقت میں شائع کرنے کی ذمہ داری لی۔

☆☆☆☆☆

وسطی ایشیا اور ہندوستان کے فرمانرواؤں میں چند شخصیتیں غیر معمولی کشش، شہرت اور دلچسپی کا باعث رہی ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے اوراق سے نکل کر دلوں پر حکومت کی ہے اور اس مقبولیت میں ان کی ملک گیری، سیاسی تدبر اور حاکمانہ اولوالعزمی سے زیادہ ان کی دوسری بشری، تہذیبی اور اخلاقی صفات کا حصہ رہا ہے۔ ظہیر الدین بابر بھی ان نادر روزگار شخصیتوں میں سے ایک ہے۔

ایشیا ہی نہیں مغرب کے ممتاز مورخوں اور اہل دانش نے بھی بابر مرزا کی البیلی شخصیت کے گن گائے ہیں۔ ایک مہم پسند سپاہی، ماہر فنِ سپہ گری، اور فاتح کے علاوہ اس کی انوکھی شخصیت کے ایسے پہلو بھی تھے جن کی اسے کھل کر داد ملی ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے عہد کا، چغتائی ازبکی زبان کا سب سے کامیاب اور منفرد نثر نگار تھا۔ وہ اپنے عہد کے شہرہ ادب اور فنون لطیفہ پر گہری ناقدانہ نظر رکھتا تھا۔ وہ وسطی ایشیا کے ان حکمرانوں میں، جو سخنور ہوئے، سب سے ممتاز تھا۔ اس نے فن عروض، فن موسیقی، اور فن حرب پر مستقل کتابیں لکھیں، ایک نیا خط ''خط بابری'' ایجاد کیا۔ اس کے علاوہ بھی وہ ان گنت ایسی انسانی، ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کا مالک تھا جو عہد وسطیٰ کے حکمرانوں میں کہیں بھی اتنی نمایاں اور روشن نظر نہیں آتیں۔ آیئے اُس گہوارہ اور ان عوامل پر ایک نظر ڈالیں جنہوں نے بابر مرزا کی شخصیت کی نشو ونما کی اور اسے اچھوتے اور پرکشش رنگوں سے سجایا۔

ابتدائی تشکیلی عناصر

وادیٔ فرغانہ کے حکمراں عمر شیخ مرزا کی ناگہانی موت کے بعد 1494ء میں صرف گیارہ سال کی عمر میں بابر مرزا ان کا وارث اور جانشین قرار پایا۔ وہ اس خوبصورت وادی کا تاجدار ہوا تو اس تخت و تاج کے دوسرے دعویدار بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد بابر مرزا کی زندگی کا بڑا حصہ اپنی حفاظت، دشمنوں کے حملوں سے مدافعت، مہم جوئی اور عسکری معرکوں میں بسر ہوا۔ اس کی داستان حیات کا یہ پہلو بھی نہ صرف دلچسپ بلکہ عجیب، حیرت زدہ اور کسی حد تک ڈرامائی

واقعات سے معمور ہے۔ لیکن ہم اس پر زور نہ دے کر بابر مرزا کی رومان پرور شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔ ایسے پہلو جو بہ حیثیت انسان اس کی زندگی اور تخلیقی سرگرمیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

بابر مرزا 14- فروری 1483ء کو وادی فرغانہ کے شہر اندیجان میں پیدا ہوا۔ وہ چھٹی پشت میں امیر تیمور کی وراثت کا حصہ دار تھا، اور اس پر وہ ہمیشہ نازاں رہا۔ امیر تیمور کی ہوسِ ملک و مال سے قطع نظر وہ علم و ادب، فنون لطیفہ کا سرپرست اور باغات و تعمیرات[1] کا دلدادہ تھا۔ اس لئے بچپن سے ہی بابر مرزا تیمور کے اس گرانقدر تہذیبی ورثہ میں اپنے آپ کو شامل سمجھتا تھا۔ دوسری جانب ماں کی طرف سے بابر کا تعلق چنگیز خاں کی منگول نسل سے تھا۔ تزک بابری میں بابر نے لکھا ہے:

''میرے باپ کی پہلی بیوی کا نام قتلق نگار (خانم) تھا۔ یہ بادشاہ یونس خاں کی بیٹی تھی۔ جو چنگیز کے دوسرے بیٹے چغتائی خاں کی نسل میں سے تھا۔''

پھر لکھا ہے۔(1)

''وہ اکثر مصائب و آفات اور جنگوں میں میرے ساتھ رہی۔''

مورخین نے لکھا ہے کہ بابر مرزا کی والدہ کا اس کی شخصیت کی ابتدائی تربیت اور تعلیم میں نمایاں حصہ رہا ہے۔ وہ ترکی اور عربی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان اور شعر و ادب سے بخوبی آشنا تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ عوامی اور کوہستانی نغمے بڑی مہارت سے گاتی تھیں۔ فن موسیقی سے بابر کی غیر معمولی رغبت میں شاید ان کا حصہ بھی رہا ہو۔

مئی 1995ء میں جب مجھے دوسری بار اندیجان کی سیر کا موقع ملا تو وہاں بابر فاؤنڈیشن کے صدر جناب ذاکر جان مشرب کا مہمان ہوا۔ زمین پر اترنے سے پہلے جب ہوائی جہاز نے اس شہر کا چکر لگایا تو میں نے دیکھا کہ شہر کی شاہراہیں، عمارتیں، دریا سب سرسبز و شاداب درختوں کے ہجوم میں گم ہو گئے ہیں۔ اس وادی میں یہ موسم بہار کے شباب کا زمانہ تھا۔ سڑکوں پر دونوں جانب اگے

---

1. پیدائش کی جگہ اور تاریخ متنازعہ فیہ رہی ہے۔ 2000ء میں جب میں وادی فرغانہ کے ایک شہر نمنگان گیا تو وہاں شہر کے ایک ذمہ دار اور ان کے رفقا نے ایک شکستہ دیہی بستی دکھا کر مجھے بتایا کہ یہ بابر مرزا کا مولد ہے۔ لیکن عام اتفاق یہی ہے کہ اندیجان بابر کا مولد تھا۔

ہوئے چناروں اور دوسرے پیڑوں کے باہمی مل جانے سے محراب نما سرنگیں سی بن گئی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ تزک میں بابر نے اپنے اس مادر وطن کی خوبصورتی اور ہریالی کی کتنی تعریف کی ہے۔ ناشتہ کے بعد ذاکر جان مشرب صاحب نے مجھے پہلے نوتعمیر باغ بابر کی سیر کرائی اور پھر بابر میوزیم کی کشادہ عمارت میں لے گئے۔ اس کے قریب ہی ایک چوراہے پر بابر مرزا کا دیوقد مجسمہ نصب تھا اور ایک مجسمہ میوزیم کے صحن میں تھا۔ بابر میوزیم قدیم شہر کے ارچی محلّہ میں واقع ہے۔ ذاکر جان نے بتایا کہ بابر مرزا کی ابتدائی پرورش اسی محلّہ میں ہوئی اور جس مقام پر بابر میوزیم کی تعمیر ہوئی ہے یہ وہ قدیم مدرسہ تھا جہاں بابر کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اس کے اردگرد کے تنگ کوچوں میں آج بھی آہنگروں، صناعوں اور چوبی کام کرنے والوں کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں۔

بابر کا ایک مغربی سوانح نگار ہیرالڈ لیمب بابر کی ابتدائی تعلیم کے حوالے سے لکھتا ہے۔

''اندیجان کے میوہ باغ میں بابر استاد کے آگے دوزانو بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ جاڑوں میں ایوان کے اندر جسے بڑی انگیٹھیاں گرم کرتی تھیں، پڑھائی ہوتی ہے۔ بے شبہ اس نے پڑھائی پر بہت محنت کی ہوگی کہ گیارہ سال کی عمر تک اتنا کچھ پڑھ لیا۔ کیونکہ اس کے بعد تو اسے تعلیم پانے کی فرصت ہی کہاں ملی۔ استاد اسے اور اس کے چھوٹے محلاتی بھائیوں کو حساب کے مسائل، ستاروں کے نقشے، اسلامی تعلیمات ذہن نشیں کراتا اور خاندان کی کئی پشت کی تاریخ تیمور و چغتائی تک پڑھاتا تھا۔ بابر کی فطرت میں تجسّس بھرا تھا۔ بہت جلد اس نے حافظے میں معلومات کا ایک خزانہ جمع کرلیا۔ اس کی تیز نگاہ سے یہ بات بھی مخفی نہیں رہی کہ اخوند جو پڑھانے میں تشدد کرتا تھا کردار میں اتنا کمزور تھا کہ قبول صورت لونڈوں کو ساتھ سلانے پر پھسلاتا تھا۔ ایک اور استاد کی نسبت (بابر) لکھتا ہے کہ وہ بھی شہوت پرست، فریبی اور ریاکار آدمی تھا۔''

بچپن ہی کے بارے میں ہیرالڈ لیمب آگے لکھتا ہے:

''نوعمر بابر کے اردگرد تین زبانیں بولی جاتی تھیں۔ لہٰذا اسے دیہات کی پرانی ترکی، کوچہ و بازار کی فارسی بولی اور اہل علم کی فارسی اور عربی پر قدرت

حاصل کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوئی، وہ ضلع جگت سن کر بہت خوش ہوتا تھا۔ اپنے آس پاس کے لوگوں کے حال سے کمال دلچسپی تھی۔ اب اپنی وادی کے باشندوں کو وہ بزرگان دین، خواجگان کے اقوال اور شعراء کے عمدہ اشعار سنانے لگا..... اس کا مزاج حقیقت پسند تھا جو چیز عجیب اور پراسرار معلوم ہوتی اس کی ٹوہ لگاتا تھا۔" (2)

جواں عمری کے بعد بابر کو اپنے آبائی وطن میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس شاداب وادی کی یادیں ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں۔ اندیجان میں بہنے والی ایک ندی کا ذکر بابر نے تزک میں بار بار کیا ہے۔ میں نے اس کو دیکھا۔ افسوس کہ اب وہ خشک ہو کر دو ڈھائی فٹ کا ایک تنگ سا نالہ بن گئی ہے۔ اندیجان سے 20-25 میل کے فاصلہ پر اوش کا خوبصورت اور پرفضا شہر ہے۔ جو اندیجان کے مقابلہ میں زیادہ اونچائی پر واقع ہے۔ گرمی کا موسم بابر اکثر وہیں گزارتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ قدرت نے فرغانہ کی کوہستانی وادی کو جو بے پایاں حسن عطا کیا ہے بابر اس کا دیوانہ تھا۔ فطرت کے اسی رنگین اور شاداب گہوارہ میں اس کے شاعرانہ تخیل کی تربیت ہوئی۔ اس کے باغوں، چناروں اور شیریں پھلوں کی تعریف کرتے وہ کبھی نہیں تھکتا۔ بعد میں بھی تزک لکھتے ہوئے وہ اپنی گمشدہ بہشت کا ذکر بڑی محبت سے کرتا ہے۔ اسی کے الفاظ میں۔

"فرغانہ کا یہ ملک جس کی بادشاہت سے میں سرفراز ہوا۔ گو کوئی بڑا ملک نہیں ہے مگر اس میں غلّوں اور میووں کی پیداوار خوب ہے۔ دریائے سیحوں اس ملک میں شمال و مشرق کی سمت سے داخل ہوتا اور ملک کے وسط میں سے گزرتا، مغرب کو بہنے لگتا ہے۔ کسی قدر آگے جا کر شمال کی طرف مڑتا، ترکستان کا رخ اختیار کرتا ہے۔ اندیجان اس ملک کا پایہ تخت ہے۔ جو حد درجہ سرسبز و شاداب ہے۔ یہاں کا انگور اور خربوزہ (سردہ) بہت اچھا اور عمدہ ہوتا ہے۔ اندیجان کی ناشپاتی تو اپنی مثال آپ ہے۔

اندیجان کا قلعہ بہت مضبوط اور سمرقند اور کیش کے قلعوں کی ہمسری کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے تین دروازے ہیں اور نو نہریں مختلف حصوں میں بہتی ہیں۔ اندیجان کے لوگ بہت خوبصورت ہیں۔ جنہیں آشوب چشم

کی بیماری عموماً تنگ کرتی رہتی ہے۔

اندیجان کے بعد فرغانہ کا دوسرا بڑا شہر اوش ہے جو اندیجان کے جنوب مشرقی گوشہ میں کسی قدر مشرق کی سمت واقع ہے۔ اندیجان اور اوش میں چار فرسنگ کا فاصلہ ہے۔ اوش کی آب و ہوا بہت اچھی ہے اور بہار کا موسم تو حد درجہ دلچسپ ہوتا ہے۔ قلعہ کے جنوب مشرق میں ایک خوبصورت سرسبز و شاداب پہاڑ ہے۔ سلطان محمود خاں نے وہاں ایک محل تعمیر کیا تھا۔ میں نے بھی 902ھ میں اس سے ذرا نیچے کی سمت ایک بارہ دری تعمیر کی ہے۔ اندیجان کی ایک ندی اوش کو بھی سیراب کرتی ہے۔ اس ندی کے دونوں کناروں پر باغات ہی باغات پھیلے ہیں۔ بنفشہ یہاں کی بڑی پیداوار ہے۔ پورے علاقہ میں نہروں کا جال بچھا ہے۔

فرغانہ کا تیسرا شہر مرغینان ہے۔ جو اندیجان سے سات فرسنگ دور جانب مغرب واقع ہے۔ یہاں کے پھلوں میں خوبانی اور انار عمدگی میں اپنی مثال آپ ہے۔ زرد آلو بھی بے حد لذیذ ہوتا ہے۔ شیخ برہان الدین بھی مشہور فقیہ اور ہدایہ کے مصنف یہیں کے رہنے والے تھے۔

فرغانہ کا چوتھا بڑا مقام اسفرہ ہے۔ یہ مرغینان سے جنوب مغرب میں نو فرسنگ پر واقع ہے۔ ہر سمت نہریں رواں دواں ہیں۔ جن کے سبب پورے علاقہ نے ایک وسیع باغ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں بادام خوب پیدا ہوتا ہے۔

فرغانہ کا پانچواں بڑا شہر خوجند ہے۔ جو اندیجان سے پچیس فرسنگ کے فاصلہ پر واقع ہے..... خوجند کے جنگل میں تند و تیز ہوا اکثر و بیشتر چلتی رہتی ہے۔ جو خاص پریشان کن ہوتی ہے۔ شمالی سمت کا دوسرا بڑا قصبہ کاشان ہے۔ دریائے آخشی اس کے ساتھ ساتھ بہتا آگے کو دوڑتا ہے۔ شہر کی آب و ہوا بہت اچھی ہے۔ باغات بھی نفیس ہیں..... یہاں کے پہاڑ میں فیروزے کی کانیں بھی ہیں اور لوہے کی بھی۔

پورے ملک کی آمدنی بس اس قدر ہے کہ اس سے تین چار سو سپاہیوں کو
ملازم رکھا جا سکتا ہے اور ان کی گزر بسر کا بندوبست ہو سکتا ہے۔" (3)

یہ ہے بابر مرزا کے مادر وطن فرغانہ کی ایک جھلک۔

بابر نوعمری میں بھی نہایت اولوالعزم، بہادر اور حوصلہ مند انسان تھا۔ سمرقند اس کے جد اعلیٰ امیر تیمور کی مملکت کا پایہ تخت تھا۔ اس پر تسلط وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کے عزائم کی بلندی کا حال یہ تھا کہ ایک طرف وہ اپنی چھوٹی سی مملکت کو اپنے سگے بھائی جہانگیر مرزا اور دوسرے حریفوں کے حملوں سے بچانے کے جتن کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ سمرقند کو فتح کر کے اس کی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ 1500ء میں دشت قپچاک سے آئے ایک حوصلہ مند ازبک سردار شیبانی خاں نے سمرقند پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن بابر مرزا نے اپنے وفادار ساتھیوں اور خود سمرقند کے لوگوں کی مدد سے سمرقند پر حاکمانہ قبضہ کر لیا اور شیبانی خاں کو فرار ہونا پڑا۔ لیکن یہ فتح عارضی تھی۔ جلد ہی شیبانی خاں نے دوبارہ سمرقند پر تسلط جما لیا اور بابر کو فرار ہو کر مدتوں دشت و صحرا کی آوارہ گردی کرنا پڑی۔ اس لئے کہ اسی دوران میں اندیجان پر ایک طاقتور سردار تمبل نے قبضہ کر لیا تھا۔ بابر بے یار و مددگار، جنگلوں میں بھٹکتا رہا۔ آخر کار نو دس سال کی آوارہ گردی کے بعد اس نے ہرات کا قصد کیا تا کہ وہاں کے حکمراں سلطان حسین بائیقراء کی کمک حاصل کر سکے۔ لیکن اسی دوران حالات کی تبدیلی سے بجائے ہرات کے اس نے کابل کا رخ کیا۔ جہاں کا حکمراں الغ خاں، جو بابر کا چچا تھا، اسی زمانہ میں فوت ہو گیا تھا۔

پہلی شادی، پہلا عشق

بابر کی منگنی چچازاد بہن عائشہ سلطانہ سے جب وہ پانچ سال کی تھی، ہو گئی تھی۔ جب وہ جوان ہوا تو قتلق نگار خانم اپنی بہو کو سمرقند سے اندیجان رخصت کرا لائیں۔ نکاح کے بعد ساری رسمیں ادا ہوئیں۔

از بیک رواج کے مطابق دلہن گھر میں آ کر گھر کے چھوٹے چھوٹے بچوں سے لے کر بڑوں تک سب کو فرداً فرداً سلام کرتی ہے۔ یقیناً یہ سب رسمیں ادا ہوئی ہوں گی۔ عائشہ سے بابر کی پہلی اولاد ایک بیٹی فخر النسا بھی پیدا ہوئی جو چالیس دن بعد فوت ہو گئی۔ ایسا لگتا ہے کہ عائشہ بابر

مرزا کا دل جیتنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اور وہ اس سے بیزار رہنے لگا۔ اسی زمانہ میں شاید عائشہ سے دوری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بابر بابری نام کے ایک خوبرو لڑکے کے عشق میں دیوانہ ہوگیا۔ تزک بابری میں لکھتا ہے:

''اس دوران مجھے اردو بازار کے ایک خوبصورت لڑکے بابری نامی سے عشق ہوا۔ لیکن یہ عشق کچھ عجیب طرح کا تھا۔ جونہی بابری میرے سامنے آتا، میں شرم کے مارے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکتا۔ ایک دن اچانک میں اپنے خدام کے ساتھ ایک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ بابری اور مجھ میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ لیکن میری عجیب حالت تھی۔ میں بری طرح جھینپا اور سخت گھبراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔''(4)

بابر نے اعتراف کیا ہے کہ عشق کا یہ تیر بہت کاری لگا تھا۔ اس وحشی جذبہ نے پوری طرح اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ بابر نے لکھا ہے کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر گھر سے نکل جاتا تھا۔ کبھی تن تنہا باغوں میں گھومتا پھرتا اور کبھی وادی کے کوہستانی علاقہ میں نکل جاتا۔ یہ یاد رہے کہ بابر مرزا ایک عام شہری یا شہزادہ نہیں تھا بلکہ اب ایک مملکت کا حکمراں تھا۔

اس پہلے عشق کی شدّت، دیوانگی اور وحشت کے تجربہ کو بابر نے تزک میں جس سچائی اور بے باکی سے بیان کیا ہے بلکہ اعتراف کیا ہے وہ اس کی شخصیت کے شفاف، بے ریا اور بے لاگ ہونے کی دلیل ہے۔ شاید اس کے دل و دماغ پر اسی عشق کا تسلط تھا کہ وہ اپنی بیوی عائشہ سے دور دور رہنے لگا۔ لکھتا ہے کہ جب پندرہ بیس دن گزر جاتے تو میری ماں دھکّے دے کر مجھے بیوی کے پاس بھیجتی تھی۔

شاید یہ جذباتی ہیجان اور جنسی گھٹن کا نتیجہ تھا کہ اسی زمانہ میں بابر نے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ لکھتا ہے:

''میں نے اس پڑاؤ میں سات اشعار پر مشتمل ایک غزل کہہ ڈالی۔ یہاں سے کوچ ہوا تو دریائے خوجند کے کنارے پر اترے اور پورا دن سیر میں گزارا اور سرداروں اور سپاہیوں نے خوب تفریح کی۔''(5)

بابر مرزا کی شاعری میں جہاں نسوانی حسن کے پیکر ملتے ہیں وہاں کمسن امردوں کی دلکشی اور

خوبیوں کا بیان بھی کم نہیں ہے۔

آزمائشوں میں شخصیت کا نکھار

1494ء میں فرغانہ میں تاجپوشی سے لے کر 1504ء یعنی دیار کابل میں قبضہ جمانے تک، دس سال کا یہ زمانہ بابر مرزا کی زندگی میں قسمت آزمائی، تیغ آزمائی اور مردم آزمائی کا زمانہ ہی کہا جائے گا۔ فرغانہ کی چھوٹی سی مملکت جو اسے ترکہ میں ملی تھی اس کے حوصلوں اور ضرورتوں کے لئے ناکافی تھی۔ کم سنی کے باوجود وہ اپنے جد اعلیٰ امیر تیمور کی طرح شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور معاندانہ حالات کو مسلسل اپنے حق میں سازگار بنانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ لیکن تجربہ کی کمی، معتمد رفیقوں کی غداری، سرداروں کی سازشوں اور عزیزوں، جن میں سوتیلا بھائی جہانگیر بھی شامل تھا کی ساز باز کی وجہ سے وہ اپنے منصوبوں میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ تزک میں اس نے لکھا ہے کہ کبھی کبھی وہ حالات سے مایوس ہو کر ملک چین کی طرف فرار ہونے کی بات سوچتا تھا۔ لیکن یہ طے ہے کہ آزمائشوں کے اس دس سالہ عہد نے بابر مرزا کو بے حد قیمتی تجربات سے مالا مال کیا۔ تاہم سیاست اور رموز مملکت میں وہ غیر اخلاقی جوڑ توڑ اور مکر و فریب کا قائل نہ ہو سکا۔ فرغانہ اور سمرقند کی مہمات میں اس سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ جن کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔ لیکن وہ بدعہدی کے لئے تیار نہ ہوا۔ تزک میں لکھتا ہے۔

> ''ایک دن اچانک جہانگیر مرزا تنبل کا ساتھ چھوڑ کر میرے پاس آخشی میں آن پہنچے۔ میں گوسل خانہ میں تھا تاہم اسی وقت ان سے ملاقات کی بایزید بہت گھبرایا۔ جہانگیر مرزا اور ابراہیم بیگ نے مشورہ دیا کہ میں بایزید کو قید کر لوں اور قلعہ پر قابض ہو جاؤں لیکن میں نے بدعہدی مناسب نہ سمجھی۔'' (6)

اس عہد ابتلا میں بابر کی شخصیت میں تہ داری اور گہرائی کے ساتھ پختگی اور صلابت بھی پیدا ہوئی اور بعض ایسی صفات جو بعد کی مہمات میں اس کے کام آئیں، اسی دور میں نکھریں۔ ان تند و تلخ تجربات نے گویا اس کی پہلو دار شخصیت کو ہمہ جہتی آنچ دے کر کندن بنا دیا۔

یہ صحیح ہے کہ اس کی رومان پرور فطرت کا اس کی حقیقت پسندی سے ایک ٹکراؤ رہا۔ اسی طرح

اس کی مذہبی حسیّت اس کے کھلے پن اور آزاد خیالی کے آڑے آتی رہی۔ لیکن اس آویزش کے پہلو بہ پہلو چلتی ہوئی، اس کی شرافت نفس اور انسان دوستی نے کبھی ہار نہیں مانی۔ ہمیشہ اس نے اپنی شخصیت کو ایک توازن سے ہم آہنگ بنائے رکھنے کی سعی کی۔ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی، زندہ دلی اور شوخی طبع کا دامن اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا، اور وہ وصف خاص جو بابر (یعنی شیر) کی طرح شناخت بن گیا یعنی آہنی عزم وارادہ اور خود اعتمادی کا جذبہ اس کی عمر کے ساتھ بڑھتا اور نکھرتا گیا۔ اس سلسلہ میں مورخین نے بہت سے دلچسپ واقعات نقل کئے ہیں اور خود تزک بابری میں مصنف نے نہایت سادگی اور انکساری کے ساتھ ذاتی تجربات کے حوالے سے کچھ حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔

ایک بار جب برف باری اور موسم سرما کی شدت انتہا پر تھی وہ اپنے حریف شیبانی خاں کا پیچھا کر رہا تھا۔ بابر نے لکھا ہے سردی اس بلا کی تھی کہ میرے سپاہیوں میں سے تین ساتھی ہلاک ہو گئے۔ جب وہ دریائے خوجند پر پہنچے تو دیکھا کہ دریا کے اوپر برف کی تہ جمی ہوئی ہے۔ اس دریا کو پار کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ سپاہی اس جمے ہوئے دریا کو دیکھ کر ہراساں ہوئے ہوں گے۔ رات نہوں نے دریا کے ساحل پر گزاری۔ صبح تڑکے سپاہیوں نے اپنے خیموں سے جھانک کر دیکھا کہ کوئی اس منجمد دریا میں نہا رہا ہے اور خوش ہو ہو کر منجدھار میں غوطے لگا رہا ہے۔ غور سے دیکھا تو وہ ان کا سردار بابر مرزا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد جب بابر نے دریا کو عبور کرنے کا حکم دیا ہوگا تو کسی کو تامل نہ ہوا ہوگا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ چند سال بعد کابل کے نواح میں پیش آیا۔ جب ساری فوج برف کے غضبناک طوفان میں گھر گئی تھی رات کا وقت تھا برف اتنی گری کہ شانوں تک آ گئی۔ ایسے میں فوج راستہ بھٹک گئی۔ اس طرح کے طوفانوں میں گھر کر اکثر پورے پورے فوجی دستے جاں بحق ہو جاتے تھے۔ اچانک کچھ سرداروں کو پہاڑ کے پہلو میں ایک غار نظر آیا جس میں تین چار آدمی پناہ لے کر برف کے طوفان سے محفوظ رہ سکتے تھے انہوں نے بابر سے درخواست کی کہ وہ اس رات اس میں پناہ لے لیں۔ لیکن بابر نے صاف انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ میرے لئے ممکن نہیں کہ میں محفوظ غار میں پناہ لوں اور میری فوج برفانی طوفان کی سختیاں جھیلے۔ تزک میں لکھتا ہے:

''میں نے اس رات اس فارسی مقولے پر عمل کیا کہ 'مرگ بہ یاراں عید

است' ساتھیوں کے ساتھ موت بھی عید کے برابر مزہ رکھتی ہے۔''

بابر کی شوخی طبع اور شجاعت کے سلسلہ میں یوں تو بے شمار واقعات قابل ذکر ہیں۔ یہاں صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔

ایک بار بابر مرزا اپنے دشمن شیبانی خاں سے شکست کھا کر بہت برے حال میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ سمرقند سے فرار ہوا۔ اپنی بہن خانزادہ بیگم اور نانی کو بھی دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑنا پڑا۔ کچھ ساز و سامان ساتھ نہ تھا۔ جنگلوں میں بھٹکتا رہا۔ بھوک سے نڈھال، دشمنوں کے سپاہیوں کا پیچھا کرنے کا ڈر۔ بابر لکھتا ہے: ''یہ رات بہت اندھیری تھی۔ ہم سعد کی بڑی چھوٹی، الجھی ہوئی نہروں اور ان سے سیراب ہونے والے باغات میں پھنس کر راستہ بھول گئے۔ بڑی مشکلوں سے کہیں صبح کے وقت خواجہ دیدار پہنچے..... راستہ میں قاسم بیگ اور قنبر علی کو شوخی سوجھی۔ انہوں نے مجھ سے گھڑ دوڑ کی (فرمائش کی) اور میں نے اپنا گھوڑا ان سے بہت آگے نکال لیا۔ مڑ کر جو دیکھا تو گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور میں سر کے بل زمین پر آن گرا۔ اس وقت تو فوراً دوبارہ گھوڑے پر سواری کر لی لیکن گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ایسا لگتا تھا جیسے میرے حواس ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔ پھر عصر کے وقت اعلان ادی میں جا کر گھوڑوں سے اترے۔ ایک گھوڑے کو ذبح کیا اور اس کا گوشت کھایا۔'' (8)

ایسی مصیبت کے وقت جب ایک فرماں روا سے، اس کی حکومت، اس کی مملکت اور عزیز و اقارب سب چھوٹ گئے ہوں اور وہ بے یار و مددگار ہو گیا ہو کسی کھیل میں حصہ لینا۔ صرف بابر جیسے عزم و حوصلے کے انسان کا ہی شیوہ ہو سکتا ہے۔

دین اور درویشوں سے عقیدت

ایک رومانوی انسان کی زندگی میں اکثر توازن کی کمی ہوتی ہے۔ انتہا پسندی اور شدت اُس کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ لیکن اس کا انحصار کچھ حد تک اس کی تہذیب و تربیت پر بھی ہوتا ہے۔ پندرہویں صدی کا زمانہ ساری دنیا میں مذہب اور مذہبی اداروں کے تسلط کا زمانہ تھا۔ اگرچہ تاریخی حقائق اس کے شاہد ہیں کہ وسطی ایشیا میں مذہب کی ایسی بالادستی نہیں رہی جیسی کہ ہندوستان یا مغربی ایشیا کے بعض ملکوں میں رہی۔ منگول ہوں، یا ازبیک ہوں یا ترک، اسلام قبول کرنے کے باوجود

ایک طرح کی آزادیٔ فکر وعمل کے احساس سے جڑے رہے۔ امیر تیمور ہو یا اس کی نسل کے دوسرے فرماں روا سب نے اسلامی علوم وفنون کو فروغ دینے کی پرخلوص کوششیں کیں۔ لیکن حکومت کے قوانین اور انتظام میں اسلامی شریعت کو بس ایک حد تک ہی جگہ دے سکے۔ اس کے مقابلہ میں چنگیز خاں نے جہاں بانی کے جو قوانین وضع کیے تھے ان پر بھی عمل ہوتا رہا۔

بابر مرزا کی ابتدائی تعلیم وتربیت میں اس کی ماں قتلق نگار خانم اور نانی ایسان خانم دونوں کا حصہ رہا اور دونوں ہی مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ عبادت گزار اور پرہیزگار تھیں۔ ان کے علاوہ رواج کے مطابق بابر کے اتالیقوں نے بھی دینی تعلیم دینے میں کوتاہی نہیں کی۔ دینی علوم کے حوالے سے بابر مرزا کی عقیدت اور بصیرت کے شواہد جگہ جگہ تزک بابری، میں ملتے ہیں۔ بابر کے والد عمر شیخ مرزا اپنے زمانہ کے ایک مشہور نقش بندی بزرگ خواجہ عبیداللہ احرار کے پیرو تھے۔ جب بابر کی پیدائش ہوئی تو اس کا نام ظہیرالدین محمد بابر عبیداللہ احرار نے ہی رکھا تھا۔ ان پیر و مرشد کے بارے میں بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ وسط ایشیا کے حکمرانوں کے سیاسی جوڑ توڑ میں بھی حصہ لیتے تھے۔ بابر بھی ساری زندگی اپنے والد کے ان مرشد کا عقیدت مند رہا۔ مذہبی اثرات نے اس کے دل و دماغ پر ایسی جگہ بنائی تھی کہ اس نے اپنی نصف زندگی اتقا اور پرہیزگاری میں گزاری۔ تقریباً بائیس سال کی عمر تک وہ اپنے والد چچا اور دوسرے تیموری شہزادوں کی طرح لہولعب میں ملوث نہیں ہوا۔ شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہیرالڈ لیمب اپنے ہیرو کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''طفلانہ جوش میں بابر نے پختہ ارادہ کر لیا کہ کمال تقویٰ کی زندگی گزارے گا۔ چنانچہ مشتبہ کھانوں سے پرہیز کیا۔ تچھے دستر خوان تک پاک وطاہر رکھنے پر توجہ کی۔ پچھلے پہر کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنے لگا۔'' (9)

بابر کی سیرت میں رحم دلی، عفو وانصاف اور دوسری انسانی اقدار کا جو گہرا احساس تھا، مذہبی حسیت نے یقیناً اس کو جلا بخشی ہوگی اور اگر پاکباز نہیں تو ایک بہتر انسان بننے میں مدد کی ہوگی۔ اس حقیقت کا ثبوت تزک میں بیان کیے ہوئے متعدد وقوعوں سے ملتا ہے۔

مثلاً ایک بار سمرقند کے اطراف میں جہاں بابر کی فوج ڈیرہ جمائے تھی کچھ سپاہیوں نے تاجروں کا مال واسباب لوٹ لیا، بابر نے حکم دیا کہ لوٹا ہوا سارا سامان تاجروں کو واپس کیا جائے اور مجبور کیا کہ ایک ایک چیز واپس ہو۔

خسرو شاہ بابر کے دشمن شیبانی خاں کے حواریوں میں تھا اور اس نے بابر مرزا کو نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کی لیکن ایک بار وہ شیبانی خاں سے بھاگ کر بابر کی پناہ کا طالب ہوا۔ بابر نے اس کو جان کی امان دی اور اس کی اجازت بھی عطا کی کہ اپنے ساتھ وہ جتنا مال واسباب چاہے لے جائے۔ تزک میں لکھتا ہے:

''میں نے معاہدہ کا پاس کیا اور اسے اجازت دی کہ اپنا مال ومتاع اپنے ساتھ لے جائے۔ اونٹوں اور خچروں کی چار قطاروں پر اس نے سونا چاندی اور دوسری قیمتی چیزیں لاد رکھی تھیں میں نے ان میں سے کسی ایک سے بھی تعرض نہ کیا۔''(10)

بابر پیروں فقیروں اور درویشوں سے خاص عقیدت رکھتا تھا اور ان کے مزاروں کو بھی قابل تعظیم سمجھتا تھا۔ کابل کی فتح کے بعد جب اس نے پہلی بار ہندوستانی علاقوں پر حملہ کیا جس کا مقصد وہاں کے امیروں اور قبیلوں کی دولت کو لوٹنا تھا تو اس زمانہ میں کوہ سلیمان کے دامن میں فوج ایک پیر کے مزار پر پہنچی۔ اس کے مجاور بھی شاید صاحب حیثیت رہے ہوں گے۔ وہاں بابر کے کچھ سپاہیوں نے ان کو بھی ستایا۔ بابر مرزا کو معلوم ہوا تو دکھ ہوا اور وہ غیظ میں آ گیا۔ تزک میں لکھتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اس مزار کی بہت تعظیم کرتے ہیں میرے چند سپاہیوں نے اس مزار کے کچھ مجاوروں سے گستاخی کی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک سپاہی کو قتل کروا دیا اور اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔

کابل کی فرمانروائی اور فوج کشی کے ایام میں قتل وخون کرنے کے کچھ واقعات ضرور ہوئے اور ایک سپہ سالار کے اصرار اور ترغیب پر کچھ بے گناہوں کو بھی ہلاک کیا گیا لیکن حقیقت میں یہ استثنائی واقعات ہیں جو حاکمانہ رعب داب کو قائم رکھنے یا مصلحت اور تادیب کی خاطر وقوع میں آئے۔ ورنہ بابر مزاجاً عفو ودرگذر کا انسان تھا۔ اکثر دشمنوں اور باغیوں کو اس نے دل سے معاف کر دیا۔ اس کے سوتیلے بھائی جہاں گیر مرزا اور ناصر مرزا وادی ءفرغانہ میں ہمیشہ دشمنوں سے مل کر بابر کے خلاف سازباز کرتے رہے لیکن جب بابر نے کابل کی بڑی وادی پر تسلط جما لیا تو سب سے پہلے اس نے اپنے ان بھائیوں کو بلا کر بڑی بڑی جاگیروں سے نوازا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ بابر نے تزک میں بڑی سادگی سے لکھا ہے۔ جو اس کی کشادہ دلی، فیاضی اور بھائیوں سے

محبت کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی دلداری پر روشنی ڈالتا ہے:

''میں نے یہ رات ارک میں بسر کی۔ دوسرے دن باغ فرح زاد میں پہنچا اور اپنے بھائی ناصر مرزا کو نو مفتوحہ علاقہ قندھار عطا فرما دیا۔ البتہ خزانے اپنی تحویل میں لے لئے۔ خزانہ کے اونٹ باہر کی طرف نکلے تو ناصر مرزا نے روپیوں سے لدے ہوئے اونٹ رکوا لئے۔ میں مسکرایا اور یہ سارے اونٹ اسی کے سپرد کر دیئے۔'' (11)

اس کی بے شمار مثالیں ہندوستان کی فتح کے بعد بھی ملتی ہیں کہ بابر مرزا کو غزنیوں اور غوریوں کی طرح روپیہ اور زر و مال کی ذرا بھی حرص نہیں تھی۔ اس سلسلہ میں اس کی دریا دلی اور فیاضیوں کا سلسلہ اس کی زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہا۔

فوج کشی کے دوران قتل و غارتگری تو عہد وسطیٰ میں عام بات تھی۔ اکثر سپاہی تنخواہ کے بجائے مال غنیمت پر ہی گذر کرتے تھے۔ لیکن بابر مرزا نے عام حالات یا امن کے حالات میں کبھی اپنے سپاہیوں کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ پر امن شہر کو لوٹیں یا تجارتی قافلوں پر حملے کر کے ان کے مال و اسباب پر قبضہ جمائیں۔ اس سلسلہ میں 'تزک' میں سے صرف ایک واقعہ نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔

''ہم جس وقت قلات میں پہنچے تو وہاں ہندوستان کا ایک تجارتی کارواں رکا پڑا تھا۔ مجھ سے میرے بعض ساتھیوں نے کہا کہ اسے لوٹ لیں۔ لیکن میں نے اس پر آمادگی ظاہر نہ کی اور اپنے ساتھیوں کو اس بدنیتی سے روکا اور کہا کہ صبر کریں۔ اللہ انہیں اپنی جناب سے بہتر اجر دے گا..... بہر حال ہندوستانی سوداگروں نے آپ ہی ہمیں کچھ نذرانے پیش کئے۔'' (تزک ص 135)

حق یہ ہے کہ اسلام اور دوسرے مذاہب کی تعلیمات کا مقصد و منتہا یہی ہے کہ انسان ایک اکمل اور بہتر انسان بنے۔ انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر اس کا ایمان مستحکم ہو۔ اپنے اخلاق اور اعمال میں وہ راست باز ہو۔ مکر و فریب منافقت اور ریاکاری سے دور رہے۔ انسانی دکھوں کے تئیں اس کا رشتہ دردمندی کا اور انسانی کمزوریوں اور خطاؤں کے تئیں عفو و درگزر کا ہو۔ عملی زندگی کے معرکوں

اور الجھنوں میں وہ عقل و دانش اور اعلیٰ ظرفی سے فیصلے کرے اور آخر میں یہ کہ منفی اور وحشی رویوں اور جذبات مثلاً حرص و آز، عصبیت، نفرت، حسد اور انتقام کو اپنے معنوی انسانی وجود میں داخل اور دخیل ہونے سے باز رکھے۔ اگر مذہبی تعلیم کا منتہا ایسے مہذب انسان پیدا کرنا ہے تو بابر مرزا یقیناً مذہبی حسیت کا انسان تھا۔ انصاف اور حق پسندی کے ایک اور واقعہ کا ذکر بھی تزک میں ملتا ہے کہ ایک قافلہ کے لوگ فرغانہ کے کوہستانی راستہ میں برف باری اور برق و باراں میں ہلاک ہو گئے۔ بابر کو علم ہوا تو اس نے ان کا سارا مال و اسباب منگوا کر اپنے پاس امانتاً رکھ لیا اور دو سال بعد ان کے ورثا کو تلاش کر کے انہیں سونپ دیا۔

رومانوی تشخص کی سمت

1504ء میں بابر مرزا نے کابل کے حاکم مقیم بیگ ارغون کو شکست دی اور پوری وادی پر تسلط جما لیا۔ اس واقعہ کے نتیجہ میں اس کی زندگی میں جدوجہد کے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مہم پسندی اور طالع آزمائی کا پچھلا دور اگر ایک طرف نوعمری کی آرزومندیوں اور جذباتی جوش سے معمور تھا تو دوسری طرف یہ بابر کے تجربات نے اس کو دنیوی اور سیاسی امور میں فہم و دانش کی بے مثل دولت بخشی۔ جس نے آگ کی منزلیں آسان کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اب کچھ امن و فراغت کے دن میسر آئے تو بابر ایک فرد یا انسان کی حیثیت سے خود اپنی بے کیف زندگی کے بارے میں بھی سوچنے پر مائل ہوا۔

وہ نہ صرف صاحب سیف و علم بلکہ صاحب قلم بھی تھا۔ اپنے عہد کا سب سے ممتاز نثر نگار (چغتائی ترکی زبان کا) اور ایک خوش فکر شاعر بھی تھا۔ اپنے نامور اجداد کی طرح وہ بھی اہل علم و ہنر کی صحبتوں کا دلدادہ تھا۔

جس زمانہ میں بابر نے کابل پر قبضہ کیا اسی زمانہ میں خراساں کا فرماں روا حسین مرزا بائیقرا وفات پا گیا جو رشتہ میں بابر مرزا کا چچا تھا۔ اس کے بیٹے جانشین ہوئے۔ بابر مرزا کے اپنے ان بھائیوں کے ساتھ خوشگوار مراسم تھے۔ انہوں نے بابر مرزا کو اپنے پایہ تخت ہرات آنے کی دعوت دی۔ 1506ء کے موسم خزاں میں جب بابر ہرات پہنچا تو اس عالیشان شہر کی خوبصورتی اور زیبائش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس سے زیادہ وہ نوجوان حکمرانوں کے محلات کی شان و شوکت و آرائش اور

عیش و نشاط کے ساز و سامان کو دیکھ کر مرعوب ہوا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ فرمانرواؤں اور شہزادوں کی زندگی کے لیل و نہار کیسے ہوتے ہیں۔ بابر مرزا نے تزک میں ہرات کے شاہی دربار کی محفلوں اور میز بانیوں اور شاہی ضیافتوں کا احوال بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ کچھ جھلکیاں دیکھئے۔

''مجھے دعوت دے کر، ابوالحسن میرزا، تو اپنے پایہ تخت مرو چلے گئے۔ ابن حسین مرزا نے بھی اپنی قلمرو تون اور قائن کی راہ لی۔ البتہ بدیع الزمان مرزا، اور مظفر حسین مرزا میرے آگے آگے ہری کی طرف چلے۔ میں نے دو تین دن بعد ہرات کا قصد کیا۔

''میری عمہ محترمہ پائندہ سلطان بیگم، خدیجہ بیگم، آفاق بیگم اور ابوسعید مرزا کی دوسری صاحبزادیاں۔ سلطان مرزا کی تعزیت کے لئے مرحوم کے مقبرہ ہی میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ میں سب سے پہلے ان ہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سب سے پہلے پائندہ سلطان بیگم سے آداب شاہی کے مطابق زانو پر ہاتھ مار کر ملاقات کی۔ اور پھر خدیجہ بیگم کی خدمت میں آداب بجا لایا۔ مقبرہ میں حفاظ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر رُک کر قرآن سُنا۔ پھر پھوپھی خدیجہ بیگم کے ہاں حاضری دی۔ جہاں آش کھائی رات پائندہ بیگم کے ہاں گزاری دوسرے دن میں نئے باغ پہنچا۔ جہاں میری قیام گاہ تھی۔ ایک رات اس باغ میں گزاری لیکن پھر علی شیر بیگ کے مکان میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ ہری کے دورانِ قیام میں اسی مکان میں برابر ٹھہرا رہا۔ دوسرے، تیسرے بدیع الزمان مرزا کی خدمت میں ان کی قیام گاہ باغ جہاں آرا میں حاضری دیتا۔ مرزا مظفر حسین نے بھی کچھ دن بعد مجھے اپنی قیام گاہ باغ سفید میں مدعو کیا۔ خدیجہ بیگم بھی وہیں تھی میں جب ان سے ملنے گیا۔ تو جہانگیر مرزا، ہم کو اپنے ''طرب خانہ'' میں لایا۔ جو دو منزلہ مکان ہے۔ اوپر کی منزل بہت خوبصورت ہے اور بڑی توجہ سے بنائی گئی ہے۔ اور اسے خوب سجایا گیا ہے۔''

لیکن اس کی تزئین وتہذیب ابوسعید مرزا نے کی۔ اس کی دیواروں پر جو تصویریں تھیں وہ بھی ابوسعید مرزا نے بنوائی تھیں۔

''جب ہم وہاں پہنچے تو شمالی شہ نشین میں دو مسندیں ایک دوسرے سے متقابل بچھائی گئی تھیں۔ ایک پر مظفر حسین مرزا اور میں بیٹھے۔ دوسری پر سلطان مسعود مرزا اور جہانگیر مرزا نے جلوس کیا۔ چونکہ میری مہمانی مقصود تھی اس لئے مظفر حسین مرزا نے مجھے اپنے سے آگے جگہ دی۔ اور شراب کا دور شروع ہوا۔ مجھ سے شراب پینے کے لئے اصرار ہوا لیکن میں نے اس وقت تک شراب چکھی نہ تھی۔ ماحول کا اثر تھا اور کچھ ہری جیسے شہر کی عظمت سے مرعوب ہوا تھا کہ جی شراب پینے کو چاہا لیکن خیال ہوا کہ کہیں بدیع الزمان مرزا جو بڑے بھائی ہیں۔ اس بات پر بُرا نہ مان جائیں کہ میں نے ان کی بزم میں تو پی نہیں، یہاں پی لی ہے۔ اِس خیال سے جام کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ یہی بات میں نے اصرار کرنے والوں سے کہہ دی۔ انہوں نے میری معذرت قبول کر لی۔ اور پھر اصرار نہیں کیا۔ اور اس محفل میں مجھے پینے کی تکلیف نہیں دی، البتہ یہ قرار پایا کہ بدیع الزمان مرزا، اور مظفر مرزا، جب دونوں ایک محفل میں جمع ہوں اور دونوں ایک ساتھ اصرار کریں تو پھر میں پی لوں۔

اس محفل میں کچھ گویّے بھی تھے۔ ان میں سے حافظ حاجی، جلال الدین محمود نائی اور غلام شادی کے چھوٹے بھائی نے گانا سنایا۔ حافظ جی ان سب میں اچھا گویّا ثابت ہوا۔ جہانگیر مرزا کے ساتھ بھی ایک گویّا، میر خاں تھا۔ جو سمرقند کا باشندہ تھا۔ جہانگیر مرزا کے کہنے سے اس نے بھی گانا گایا۔ لیکن اس کی آواز بہت اونچی تھی اور اس نے گلا پھاڑ پھاڑ کر گایا۔ اس لئے خراسان والوں نے جو نیچے سروں کو پسند کرتے ہیں اُس کا مذاق اڑایا۔

شام کی نماز کے بعد یہ محفل ختم ہوئی اور ہم طرب خانہ سے نکلے اور مظفر

حسین مرزا کے بنائے ہوئے نئے قشلاق میں آئے۔ یہاں پہنچ کر نشہ کے سبب، یوسف کو کلتاش خوب ناچا۔ مظفر حسین مرزا کے دو غلاموں نے بھی گایا۔ مگر اچھا نہیں گایا۔

مظفر حسین مرزا نے مجھے یہاں کچھ تحائف بھی پیش کئے جن میں ایک تلوار تھی۔ برّہ کی ایک پوستین تھی اور ایک تیچاق تھا۔ کافی رات گئے تک یہاں بھی محفل جمی میں نے یہ رات یہیں بسر کی۔ قاسم بیگ مرزا کو جب خبر پہنچی کہ اِس محفل میں، طے ہوا ہے کہ مجھے شراب پلائی جائے۔ تو اس نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا۔ جنہوں نے یہ صلاح کی تھی۔ قاسم بیگ کے ڈانٹنے سے یہ لوگ مجھے شراب پلانے سے باز آ گئے۔

مظفر حسین کی دعوت کے بعد بدیع الزمان مرزا نے بھی میرے اعزاز میں مقوی خانہ میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ یہ دعوت بڑی شاندار تھی۔ اس میں میرے مصاحب بھی مدعو کئے گئے تھے جو میرے سامنے شراب پینے سے ڈرتے تھے۔ یہاں انہوں نے ہزار جتنوں سے کبھی منہ موڑ کر کبھی میری آنکھیں بچا کر شراب پی میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ یہ دعوت، ایک بڑے بھائی نے کی تھی۔

میرے سامنے، قاز کی ایک قاب لائی گئی۔ چونکہ میں قاز کے کاٹنے سے بے خبر تھا۔ اس لئے میں نے اس قاب پر ہاتھ نہیں ڈالا، بدیع الزماں مرزا سمجھ گیا۔ اس نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ہاتھ بڑھاؤں میں نے معذرت کی، کہ میں اسے کاٹنا نہیں جانتا بدیع الزمان مرزا نے، میری قاب اپنی طرف بڑھالی۔ قاز کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے سامنے رکھے۔

بدیع الزمان مرزا نے مجھے، ایک خنجر مرصّع، چار قب قیچاق نذر کیا۔ میں ہری میں کوئی بیس دِن تک مقیم رہا۔ روزانہ ہری (ہرات) کے قابل دید مقامات کی سیر کرتا رہا۔ (13)۔

اگرچہ بابر نے ہرات کی شاہی ضیافتوں میں مے نوشی سے پرہیز کرنے کی بات لکھی ہے

لیکن بابر کے ایک سوانح نگار لین پول Lane Pool کا دعویٰ ہے کہ بابر نے اسی سفر کے دوران پہلی بار مے نوشی کی۔

بہر حال بابر نے اس کا اعتراف ضرور کیا ہے کہ ان نشاط انگیز محفلوں میں پہلی بار اس کے دل میں شراب پینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس سفر کا ایک دلچسپ واقعہ بابر مرزا کا ایک معاشقہ ہے۔ اگر چہ اس کا ذکر بابر نے تزک میں نہایت اختصار کے ساتھ کچھ شرماتے ہوئے کیا ہے۔ لکھتا ہے:

> ''سلطان مرزا کی چھوٹی بیٹی جو معصومہ بیگم مرزا کی حرم حبیبہ بیگم کے پیٹ سے تھی، خراسان آ گئی تھی۔ ایک دن میں اس سے ملنے کے لئے اس کے مکان پر گیا۔ وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی۔ مجھے اسے دیکھ کر اس سے نکاح کر لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اس لئے میں نے اس کی ماں اور پائندہ سلطان بیگم کو خفیہ پیغام بھیجا۔ انہوں نے یہ پیغام قبول کر لیا۔ اور طے پایا کہ معصومہ بیگم کی ماں، اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر میرے خراساں سے چلے جانے کے بعد کابل آ جائیں گی۔''(14)

معصومہ دراصل بابر مرزا کی پہلی بیوی عائشہ کی چھوٹی بہن تھی۔ عائشہ سے بابر کی شادی کے بعد ایک بچی پیدا ہوئی۔ جو بعد میں جیسا کہ ذکر آ چکا ہے وفات پا گئی۔ عائشہ بابر کی بے مہری اور بے التفاتی سے تنگ آ کر اپنی ماں کے پاس سمرقند چلی گئی تھی۔ ہیرالڈ لیمب نے لکھا ہے کہ معصومہ ہی بابر کو دل دے بیٹھی تھی۔ ہرات کی ملاقاتوں نے اس چنگاری کو شعلہ بنا دیا۔ بعد میں حسب وعدہ بابر نے اسے اپنی منکوحہ بیگم بنا لیا۔ معصومہ کے ساتھ بابر نے عیش و نشاط کی انمول گھڑیاں گزاریں۔ لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ایک بچی کو جنم دے کر وہ بابر سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ بچی زندہ رہی۔ بابر نے معصومہ کی محبت اور اس کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے بچی کا نام بھی معصومہ رکھا۔ اس پر وہ ہمیشہ مہربان رہا۔

کچھ دن بعد ماں کے اصرار پر بابر نے اپنی ایک دوسری عم زاد بہن زینب سلطان بیگم سے شادی کر لی۔ یہ شادی بھی کچھ راس نہ آئی اور دو سال بعد وہ چیچک کے مرض میں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

عیش وطرب کی ترغیبات

بابر ایک حوصلہ مند اور جواں ہمت انسان تھا۔ لیکن حساس اور جذباتی بھی تھا۔ دکھوں، محرومیوں اور حزیمتوں کی اذیت وہ بھی محسوس کرتا تھا۔ غموں اور خوشیوں میں شریک رہنے والے معشوقوں اور دوستوں سے جدائی اسے بھی اداس کر دیتی تھی۔ تزک کے بعض حصوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ بہت تنہا محسوس کرتا تھا۔ غم واندوہ کی گرانی سے جیسے وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہا ہو۔ ایک بار جب وہ ایک مہم سے واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے بھائی ناصر مرزا ایک قبیلے سے ساز باز کر کے اپنی الگ حکومت قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے (اسے کچل دیا گیا) 1511ء میں اسے سمرقند پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کی ترغیب ایران کے فرمانروا شاہ اسماعیل سے ملی۔ جسکے نتیجہ میں اسے شاہ اسماعیل صفوی کے ساتھ ایک شرمناک سمجھوتہ کرنا پڑا۔ اسے اپنے آبائی سنی عقیدہ کو ترک کر کے شیعہ عقیدہ اپنانا پڑا۔ جس سے سمرقند اور وادی کابل میں اس کے ہزاروں قدرداں ورہم مسلک عزیز اور دوست سخت ملول اور برہم ہوئے۔ پھر بخارا کے قریب اس کے دشمن شیبانی خاں کے بھتیجے عبیداللہ نے اس کی فوج کو شکست دی۔ وہ نہایت برے حال میں کسی طرح کابل واپس آیا۔ الغرض پسپا اور ہراساں کر دینے والے ان اندوہناک واقعات نے بابر کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔

اس عہد کے واقعات تزک بابری، میں نہیں ملتے۔ حبیب السیر تاریخ رشیدی اور دوسرے حوالوں سے لکھتا ہے:

> ''بخارا سے شکست کھا کر مراجعت کے وقت (بابر کے) ناز ونخوت کی گردن ٹوٹ چکی تھی اور حال، مستقبل کی کچھ فکر نہیں رہی تھی۔ لطف شراب میں افیون اور بھنگ کا اضافہ کر لیا تھا..... جنگ میں شکست اور سمرقند میں خود اپنے اہل ملک کا انحراف اور طعنے کہ بے دین صفوی کی جوتیاں چاٹتا ہے..... یہ سب باتیں بابر کو اپنی زندگی سے نفرت دلاتی تھیں۔'' (15)

اب فرغانہ یا سمرقند میں قدم جما کر وہاں کوئی مستقل حکومت بنانے کا خیال بابر نے ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا۔ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے اب اس نے دیار مشرق یعنی ہندوستان

کی سمت دیکھا اور بڑی فوجی مہمات کی تیاری میں لگ گیا۔

دوسری جانب وہ اپنی پسپائی، مایوسی اور خفت کے احساس سے نجات پانے کے لئے شعر و شاعری، موسیقی اور ارباب نشاط کی محفلیں آراستہ کرنے لگا۔ اکثر وہ فوجی مہم کے دوران بھی شعر کہنے لگا۔ اب وہ مفتوح قبیلوں کی حسین دوشیزاؤں کو اپنے حرم میں داخل کرنے لگا۔ یہ وہی بابر مرزا ہے جو بیس بائیس سال کی عمر تک نسوانی حسن و شباب کے سحر و افسوں سے دامن بچاتا رہا تھا۔

بابر نے جب تیسری بار ہندوستان پر فوج کشی کی تو وہ وادی سوات کی سمت گیا وہاں یوسف زئی قبیلہ کو اپنا مطیع بنایا اور خوب داد عیش دی۔ حیرت ہے کہ عاشورہ کے دن بھی اس نے مے نوشی کی محفل سجانے سے گریز نہیں کیا۔ لکھتا ہے:

> ''دسویں محرم کو میں خواجہ کلاں کی دعوت شراب میں شرکت کی خاطر بجور پہنچا۔ یہ رات وہیں بسر کی اور دوسری صبح چھاؤنی میں واپس آ کر دریائے جنداول کی راہ لی..... کوہ مہر میں جو چنداول اور بجور کے مابین واقع ہے شکار سے جی بہلایا۔ اس پہاڑ کے بارہ سنگوں اور نیل گایوں کے رنگ سیاہ ہوتے ہیں۔ جو ہرن اور نیل گائے آج شکار ہوئے ان کے رنگ بھی سیاہ تھے۔''

اس دن کے روزنامچہ کو جاری رکھتے ہوئے بابر لکھتا ہے:

> ''یہاں میں نے ایک بہت بڑا چبوترہ تیار کرایا۔ یہیں یوسف زئی بادشاہ ملک شاہ منصور حاضر ہوا اس خیال سے کہ یوسف زئی پٹھانوں سے مضبوط رشتہ استوار ہو جائے اس سے درخواست کی گئی کہ اپنی بیٹی شاہی حرم میں داخل کر دے۔ یہ اٹھائیس تاریخ تھی جب شاہ منصور کا بھائی طاؤس خاں اپنی بھتیجی دختر شاہ منصور کو دلہن بنا کر اپنے ساتھ لایا۔''(16)

بابر کے محل میں افغان بیگم نام کی ایک محل یا بیگم تھی۔ بابر کو وہ بے حد عزیز تھی۔ اس کا اصل نام مبارکہ بیگم تھا اور وہ یوسف زئی پٹھان قبیلہ کی دوشیزہ تھی۔ اس سے بابر کے عشق کے بارے میں بابر کے مغربی سوانح نگاروں نے بڑی دلچسپ کہانی بیان کی ہے۔ یہ کہ بابر اس قبیلہ کے سردار ملک احمد سے ناراض تھا اور اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ حسب عادت ایک بار وہ اس قبیلہ کے سردار کی حویلی

کے اطراف میں ایک درویش کے بھیس میں گھوم رہا تھا کہ اس کی نظر مبارکہ بیگم پر پڑی۔ وہ اس کی مثالی خوبصورتی دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ مبارکہ بیگم نے درویش کو اپنی خادمہ کے ہاتھ گوشت میں لپٹی ہوئی روٹی بھیجی۔ جسے اس نے حفاظت سے رکھ دیا۔ اس نے اس پٹھان حسینہ سے شادی کا پیغام بھجوایا۔ بہت ردوقدح کے بعد قبیلہ کے سردار شادی کے لئے تیار ہوئے۔ شادی بہت شان وشکوہ سے انجام پائی۔ شادی کی پہلی ہی رات مبارکہ بیگم نے کمال ہوشیاری سے بابر کو مجبور کیا کہ وہ یوسف زئی قبیلہ کے اور اس کے سرداروں کے قصور معاف کردے۔ بابر مرزا کی یہی شریک حیات، بابر کی وفات کے نو سال بعد جب شیر شاہ کی حکومت تھی کابل سے آگرہ آئی اور اپنے شوہر کی باقیات کو بحفاظت کابل لے گئی اور وہاں باغ بابر میں دفن کیا۔

آہستہ آہستہ بابر مرزا عیش وطرب کا عادی ہوتا جارہا تھا۔ مے نوشی کی محفلیں معمول بن گئی تھیں۔ اپنا شاعری میں جگہ جگہ اس نے زاہد وشیخ کی پارسائی اور بنت عنب سے ان کی محرومی پر افسوس اور طنز کیا ہے۔ ایک محفل طرب میں بابر کے ساتھیوں نے ایک صوفی درویش کو بھی شراب پلادی۔ عہد وسطیٰ کے مسلم معاشرہ میں اور بعد میں بھی اتنا کھلا پن نہیں تھا کہ کوئی مسلم حکمراں اپنے روزنامچہ میں اپنی مے نوشیوں کی طرب انگیز داستان مزہ لے کر بیان کرتا۔ لیکن بابر جو منافقت سے نفرت کرتا تھا' نہایت بے تکلفی اور آزادی سے مے گساری کی محفلوں کا حال بیان کرتا ہے'۔ صرف چند محفلوں کا حال دیکھئے:

> ''جتنے دن اس باغ میں ٹھہرے شراب سے جی بہلایا۔ اگر کبھی شراب نہ پی تو معجون سے کمی پوری کرلی۔ چونکہ ہمایوں وقت مقررہ پر نہیں پہنچا تھا اس لئے کئی پیغام بھجوائے اور سخت سست کہلوایا۔ یہ ہفتہ کا دن تھا کہ ہمایوں نے حاضری دی۔ میں اس وقت صبوحی پی چکا تھا۔
>
> یہ دوشنبہ کی رات تھی جبکہ ہم سلطان پور اور خواجہ رستم کے مابین بنے ہوئے نئے باغ میں پہنچے۔ بدھ کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ جالہ (سواری) میں جلوس فرمایا اور قوس گنبد تک پیتے ہی گئے.....
>
> میرے ساتھ جالہ میں جو لوگ سوار تھے ان میں اکثریت شعراء کی تھی۔ مثلاً شیخ ابوالواجد، شیخ زین، ملا علی خاں، تردی بیگ اور رقم الحروف۔ جالہ کے

دوران سفر میں کسی نے محمد صالح کا یہ شعر پڑھا۔

محبوب بہر عشوہ گرے راچہ کند کس
جائیکہ تو باشی دگرے را چہ کند کس

(آدمی ہر عشوہ گر کو محبوب نہیں بنا سکتا۔ جس جگہ تو ہو وہاں دوسرے کا کیا سوال؟)

فرمائش ہوئی کہ اس زمین میں طبع آزمائی ہو۔ ملا علی خاں سے میرا مذاق تھا۔ اس لئے فی البدیہہ یہ شعر کہہ ڈالا۔

مانند تو مدہوش گرے راچہ کند کس
نرگاؤ کسے مادہ خرے راہ چہ کند کس

(تمہاری طرح کے مدہوش کرنے والے کو کوئی کیا کرے گا۔ جہاں سانڈ موجود ہو وہاں مادہ خر کا کوئی کیا کرے؟) ترجمہ: ق۔ر

شروع میں ہزل گوئی بھی کر لیتا تھا مگر جب سے نعت کہنا شروع کی خیال ہوا کہ مجھ پر حیف ہے کہ اسی زبان سے نعت بھی کہوں اور ہزل گوئی بھی کروں۔ اس لئے ہزل سے کنارہ کشی کر لی۔'' (17)

ہندوستانی علاقوں پر بابر کی چوتھی یلغار کے دوران بادہ نوشی کی کچھ اور دلچسپ محفلیں بھی برپا ہوئیں۔ اس زمانہ میں بابر اپنا روزنامچہ پابندی سے لکھنے لگا تھا اور ہر محفل کا حال خاصی تفصیل سے لکھتا تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ بادہ نوشی کے باوجود وہ اتنا بدمست نہیں ہوتا تھا کہ ہوش گنوا بیٹھے اور حافظہ معطل ہو جائے۔

ملاحظہ ہو:

''اتوار کے روز تصویر خانہ میں جو مختصر سا تھا محفل جمائی۔ سولہ آدمی اسی میں سما گئے۔ پیر کے روز موسم خزاں کا تماشہ کرنے، استانف پہنچے۔ آج معجون کھائی گئی۔ اس دن خوب بارش ہوئی۔ جو امرا اور سپاہی ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے باغ میں پناہ لی اور درختوں کے نیچے پہنچ گئے۔ دوسرے روز اسی باغ میں شراب کی محفل جمی۔ رات بھر شراب پیتے رہے۔

دوسرے دن صبوحی پی اور خوب سوئے۔ دوپہر کو اٹھے تو استانف کا رخ کیا۔ رستہ میں معجون سے جی بہلایا۔ عصر کے وقت بہزاد پر اترے۔ خزاں کا منظر بڑا دلفریب تھا۔ گو معجون کھا چکا تھا۔ مگر ساتھیوں نے شراب پینے پر اکسایا۔ خزاں رسیدہ درختوں کے سائے تلے ہی بیٹھ گئے۔ اور خوب شراب پی گئی۔ عشا کے وقت تک شراب کا دور چلا۔ ملا محمد خلیفہ نے حاضری دی۔ اسے بھی شریک محفل کر لیا گیا۔ عبداللہ چونکہ بہت پی گیا تھا اس لئے اس نے خلیفہ محمود سے چھیڑ خانی کی اور یہ مصرعہ پڑھا۔ ع

در ہر کہ بنگری ہمہیں داغ مبتلا

ملا محمود نے اس پر کئی اعتراض کئے۔ تو عبداللہ بہت شرمندہ ہوا اور ملا محمود کی خوب خوشامد کی۔

سولہویں تاریخ کو باغ بنفشہ میں معجون کھائی اور اٹھارہویں تاریخ کو تردی بیگ کے علاقہ میں پہنچا۔ تردی بیگ نے میرے آنے کی خبر سنتے ہی میرے حضور حاضری دی۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ تردی بیگ مفلس آدمی ہے اور اس پر میری ضیافت کا بوجھ پڑے گا۔ اس لئے سو شاہرخی ساتھ لیتا آتا تھا۔ یہ اسے عنایت کیں اور اسے حکم دیا۔ دعوت کا سامان کرے۔ تردی بیگ بہزادی گیا اور وہاں سے شراب کا ایک خم خرید لایا۔ تردی بیگ کو شراب لاتے دیکھ کر محمد قاسم برلاس اور شہزادہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آئے اور ان کو بھی شریک محفل کیا۔ ہل ہل آتکہ اور قنبر بیگ کو بھی تردی بیگ کی سفارش پر شریک کر لیا۔ شاہی نامی ایک درویش کو بھی شرف حضوری بخشا۔ کاویز کے عقب میں بیٹھ کر ہم نے شام تک شراب پی۔ پھر تردی بیگ کے گھر میں آئے، اور رات گئے تک شراب کا دور چلا۔

منگل کے روز کابل کی سمت واپسی اختیار کی۔'' (18)

اسی سفر اور ہندوستانی برسات کے مستی بھرے موسم کی مے گساری کا یہ مختصر حال بھی دیکھئے:

''تین چار دن تک برابر باغ میں قیام کیا۔ اہل لشکر نے خوب پھل کھائے۔ پیر کے دن باغ وفا سے نکلے اور گند تک پر خیمہ زن ہوئے۔ شام ہوئی تو شراب کی محفل جمی۔ تقریباً سارے کے سارے ندیم شریک ہوئے۔ شراب پیتے پیتے کدائی محمد ہوش و حواس کھو بیٹھا اور میری مسند

سے ٹیک لگالی۔ کدائی طغائی نے اسے محفل سے اٹھادیا۔''

''دوسرا دن طلوع ہوا تو باغ بنفشہ میں پہنچے۔ اور تالاب کے کنارے شراب کی محفل جمائی۔ دوپہر کو تھوڑی دیر سوئے۔ اٹھ کر پھر شراب کی محفل جمائی۔ اس محفل میں تنگرے قلی بیگ کو شراب پلائی گئی۔ اس سے پہلے اسے کبھی یہ عزت نہیں بخشی تھی۔''(19)

ہندوستان کی طرف ایک فوجی مہم کے دوران بابر کو ایک بیٹے کے تولد ہونے کی خبر ملی۔ چونکہ وہ ہندوستان کی مہم کے دوران پیدا ہوا تھا اس لئے اس کا نام ہندال رکھا۔ اس موقع پر بھی بابر نے جشن منایا۔ لکھتا ہے:

''دوسرے دن دربار برخواست کیا اور سیر کے لئے کشتی پر سوار ہوئے، کشتی ہی میں شراب پی گئی۔ ساتھیوں میں خواجہ دوست خاوند، خسرو، میرم، مرزا قلی محمدی، احمدی، کدائی، لقمان، لشکر خاں، قاسم علی تریاکی، یوسف علی اور تنکر قلی تھے۔

عصر کے وقت شراب پی گئی۔ شراب کے بعد معجون کا دور چلا، اور عشا کے وقت تک یہ شغل جاری رہا جس وقت ہم کشتی سے اترے تو کافی اندھیرا تھا۔ اندھیرے کے دامن سے لپٹے ہم لوگ لشکر گاہ میں پہنچے۔

محمد یم اور کدائی کا خیال تھا کہ میں نے صرف شراب پی ہے، اس لئے شراب کا ایک مٹکا گھوڑے پر رکھ کر میرے پاس لائے۔ مگر یہاں کا حال عجب دیکھا۔ کچھ شرابی تھے اور کچھ معجونی۔ وہ کچھ نادم سے ہوئے۔ لیکن میں نے اجازت دی کہ شرابی شراب پئیں اور معجونی، معجون کھائیں اور ایک دوسرے سے نہیں الجھیں۔

اس رات بہت سے ساتھی بہک گئے اور نشہ میں ایک دوسرے سے گالی گلوچ کرنے لگے۔ صحبت بے مزہ رہی۔''

بابر نے کابل میں ایک پسندیدہ کوہستانی شراب کے لئے سرخ رنگ کے ساق (نرم پتھر) کا ایک حوض تعمیر کرایا تھا۔ موسم گرما کی پرفضا راتوں میں یہاں ارباب نشاط کے رقص و

سرود کی محفلیں جمتی تھیں۔ اسی حوض کے کنارے پر بابر مرزا نے ایک شعر کندہ کرایا تھا جو بعد میں ضرب المثل بن گیا۔

نو روز و نوبہار و مے دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

دراصل اسی مضمون کے متعدد اشعار اور رباعیات بابر کے دیوان میں ملتے ہیں۔ فارسی اور ترکی میں خمیریاتی شاعری کی جو روایت تھی اس کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ محض رسمی شاعری تھی یا شعرا کی حقیقی زندگی کی مے گساریوں کی ترجمان تھی۔ لیکن بابر کے بارے میں دو رائیں نہیں کہ شراب و شعر کی محفلیں اس کی رومان انگیز زندگی کا خاص حصہ بن گئی تھیں۔

گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں لکھا ہے کہ پانی پت کی فتح کے بعد جب بابر آگرہ پہنچا تو آگرہ اور گردونواح میں اس نے کئی یادگار عمارتیں تعمیر کرائیں ان میں سات قدم کی چوڑائی کا سنگ مرمر کا ایک حوض بھی تھا جو اس نے دھول پور میں تعمیر کرایا اور کہا کہ اسے شراب سے بھروں گا۔ لیکن رانا سانگا سے جنگ میں اس نے مے نوشی ترک کرنے کا عہد کیا اس لئے بعد میں حوض کو شراب کے بجائے لیموں کے عرق سے بھروایا جو صبوحی کی طرح مے نوشوں کی خماری کو دور کرتا ہے۔ اس لئے اس کی ایک علامتی حیثیت بھی ہے۔ گلبدن بیگم نے یہ بھی لکھا اور اس کی تائید تزک سے بھی ہوتی ہے کہ کنواہہ کی جنگ کے موقع پر بابر نے ترک شراب کا عہد کیا تھا۔ دوسری منشیات کا نہیں۔ اس لئے بابر افیون اور دوسرے ہندوستانی نشے کرتا رہا۔ گلبدن نے لکھا ہے کہ بابر کے مرض الموت اور سینتالیس سال کی عمر میں وفات کا بڑا سبب منشیات کا کثیر استعمال بھی تھا۔ مے پرستی کے حوالے سے بابر مرزا کے کچھ اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

آیا رمضاں تو ہوا بادہ پرست
اور عید کا دن آیا تو ہوں جام بدست
کیا فکر نماز و روزہ کی ہو بابر
دن رات ہوں معجون و مے میں سرمست
لوگ کچھ غموں کی گفتگو کرتے ہیں
آزردگی سے دل کو لہو کرتے ہیں

اکثر انساں عذاب پیہم میں بھی
اک جرعہء مے کی جستجو کرتے ہیں [1]

بابر نے فروری 1529ء کو اپنے بزرگ دوست خواجہ کلاں کو جو کابل چلے گئے تھے ایک خط لکھا تھا۔ اس میں لکھتا ہے:

''اپنے رات کے چوکیدار عبداللہ کو میں نے لکھا ہے کہ توبہ کے شاداب باغ میں آ کر بھی دل تشنگی کے صحرا کی یاد میں بے قرار رہتا ہے۔ قطعہ

ترک مے کر کے ہوا ہوں پریشان بہت
کیا کروں، کیا نہ کروں، ہو گیا حیران بہت
لوگ ہوتے ہیں پشیماں تو کرے ہیں توبہ
توبہ کرنے پہ مگر میں ہوں پشیمان بہت

وہ قطعہ جو اوپر نقل کیا سال بھر پہلے لکھا تھا۔ توبہ کرنے کے بعد دو سال تک بزم شراب کے لئے میرا دل لوٹتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس برس یہ خیال بد دل سے دفع ہوا۔ شاید یہ حضرات خواجہ (احرار) کی کتاب نظم کرنے کی برکت ہے۔ تم بھی کیوں نہیں شراب ترک کر دیتے۔''؟(21)

زمینی اور انسانی حسن کا شیدا

اگر پوچھا جائے کہ بابر مرزا کی شخصیت کا سب سے نمایاں اور سب سے تابناک پہلو کیا ہے تو اس کا ایک ہی جواب ہوگا۔ اس کی حسن پرستی۔ عجیب بات یہ ہے کہ حسن کی پرستش کا یہ جذبہ اس کے وجود میں بچپن سے کبرسنی تک اس کی حقیقت پسندی کی گود میں پلا بڑھا۔ عجیب اس لئے کہ ایسا اکثر نہیں ہوتا۔ خصوصاً پندرہویں اور سولہویں صدی میں حسن سے عقلی احساس وادراک کے حوالے سے کسی دانشور کا تشخص بہت دشوار تھا۔ وہ ایک ایسا عہد تھا جب تصوف، روحانیت اور مابعد الطبیعیات کے تصورات ہر جانب سے شاعروں اور فنکاروں کے ذہن پر سایہ ڈال رہے تھے۔ اور اس کی تخلیقی فکر کا رخ ماورائیت کی طرف موڑ رہے تھے۔ اسی طرح اخلاقی بندشیں بھی

---

1. آخری مصرعہ کا بالکل صحیح لفظی ترجمہ بابر کے الفاظ میں یہ ہوگا (مے ناب سے شست وشو کرتے ہیں۔ اس میں ضلع کا پہلو ہے۔)

مظاہر حسن سے انسان کے رشتوں پر اکثر منفی انداز سے اثر انداز ہوتی تھیں۔ بابر نے اس زمین پر بکھرے اور جنم لینے والے فانی مگر بے مثال حسن کے کرشموں کو نباتات، حیوانات، انسان اور دوسرے مظاہر کی صورت میں خود اپنی آنکھ سے دیکھا اور آنکا ہے۔ اسی طرح فنون لطیفہ، ادب و شعر، دلکش تعمیرات اور دلکشا باغات کے حسن و زیبائی کا بابر فریفتہ تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حسن کے جلوہ صد رنگ سے بابر کا رشتہ سپاٹ، اکہرا یک رخا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ فطرت اور انسانی حسن کی معمولی پرچھائیاں بھی اس کے وجود میں بڑی نازک اور لطیف کیفیتوں کو جنم دیتی تھیں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے بابر مرزا کے روزنامچہ کے حوالے سے ایک مضمون میں صحیح لکھا ہے:

''بابر فطرت کی چھوٹی چھوٹی سچائیوں کو پھیلا کر دیکھتا ہے چھوٹے سے جلوے کو وسیع تناظر میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ اور اس عمل میں ایک فنکار کی طرح جمالیاتی انبساط پاتا اور جمالیاتی آسودگی حاصل کرتا ہے۔ بہار میں باغ کو دیکھتا ہے تو ایک ایک پھول کی صورت اور رنگ پر اس کی نظر ٹھہرتی ہے۔ جانے کتنے رنگوں کا ذکر کرتا ہے۔ خزاں میں درختوں کے پتوں کے رنگوں کو جذب کرتا ہے، سبز، سرخ سبز اور دوسرے رنگوں سے کھیلتا ہے.....

غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اس کا اظہار بیان غضب کا ہے۔ حسن کی تعریف کرتے ہوئے اس کے جذبوں کا رنگ بھی نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ ایک فنکار کا دردمند دل لئے اس نے مظاہر حسن پر نظر ڈالی ہے۔ کیمپ فائر کے آتشیں نظارے کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے تاریک سمندر میں جھلملاتے ستاروں کا عکس پڑ رہا ہے۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنے شاعرانہ ذہن کو متحرک رکھتا اور کسی کھلتے ہوئے پھول کو بھی دیکھ لیتا تو اپنی پریشانیوں کو بھول کر اس کے حسن کو بیان کرنے لگتا ہے۔''(22)

فطرت کے بے امان حسن سے بابر کی شیفتگی کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ وادیء فرغانہ، وادیء کابل، شمال مغربی کوہستانی ہندوستان اور پھر دوآبہ کے شاداب میدان ان سب کا البیلا حسن بابر مرزا کے تخیل میں رچ بس گیا تھا۔ ایک منظر دیکھئے:

''دیہات جہاں ختم ہوتے ہیں وہاں پہاڑ کے دامن اور دریائے باران کے مابین دو جنگل پھیلے ہیں۔ ایک کا نام کرہ تاریاں اور دوسرے کا دشت

شیخ ہے اسی دامن کوہ میں کئی قسم کا لالہ اگتا ہے۔ میں نے ایک دفع اس لالہ کا شمار کیا تو بتیس تینتیس قسم کے پھول کھلے تھے۔ ان میں ایک طرح کے ایسے بھی پھول تھے جن سے گلاب کی خوشبو آتی ہے۔ میں نے اسی نسبت سے اسے ''لالہ ءگل بو'' کا نام بخشا۔''

'باغ صفا' کی تعمیر کا یہ محرک دیکھئے:

''میں نے پیش قدمی کی اور نماز ظہر کے وقت کلاہ کنار میں جا پہنچے۔ جس کے قریب ایک بڑا سا تالاب واقع ہے۔ یہ تالاب تقریباً تین میل کے رقبے میں پھیلا ہے۔ جو بارش کے پانی سے عموماً بھرا رہتا ہے۔ اس تالاب کے قریب ایک مرغزار بھی ہے۔ ایک ندی بھی ہے۔ اور دامن کوہ میں ایک چشمہ بھی پھوٹتا ہے۔ یہ جگہ اور اس کا ماحول مجھے بہت پسند آیا۔ اس لئے میں نے یہاں ایک باغ لگوایا اور اس کا نام 'باغ صفا' رکھا۔''(23)

بابر ایک صاحب طرز نثر نگار تو تھا ہی، خاکہ نگاری میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ جن لوگوں سے وہ مانوس تھا ان کی شبیہ چند الفاظ میں اس طرح تراش دیتا ہے کہ قاری کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتی۔ خاکہ میں وہ انسان کی منفرد خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی بشری کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک معروضی ڈھنگ سے وہ دونوں میں ایک حسن آفریں تال میل اور توازن پیدا کر دیتا ہے۔ نہایت چھوٹے چھوٹے سبک حملوں میں جن میں ایک دلکش آہنگ ہوتا ہے وہ ایک جاندار تصویر بنا کر سامنے رکھ دیتا ہے۔ اپنے ایک درباری امیر سید علی دربان کی وفات پر لکھتا ہے:

''میں نے اس کے ساتھ بہت مہربانیاں کی تھیں۔ جب جہانگیر مرزا غزنی چھوڑ گیا تو غزنی کی حکومت میں نے اس کے سپرد کر دی۔ آدمی اچھا تھا، اخلاق بھی پسندیدہ تھے۔ یاروں کا یار اور تلوار کا دھنی تھا۔ کفایت شعاری بھی کرتا، لیکن ایک حد تک جس سے وضع قائم رہتی۔ خوش خُلق اور ہنس مکھ تھا۔ بذلہ سنجی سے کام لیتا۔ مذاق بھی کرتا۔ لیکن اس کا مذاق برا نہ لگتا۔ البتہ ایک بڑا عیب تھا جھوٹ بھی بولتا اور بدکاری بھی خوب کرتا۔ مذہب کا

پابند نہ تھا اور نہ ہی مخلص تھا۔ منافقت کی باتیں کرتا تھا۔ یہی عیب اس کی موت کا سبب بنا۔ اس نے شاد بیگ اور بدیع الزماں مرزا سے کچھ ایسی منافقانہ باتیں کیں کہ انہوں نے اسے دریا میں پھینک دیا۔'' (24)

بابر مرزا نے اگرچہ موسیقی، مصوری فن تعمیر اور ادب و شعر کے بارے میں باضابطہ تعلیم و تربیت حاصل نہیں کی تھی لیکن قدرت نے اسے جو احساس جمال اور ذوق صحیح بخشا تھا۔ اپنے مطالعہ اور مشاہدہ سے اس نے خود ہی اس کی تہذیب و تربیت کی اور جملہ فنون یہاں تک کہ فن عروض و بلاغت میں بھی ایسی مہارت پیدا کر لی کہ ان کے بارے میں اپنے خیالات کو پورے اعتماد اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ بیان کرتا تھا۔ ازبکستان کے ممتاز تاریخ داں الیاس ہاشیمو لکھتے ہیں:

''بابر نے ترکی موسیقی کے موضوع پر بھی ایک کتاب لکھی جو فن موسیقی پر عصر حاضر کی کتابوں سے بھی زیادہ معیاری ہے..... وہ خود بھی نغمہ نگاری کرتا اور دھنیں بناتا تھا۔'' (25)

ہرات کے سلطان حسین مرزا بائیقرا کے دربار میں مشہور عالموں کے ساتھ ساتھ ہر فن کے صاحب کمال فنکار جمع ہو گئے تھے۔

بابر نے ان میں سے بعض کے بارے میں نہایت بے تکلف اور شگفتہ اسلوب میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں:

''اس دور کے شعراء خراسان میں مولانا عبدالرحمٰن جامی سرفہرست ہیں۔ ان کے بعد شیخ سہیلی، حسن علی، طفیل جلا مگر درجہ اول کے شعرا تھے۔ غزل گو شعراء بھی آصفی بڑا شاعر تھا۔ اس کے اشعار بامعنی بھی ہوتے ہیں اور لطیف بھی۔ اس نے عشقیہ اشعار بھی کہے ہیں۔ اور صوفیانہ رنگ بھی اختیار کیا ہے۔ اس نے غزل کے علاوہ کسی اور صنف سخن میں بہت کم شعر کہے ہیں۔ جب میں خراسان پہنچا تو اس نے مجھ سے ملاقات کی۔ بنائی بھی اسی زمانے کے اچھے شعرا میں شامل کیا جاتا ہے۔ ہرات کا رہنے والا ہے۔ چونکہ اس کے باپ کا نام استاد محمد بنا تھا، اس لئے اس نے اپنا نام بنائی رکھا۔ وہ بھی غزل کہتا ہے۔ غزل میں عشقیہ اشعار کے ساتھ

صوفیانہ رنگ کے اشعار بھی کہے ہیں۔صاحب دیوان ہے۔
اس نے کئی مثنویاں بھی کہی ہیں۔شروع میں علم موسیقی سے واقفیت نہ تھی جس کی بنا پر اس کا رقیب شاعر علی شیر بیگ اسے طعن کرتا۔ایک بار مرزا سلطان حسین ہری میں آئے اور موسم سرما وہاں گزارا، تو شاعر بنائی نے موسیقی کا سامان حاصل کیا۔مرزا لوٹ کر گئے تو شاعر بنائی نے انہیں کئی راگ سنائے۔شیر علی بیگ دنگ رہ گیا۔اور بڑی تعریف کی، بنائی نے جو راگ بنائے ان میں سے ایک کا نام نورنگ رکھا جس میں نورنگ تھے۔علی شیر بیگ کا چراغ اس کے سامنے نہ جلا، اور بے چارہ دربار میں نہ رہ سکا۔ اور عراق میں پناہ لی۔آذربائیجان پہنچا اور یعقوب بیگ کے دربار میں رسائی پائی۔یعقوب بیگ کی موت کے بعد آذربائیجان سے بھی رخصت ہوا اور پھر ہری میں مرزا کے دربار میں لوٹ آیا۔اب بھی اس کی خوش مزاجی کا پہلا سا عالم تھا اور پہلے ہی کی طرح ظریف ہے۔ایک بار شطرنج کھیلتے وقت اس طرح پاؤں پھیلائے کہ شاعر بنائی کے کولہوں تک بڑھا دیئے۔اور ہنس کر بولا ہری میں یہ عجیب بات ہے کہ اگر پاؤں پھیلا دو تو شاعر کے کولہوں تک پہنچ جاتے ہیں۔بنائی نے بھی طنز کی۔اگر سمیٹ بھی لو تو بھی شاعر کے اسی مقام تک پہنچو گے۔''

آسی غزل گو، اچھی غزل کہتا تھا پہلے کہیں اور تھا آخر عمر میں سلطان حسین مرزا کے دربار کا رخ کیا۔آہی صاحب دیوان ہے۔

محمد صالح، غزل گو شاعر تھا۔آخر دور میں شیبانی خاں کے دربار سے تعلق ہوا۔اچھی غزلیں کہتا تھا۔مگر اشعار میں جتنی لطافت ہوتی، اتنی بندش چست نہ ہوتی، فارسی کے علاوہ ترکی زبان میں بھی شعر کہہ لیتا تھا۔شیبانی خاں کے نام پر ایک مثنوی بھی معنون کی۔جو لیلیٰ مجنوں کے وزن رمل مسدس میں کہی ہے۔مثنوی معیاری نہیں ہے۔

شاعر حسین کامی بھی اسی دربار کا شاعر تھا۔اچھے شعر کہہ لیتا تھا۔زیادہ تر غزلیں کہتا۔ممکن ہے اس کا دیوان بھی ہو، ایک مثنوی بھی کہی ہے جو معیار سے گری ہوئی ہے اس شخص کا حافظہ بہت

اچھا تھا۔ چالیس ہزار اشعار یاد تھے۔ علم عروض و قافیہ میں بھی دسترس تامہ حاصل تھی۔ صاحب دیوان ہے۔

حسین مرزا کے دربار میں کئی اچھے خطاط بھی تھے جن میں سلطان علی مشہدی سب سے بازی لے گیا تھا۔ وہ خط نسخ و نستعلیق دونوں میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اس نے سلطان حسین مرزا اور علی شیر بیگ کے لئے بہت سی کتابیں رقم کیں۔

مصوروں میں بہزاد اور شاہ مظفر زیادہ مشہور ہوئے۔ مذکور الصدر کی نسبت ثانی الذکر زیادہ بڑا اور اچھا مصور تھا۔

گویّے: اس دربار کے گویوں میں خواجہ مروارید بڑا اچھا سازندہ تھا۔ قل محمد غوری غشیر ک بجانے میں بڑی مہارت رکھتا۔ اس جیسا ستار شاید ہی کسی نے اس سے پہلے بجایا ہو۔ شیخ نائی بھی عود اور غشیر ک بجانے میں بڑا ماہر تھا۔ ایک بار بدیع الزماں مرزا کے دربار میں قل محمد جو غشیر ک بجا نہ سکا۔ اسے شیخ نائی نے خوب بجایا اور فن کا حق ادا کر دیا۔

شاہ قل غشیر کی بھی غشیر ک بجانے میں بڑا صاحب کمال تھا۔ عراق کا باشندہ تھا لیکن خراسان میں آن کر اس فن کی تعلیم پائی تھی۔

حسین عودی: عود بھی خوب بجاتا اور گاتا بھی خوب تھا۔ ناز بہت کرتا تھا۔ شیبانی خان نے اسے مروا دیا۔'' (26)

بابر کی شاعری کا بڑا حصہ حسن و عشق کی واردات اور معاملات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک طرف اگر وصل کی شاد کامیاں ہیں تو دوسری طرف ہجر کے ایام کی کلفتوں کا بیان بھی 'شاعر کی شدت احساس کا آئینہ دار ہے۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے نسوانی حسن کی کشش اور کرشمہ زائی کا احساس بابر کو کابل کی فتح کے بعد ہوا۔ مے نوشی کی پراسرار لذتوں سے بھی وہ اسی عہد میں آشنا ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان دونوں مشغلوں میں بابر نے اپنی محرومی اور نا آسودگی کا مداوا تلاش کر لیا تھا۔ اس کے محل میں چھیانوے خواتین کا سراغ ملتا ہے۔ بے شک کچھ اس کی بیگمات تھیں۔ جیسے ماہم بیگم، زینت بیگم، دلدار بیگم، اور آغچہ بیگم اس کی معزز بیگمات تھیں۔ جو اعلیٰ تیموری خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں کچھ خواتین رشتہ دار بھی ہوں گی۔ لیکن ان میں ایک بڑی تعداد بابر کی محلات کی تھی۔ مبارکہ بیگم سے تو اس نے عشق کیا تھا۔ بعد میں بھی فوجی مہمات کے زمانہ میں اس سے دوری کا احساس بابر کو

تڑپا تا رہا اور اس کی جدائی میں وہ شعر لکھتا رہا۔

بابر نے اگر چہ تزک میں نسوانی حسن سے اپنی شیفتگی کا حال کم لکھا ہے لیکن اس کی شہادت ملتی ہے کہ آخر عمر میں یعنی آگرہ کے چار سالہ قیام کے دوران بھی وہ نسوانی حسن کے حلقہ کشش سے دور نہیں ہوا تھا۔

ایران کے شاہ طہماسپ نے 1526ء میں بابر کو دو گل اندام سیم تن دوشیزائیں گلنار اور نارگل بطور تحفہ بھیجی تھیں۔ جو شاہی محل میں ہی رہتی تھیں اور بابر کی بڑی بیگم ماہم کی نگرانی کے باوجود انہیں میں سے کوئی ایک، رات کو بابر کی خواب گاہ میں حاضری دینا نہیں بھولتی تھی۔

بابر حقیقت پسند، دانش منداور دور اندیش ضرور تھا لیکن نجی رشتوں میں وہ جذباتی اور وضع دار بھی تھا۔ اپنے عزیز واقربا پر وہ جان چھڑکتا تھا۔ اسی طرح اپنی منظور نظر خواتین کو بھی بے حد عزیز رکھتا تھا۔ پیار کے رشتہ کو وہ نبھانا جانتا تھا۔ اس کی شاعری میں بھی جن حسینوں اور محبوباؤں کے پیکر ابھرتے ہیں وہ بھی باوفا اور ایثار نفس ہیں۔ بابر ان کے ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ ان کی باطنی خوبیوں کی بھی داد دیتا ہے۔

بابر کے ذوق جمال کی داستان اس کے تمام مشغلوں اور تمام تحریروں میں بکھری ہوئی ہے۔ فن شاعری کی طرح نثر کے بارے میں بھی اس کا اپنا موقف تھا۔ اپنی تصانیف خصوصاً 'تزک' میں ابتدا سے آخر تک اس نے جو نثری اسلوب اختیار کیا ہے وہ منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ دلکش اور معیاری بھی ہے۔ ہر چند کہ تزک اس نے مختلف اوقات میں لکھی اور زمانہ قیام آگرہ میں اس پر نظر ثانی بھی کی لیکن اٹھارہ سال کی اس خود نوشت میں سادگی کے پہلو بہ پہلو بے مثل ہمواری، روانی اور دلکشی ہے۔

جیسا کہ پچھلے اوراق کے اقتباسات سے ظاہر ہے بابر نے تشبیہ واستعارہ سے بھی کام لیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی تلمیحات کو بھی سلیقہ سے برتا ہے۔ یہی نہیں اس کی نثر میں ایسے آہنگ کا احساس ہوتا ہے جو شاعری کی طرح قاری کو مسرت بخشتی ہے۔ معیاری نثر کے سلسلہ میں بابر کا وہ خط بڑی اہمیت کا حامل ہے جو اس نے اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کو اس کے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا۔ لکھتا ہے:

''مجھے اس خط کا مطلب نکالنے میں کافی دردسری ہوئی.....ابہام کی وجہ

سے خط کا مطلب واضح نہیں ہوتا اور اس کا سبب مسجع لفاظی ہے۔ آئندہ
الفاظ (کے استعمال) میں تکلف اور تصنع سے پرہیز کرو۔ جو کچھ کہنا ہے
صاف صاف لکھنا چاہئے۔'' (27)

پانچ سو سال قبل بابر نے معیاری اور خوبصورت نثر کا جو تصور پیش کیا تھا وہ آج بھی پوری معنویت رکھتا ہے۔

بابر اور گرونانک

درویشوں اور صوفی سنتوں سے بابر مرزا کی عقیدت ابتدا سے آخر تک قائم رہی۔ واقعات شاہد ہیں کہ یہ عقیدت رسمی نہیں بلکہ پُرخلوص اور گہری تھی۔ وہ مسلمان فقیروں اور ہندو جوگیوں دونوں کو تعظیم دیتا تھا۔ دوسری طرف ڈھونگی مُلاؤں کی قلعی بھی کھولتا تھا۔ گوالیار کی سیر کو گیا تو وہاں کے عالیشان محلات کے ساتھ پتھر سے تراشی ہوئی مورتیوں کو بھی نظر استحسان سے دیکھا۔ الغرض عقیدہ کے اعتبار سے بابر مرزا خاصہ روادار، وسیع المشرب اور کشادہ دل تھا۔

1520ء میں جب بابر چوتھی بار ہندوستان کے شمالی مغربی علاقہ پر حملہ آور ہوا تو پنجاب کے سید پور (ایمنا باد) پر بھی فوج کشی کی۔ وہاں کے حاکم اور شہریوں نے مدافعت کی۔ لیکن بابر کے فوجی دستوں نے کئی ہزار مقامی لوگوں کو قید کر لیا اور ان کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ سکھ لٹریچر خصوصاً ساکھیوں میں اس روایت کا بیان ہے کہ قید ہونے والوں میں گرونانک دیو اور ان کا چیلا مردانہ بھی تھا۔ قیدیوں سے چکی پسوائی گئی تو لوگوں نے دیکھا کہ گرونانک کی چکی اپنے آپ چلتی اور آٹا پیستی ہے۔ اس کراماتی واقعہ سے بابر کو باخبر کیا گیا وہ درویشوں کی روحانی طاقت کو مانتا تھا۔ وہ خود قید خانہ میں آیا اس نے گرونانک کو دیکھا تو ان کے نورانی چہرہ پر اسے خدا کا جلوہ نظر آیا۔ روایت ہے کہ وہ گرو کے قدموں میں گرا اور کہا کہ وہ جیسی ہدایت دیں گے ویسا ہی ہوگا۔ گرو نے خواہش ظاہر کی کہ تمام گرفتار قیدیوں کو رہا کیا جائے اور ان کا لوٹا ہوا مال واپس کر دیا جائے۔ بابر نے گرونانک کی خواہش کے مطابق تمام قیدیوں کو رہا کر دیا اور ان کا مال واپس کر دیا۔[1] پنجابی ادب کے ممتاز پروفیسر ایس ایس نور نے مجھے بتایا کہ ادی گرنتھ میں بابر بانی نام کے چار شبد ملتے ہیں۔

---

1. اس کی کچھ تفصیل خورشید مصطفےٰ رضوی کی تصنیف ''بابر'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جن میں گرونانک نے ہندوستان پر بابر کے حملے اور اس کے سپاہیوں کی لوٹ مار کی مذمت کی ہے۔ پروفیسر نور کا کہنا ہے کہ پنجابی ادب میں پہلی بار یہاں ہندوستان کا لفظ استعمال ہوا اور یہ شبد پنجابی میں سیاسی شاعری کا بھی پہلا نمونہ ہیں۔ جہاں تک اس واقعہ کے کراماتی پہلو کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ یہ گرونانک سے عوام کی عقیدت کا کرشمہ ہے۔ تاہم پروتھم جنم ساکھی اور بعض مورخوں کے بیان سے یہ بات واضح ہے کہ بابر کی فوج کشی کے وقت گرونانک وہاں موجود تھے اور گرفتار بھی ہوئے۔ لیکن ان کی اور بابر کی ملاقات ثابت نہیں ہوتی۔ بالعموم اس طرح کی روایات (Myths) میں کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔ بابر چونکہ درویشوں اور صوفیوں سے گہری عقیدت رکھتا تھا اس لئے اس میں کچھ سچائی بھی ہوسکتی ہے۔

بابر اور اجودھیا کی مسجد

اجودھیا میں شہید کی جانے والی مسجد کا تنازعہ پیچیدہ ہے اور فی الوقت عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں البتہ حال ہی میں بابر مرزا کا روز نامچہ ''تزک بابری'' اور اس کے بارے میں دوسری ان گنت تحریریں جو میرے مطالعہ میں آئیں ان کی روشنی میں یہ بات اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ بابر کے نام کو اس مسجد یا تنازعہ سے جوڑنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جن مورخوں نے بابر کے کردار و گفتار اور طریق عمل کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے مثلاً پروفیسر آر۔ ناتھ، پروفیسر سوشیل سریواستوا، پروفیسر ہربنس مکھیا، پروفیسر محب الحسن اور 'بابر نامہ' کی مترجمہ اینٹی سوسانہ بیوراج انہوں نے صاف انکار کیا ہے کہ مذکورہ مسجد بابر کے فرمان یا ایماء سے بنائی گئی تھی۔ اب یہ بات بھی کھل کر سامنے آچکی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور یکجہتی کو توڑنے کے لئے برطانوی حکام اور ان کے اشارہ سے کچھ مورخوں نے یہ سارا فتنہ اٹھایا تھا۔[1]

مسجد کے اندرونی کتبہ کے مطابق مذکورہ مسجد کی تعمیر 935ھ میں مکمل ہوئی اور اسی سال یکم جمادی الاوّل 935ھ کو بابر مرزا نے اپنی وصیت پر دستخط کئے۔ اس میں وہ اپنے جانشین ہمایوں کو

---

[1] تفصیل کے لئے سری واستوا کی کتاب Disputed Mosque کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

مخاطب کر کے کہتا ہے۔

''تم پر لازم ہے کہ تم اپنی لوحِ دل سے، تمام مذہبی تعصبات کو مٹا دو اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو۔ تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو۔ اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کر سکو گے۔ پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی۔ جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے اُس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرنا۔ عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔''(28)

کیا اپنے ولی عہد کو ایسی تاریخی نصیحت کرنے والا بادشاہ اسی زمانہ میں اپنے عمل سے اسے رد کر سکتا تھا یہ بابر کے کردار کے منافی تھا۔ بابر نے اپنی تزک میں ہندوستان پر اپنے حملوں کی تفصیلی روداد لکھی ہے۔ آگرہ میں قیام کے دوران بھی (اپنی زندگی کے آخری چار برسوں میں) وہ اپنی تزک لکھتا رہا اور اس میں اپنی اور اپنے وزیروں اور کبیروں کی سرگرمیوں اور منصوبوں کا احوال بھی درج کرتا رہا۔ ٹھیک اسی زمانہ میں اس کے نام سے منسوب ہونے والی ایک اہم مسجد اس کے ایک معتمد امیر اور حاکم میر باقی نے تعمیر کروائی اور اس کی تزک میں اس کا کوئی ذکر، کوئی حوالہ نہیں۔ یہ بہت حیران کن بات ہے۔ کنواہا کی عظیم فتح کے بعد بابر کے امراء اور وزراء نے اس کو جو خراج جو خطاب دیئے مثلاً ''غازی'' کا خطاب ان سب کا ذکر بابر نے تزک میں فخر و مسرت سے کیا ہے۔ پھر اجودھیا کی اس مسجد کا ذکر (جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کنواہا کی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر ہوئی) تزک میں کیوں نہیں ملتا؟ کم از کم اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بابر کو اس کی تعمیر سے کوئی دلچسپی اور سروکار نہیں تھا۔

یہ بات ہندوستان میں کم لوگ جانتے ہیں کہ وسطی ایشیا کے شہروں میں عہد قدیم میں جو مسجدیں تعمیر کی گئیں خصوصاً بخارا اور سمرقند جیسے تاریخی شہروں میں، ان کے بیرونی دروازوں پر دونوں جانب دو ببر شیروں کی تصویریں ملتی ہیں۔ سمرقند میں مشہور صوفی بزرگ اور بابر کے ممدوح خواجہ احرار ولی کے مزار کے احاطے میں جو شاندار مسجد اور مدرسہ ہے اس کے عالیشان گیٹ پر دوڑتے شیروں کے درمیان میں بھاگتے ہوئے ہرنوں کی تصویریں بھی ابھی تک دیکھی جا سکتی

ہیں۔ (جانداروں کی یہ شبیہیں سراسر شریعت کے خلاف ہیں) دراصل یہ وسط ایشیائی تہذیب پر گہرے ایرانی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ایرانی ثقافت میں شیر کو قوت و جبروت کی علامت مانا گیا ہے۔ اس لئے میر باقی نے، جو مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے اس مسجد کے دروازے کو بھی ببر شیروں کی تصویروں سے آراستہ کرایا تھا۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ بابر کے معنی بھی شیر کے ہوتے ہیں اور اس طرح یہ مسجد ببری یا بابری کے نام سے مشہور ہوئی۔ ورنہ بالعموم وسطی ایشیا میں بھی مسجدوں کو کسی شخص کے نام سے منسوب نہیں کیا جاتا۔ اس میں کچھ مستثنیات ہوسکتی ہیں۔ جیسے تاشقند میں ایک عالیشان مسجد، مسجد ِطلا شیخ کے نام سے مشہور ہے۔ تاشقند یونیورسٹی سے متصل کوچہء مرزا غالب میں تعمیر ہونے والا ایک مدرسہ اور مسجد دونوں مرزا غالب کے نام سے موسوم ہوئے۔

جان لیڈن اور کچھ دوسرے انگریز مورخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بابر خود اجودھیا گیا تھا۔ اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ اس کے صرف اودھ میں گھاگھرا ندی کے ساحل تک پہنچنے کی شہادت ملتی ہے۔ 'بابر نامہ' کی مترجمہ مسز سوسانا بیورج نے بھی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

الغرض تاریخی شواہد کی روشنی میں جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ صاف کہتے ہیں کہ اجودھیا میں شہید کی جانے والی مسجد کا شہنشاہ بابر سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

ہندوستان کی زبانوں سے رشتہ

ہندوستان سے بابر مرزا کا رابطہ صرف پانی پت کی فتح 1526ء کے بعد چار پانچ سال کے زمانہ تک محدود نہیں تھا بلکہ 1505ء کے بعد، وہ وقفہ وقفہ سے برابر ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں پر فوج کشی کرتا رہا۔ پنجاب اور سندھ کے بہت سے کوہستانی اور میدانی علاقوں میں اس نے وقت گزارا اس کی تفصیل تزک میں موجود ہے۔ اس لئے ہندوستانی رسم و رواج، تہذیب اور زبانوں سے اس کی واقفیت بڑھتی گئی۔ بابر کے یہاں تلاش و جستجو کا ایک طبعی میدان تھا اور وہ نئے ماحول میں، نئی اشیاء اور مناظر کو دیکھ کر نہ صرف بچوں کی طرح حیران ہوتا تھا۔ بلکہ ان سے حظ و مسرت بھی حاصل کرتا تھا ''تزک بابری'' کے بے شمار بیانات اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں۔

میرے ایک شاگرد ڈاکٹر انصار الدین نے دو سال قبل ڈاکٹریٹ کے لئے ''تزک بابری'' کا انتخاب کیا۔ وہ ترکی کے علاوہ اردو کے بھی معتبر اسکالر ہیں۔ موصوف اپنے ایک حالیہ مقالے میں

لکھتے ہیں۔

''ہماری تحقیقات کے نتائج کے مطابق بابر نامہ میں اردو، ہندی یا ہندوستانی کے چار سو بارہ الفاظ موجود ہیں۔

جن کو سات گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی (۱) جانوروں کے نام 26 الفاظ، (۲) پیڑ پودوں کے نام 39 الفاظ، (۳) پیائش اور وزن کرنے کی اصطلاحات 19، (۴) موسم ہفتہ کے دن وغیرہ 19، (۵) دوسرے متفرق اسما 38، (۶) جغرافیائی الفاظ 206، (۷) اشخاص کے نام 65-(29)

مذکورہ 412 الفاظ بابر نامہ میں کل ملا کر 2376 بار استعمال ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر انصار الدین نے ان الفاظ کے استعمال کی Frequency بھی دی ہے۔ یعنی کون سا لفظ کتنی بار استعمال کیا گیا۔[1]

بابر نے اگر اتنے سارے ہندوستانی الفاظ کو حسب ضرورت 'تزک' میں آزادی اور اعتماد سے استعمال کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مزید بے شمار الفاظ اس نے سیکھے اور برتے ہوں گے جو تحریر میں نہیں تو گفتگو میں وہ ضرور استعمال کرتا ہوگا۔ اس کے شواہد موجود ہیں کہ بابر بال ناتھ جوگی اور دوسرے جوگیوں سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے انتظامی عہدے مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کو دیئے تھے۔ اس کا ذکر 'تزک' میں بھی ملتا ہے۔ فطری بات ہے کہ ہندوستانی عہدہ داروں اور عمائدین سے اس کے رابطے ضرور ہوں گے۔

ملک میں نشو ونما پانے والی ہندوستانی زبان سے بابر کی اس دلچسپی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے اردو یا ہندوستانی میں بھی شعر کہے۔ کم از کم ایک شعر خود اس کے مرتب کردہ دیوان میں ملتا ہے۔

بابر کا اردو شعر

رضا لائبریری رامپور میں 'دیوان بابر' کا ایک قدیم نسخہ محفوظ ہے۔ جو زندگی کے آخری دور میں خود بابر نے مرتب کیا تھا۔ ترقیمہ میں لکھا ہے۔ ''دیوان ہند دوشنبہ کے دن 15- ربیع الآخر

---

[1] مقالہ کا مسودہ میرے پاس ہے جو جلد ہی شائع ہوگا۔

535ھ پر ختم کیا گیا۔'' یعنی 28 دسمبر 1528ء کو۔ بابر شناس ای۔ڈینی سن راس (E-Dennison Ross) نے 1910ء میں اس نسخہ کو اپنے ایک پیش لفظ کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع کیا۔ بعد میں یہی نسخہ پروفیسر صباحت عظیم جانووا نے اپنے مقدمہ کے ساتھ تاشقند سے شائع کیا۔ اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ شاہجہاں کے کتب خانہ کی زینت رہا۔ ترقیمہ کے بعد اس میں بابر کی ایک ترکی رباعی کے دو مصرعے خود بابر کے اپنے خط میں لکھے ہوئے ہیں۔ نیچے شاہجہاں بن جہانگیر نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔

''ایں رباعی ترکی و اسم مبارک بتحقیق خط آنحضرت
فردوس مکانی بابر بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ است۔''

اس تحریر کے نیچے شاہجہاں کے اپنے دستخط ہیں۔ مرتب ڈینی سن راس نے اس کے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھا ہے۔ ''میں یہاں ایک خاص بات کی طرف توجہ مبذول کرانے سے باز نہیں رہ سکتا جو شاید اس مجموعہء اشعار کا سب سے عجیب شعر ہے۔ یعنی وہ جو پلیٹ نمبر xvii اور ص 16 پر ہے۔ اس میں ایک ہی مصرع میں ترکی اور اردو کا نادر اشتراک نظر آتا ہے۔''(30)

شعر درجہ ذیل ہے:۔

مج کو نہ ہوا کچھ ہوسِ مونک و موتی
فقر اہلیگا بس بولغوسی پانی وروتی

ترجمہ: مجھ کو مانک و موتی (حاصل کرنے) کی کوئی خواہش نہیں (اس لئے کہ) فقیر کے لئے پانی اور روٹی بس (کافی) ہے۔

اس شعر میں تقریباً ڈیڑھ مصرع تو اردو میں ہے اور نصف کے قریب چغتائی ترکی ہیں۔

بہر حال اس نسخہ کا استناد اتنا مصدقہ ہے کہ اس شعر کی بابر سے نسبت پر شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور یہ ہندوستان کی اس زبان سے بابر کی گہری دلچسپی پر بھی دلالت کرتا ہے۔

بابر کی شاعری

بابر کی خودنوشت کا آغاز اس کی تاجپوشی (1494ء) سے ہوتا ہے اور اس کی وفات (1530ء) تک جاری رہتا ہے۔ یہ زمانہ چھتیس سال پر محیط ہے۔ لیکن 'بابر نامہ' کا جو متن ملتا ہے

اس میں صرف اٹھارہ سال کی زندگی اور سرگرمیوں کا بیان ہی ہے۔ یعنی تاجپوشی کے بعد کی صرف نصف زندگی ہی اس میں سما سکی ہے۔ تاہم بعض اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خودنوشت کے جس زمانہ کے صفحات غائب ہیں اُس زمانہ میں بھی بابر تزک لکھتا رہا ہے۔ لیکن اس عہد کا متن محفوظ نہیں رہا۔

ڈاکٹر نصار الدین ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

> ''بابر نامہ کے اصل (مکمل) مخطوطہ کو آخری بار ستر ہویں صدی کے شروع میں شاہجہاں کے کتب خانے میں 'بادشاہ نامے' کے مصنف نے دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا اور وہ نسخہ اب تک کہیں دستیاب نہ ہو سکا۔''[1] (31)

اسی طرح کابل کی فتح 1501ء کے قریب بابر نے جو 'خط بابری' ایجاد کیا تھا اور جس خط میں بابر نے قرآن پاک کی مکمل کتابت کر کے ایک نسخہ مکّہ کو بھیجا تھا اس کا بھی تقریباً ساڑھے چار سو سال تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ لیکن حال ہی میں مشہد کی محمد رضا لائبریری میں یہ نسخہ دستیاب ہو گیا ہے۔ اسی طرح بابر شناس یہ اُمید لگائے ہیں کہ 'تزک بابری' کا اصل نسخہ بھی کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔

بابر کی شعر گوئی کے بارے میں قیاس یہ ہے کہ اس نے چودہ پندرہ سال کی عمر میں فارسی اور چغتائی ترکی، دونوں زبانوں میں شعر کہنا شروع کیا۔ اس کے حوالے تزک میں ملتے ہیں۔ لیکن یہ زمانہ رستاخیز کا زمانہ تھا جب بابر مرزا حکمراں ہوتے ہوئے ایک طرح کی خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس لئے ایسا لگتا ہے کہ اس زمانہ کا بیشتر کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ بعد میں بھی شاید بابر نے اپنے کلام کو دیوان کی شکل میں ردیف وار مرتب کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ جہاں تک فارسی کلام کا تعلق ہے 'تزک' کے علاوہ 'اکبر نامہ'، 'بزم تیموریہ' اور کچھ دوسرے تذکروں میں کچھ اشعار اور رباعیات مل جاتی ہیں۔ رامپور کے دیوان بابر میں بھی فارسی کی چند رباعیات ہیں لیکن فن شاعری، بلاغت اور علم عروض پر اس کی جو نظر تھی۔ اساتذۂ فن اور معاصرین کے کلام کا مطالعہ بابر نے جس خوش ذوقی اور دلجمعی سے کیا تھا اس کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کے مطالعہ، دلچسپی

---

1. مضمون کا مسودہ راقم الحروف کے پاس ہے جو جلد شائع ہوگا۔

اور تخلیقی اظہار کا اصل وسیلہ شاعری ہی تھا۔

اس میدان میں کبھی کبھی موج آ جائے تو وہ اپنی مہارت اور قادرالکلامی کے کرتب بھی دکھاتا تھا۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ 'میں نے عروض پر رسالہ لکھنے کے بعد ایک سولہ (16) فٹ لمبا شعر لکھا تھا۔'

رامپور کے نسخہ کی ایک رباعی یہ ہے۔

در ہوائے نفس گمراہ عمر ضائع کردہ ام
پیش اہل اللہ از افعال خود شرمندہ ام
یک نظر بامخلصانِ خستہ دل فرما کہ ما
خواجگی را ماندہ ام ای خواجگی رابندہ ام

'بابرنامہ' کی مترجمہ سوسانہ بیورج نے ترجمہ کے آخری ضمیمہ میں لکھا ہے کہ اسی مضمون کی بابر کی ایک رباعی اکبرنامہ میں بھی نقل ہوئی ہے وہ رباعی بھی درج کی ہے۔

اسی طرح فارسی میں بابر کے جو اشعار ملتے ہیں اسی مضمون کے اشعار، معمولی فرق کے ساتھ، اس کے ترکی کلام میں بھی نظر آتے ہیں۔ چند فارسی اشعار دیکھئے۔

اے ماہ شامِ وصل تو صبح سعادت است
روزِ جدائی تو ولے شامِ محنت است

خالے کہ دادہ ای برخِ لالہ گونِ خویش
برجانِ بے دلانِ تو آں داغِ حسرت است

گر ریخت یار خونِ تو زنہار دم مزن
خوش باش بابرا کہ ہمیں دم غنیمت است

ہیچ کس چوں من، خراب و عاشق و رسوا مباد
ہیچ محبوبے چو تو، بے رحم بے پروا مباد

خواجہ کلاں بابر کا معتمد اور دوست تھا۔ جسے بابر نے بجّور کا حاکم بنا کر بھیج دیا تھا۔ لیکن اس کی

جدائی سے دکھی ہوا تو اسے یہ اشعار لکھ کر بھیجے۔

قرار و عہد بہ یارا ایں چنیں نہ بود مرا
گزید ہجر و مرا کرد بے قرار آخر
بہ عشوہ ہائے زمانہ چہ چارہ ساز دکس
بجور کرد جدا یار را زیار آخر

ترجمہ کے حصہ میں قارئین ترکی چغتائی سے ترجمہ کئے ہوئے ایسے متعدد اشعار دیکھیں گے جو فارسی اشعار کے ہم معنی ہوں گے۔

دراصل سوویٹ دور میں شہنشاہ بابر یا دوسرے وسط ایشیائی حکمرانوں کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں تحقیقی اور علمی کام بہت دیر میں شروع ہوا۔ اس تاخیر اور بندش کے پیچھے کچھ نظریاتی اور سیاسی اسباب تھے جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ امیر تیمور اور اُلغ بیگ کی طرح بابر مرزا بھی ازبیک عوام کے دلوں پر حکمراں رہا ہے نہ صرف اس لئے کہ وہ جنگ کے میدان میں سورما اور عالمگیر شہرت کے فاتح تھے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ایک انسان اور علم وفن کے سرپرست کی حیثیت سے بھی ان کی شخصیتوں میں غیر معمولی رفعت اور کشش تھی۔ علم وفن کے میدان میں یا پھر عظیم الشان عمارتوں اور خوشنما باغات کی تعمیر میں انہوں نے جو یادگار کارنامے انجام دیئے وہ ساری دنیا کے تہذیبی سرمایہ کا ایک حصہ بن گئے۔ ان سے پہلے موسیٰ الخوارزمی، البیرونی، امام بخاری، بوعلی ابن سینا، علی شیر نوائی امام ترمذی، الفرغانی اور دوسرے ایسے اکابر علما پیدا ہوئے جنہوں نے وسطی ایشیا کی اس زمین کے نامور فرزند کی حیثیت سے اس کا نام روشن کیا۔

بابر مرزا کی شخصیت میں ابتدا سے کچھ ایسے رومانوی عناصر پرورش پا رہے تھے جن کی وجہ سے اس کی شخصیت دوسروں سے کچھ زیادہ مقبول اور محبوب بن گئی۔

جہاں تک چغتائی ترکی میں بابر کے کلام کا تعلق ہے جو کچھ دستیاب ہوا وہ زیادہ نہیں۔ 1982ء میں ازبیک عالم سعید بیگ حسنو نے، کلاسکی ورثا سیریز کے تحت بابر مرزا کا جو کلام مرتب کر کے شائع کیا۔ اس میں کل ایک سو اٹھارہ (118) غزلیں اٹھانوے (98) رباعیات، انیس قطعات ترپین معمے، ترپین فردیات اور کچھ دوسرے اشعار شامل ہیں۔ رامپور کے نسخہ میں خواجہ احرار

ولی کے رسالہ کے منظوم ترجمہ کے علاوہ، اکتالیس اشعار کی ایک مثنوی، دوسرے حصہ میں ایک غزل اور چند دوسری مختصر نظمیں اور تیسرے حصہ میں آٹھ اشعار کی ایک مثنوی نما نظم شامل ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسی طرح کے کلام بابر کا ایک نسخہ استنبول یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

ازبکستان کے جن ممتاز علما اور ناقدین ادب نے بابر مرزا کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے کم و بیش وہ سب اس نتیجہ پر پہنچے کہ شاعری کا سرمایہ کم سہی لیکن اس کے پیچھے ایک انسان دوست، مہذب، روشن ضمیر، حسن پرست اور آزاد خیال انسان کی روشن جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان علما میں واحد زاہدوف، صادق میرزائف، سعید بیگ حسنو واور لیاس ہاشموو کے نام قابل ذکر ہیں۔

واحد زاہدوف، تزک بابری کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

''اس کی غزلوں میں اپنے زمانہ سے برگشتگی، اور مقدر کی ستم ظریفی کے خلاف کڑوی کسیلی فکر جھلکتی ہے۔ اس قسم کی برہمی اور کسک ایک اجتماعی خاصیت رکھتی ہے۔ یہ باتیں اس عہد کی مخصوص سماجی حقیقتوں کے خلاف محتاط اور ناقدانہ رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔'' (32)

سعید بیگ حسنو لکھتے ہیں۔

''اگرچہ بابر کی غنائی (شاعری کا) ورثہ مقدار کے لحاظ سے بڑا نہیں لیکن نفس موضوع فنی ہیئت اور ادبی لحاظ سے مکمل اور خوبصورت ہے..... اس کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس کا ہر شعر کسی تاریخی سچائی سے جڑا ہوا ہے جسے اُس نے کمال سادگی سے ادا کیا ہے۔

بے شک اُس کی شاعری کا مرکزی موضوع محبت ہے۔ یعنی دیوانہ کر دینے والی شفاف محبت، درد ہجر کے شکوے، آرزوئے وصال اور وفا شعاری.....'' (33)

بعض ناقدین نے بابر کی شاعری کے غنائی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے اوزان اور الفاظ کی بندش ایسی ہے کہ وہ آسانی سے موسیقی کی راگ راگنیوں میں ڈھل جاتے ہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بابر اپنے پیش رو باکمال شعرا مثلاً امیر خسرو، علی شیر نوائی اور عبدالرحمٰن جامی کی روایت سے وابستہ تھا۔

بابر کو خود اس حقیقت کا احساس تھا کہ وہ اپنی شاعری کا کوئی ایسا دیوان مدون نہیں کر سکا جسے دوسرے حکمراں سخنوروں کی طرح وہ مطلاّ اور مذہب کرا کر دوستوں کو سوغات کے طور پر پیش کرتا۔

دیوان میں میرے کوئی ترتیب نہیں
جدول نہیں، زر کاری و تذہیب نہیں
بے شک تمہیں بھیجی ہے یہ سوغات مگر
ہونی تھی جو تقریب وہ تقریب نہیں

دراصل بابر مرزا کا المیہ یہی ہے کہ اس کو علی شیر نوائی جیسی فراغت اور عافیت میسر نہ آئی ورنہ اپنی تخلیقی ذہانت اور اختراعی فکر (Originality) کے اعتبار سے وہ ملاّ علی شیر نوائی سے کم نہیں بلکہ زیادہ بلند و بالا ہی تھا۔ اپنے معاشرہ اور اپنے تہذیبی ورثہ کے بارے میں اس کا رویہ زیادہ ناقدانہ اور باغیانہ تھا۔ زندگی کے معاملات اور حقائق کے بارے میں اس کا طرزِ احساس اور طریق فکر نوائی سے زیادہ تعقل دوست اور حقیقت پسندانہ تھا۔ بابر مرزا کے تجربات کی دنیا بھی زیادہ وسیع اور متنوع تھی اور اس سے اس کے تخیل میں زیادہ جولانی اور کشادگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس سچائی سے انکار بھی مشکل ہے کہ دوسرے کلاسکی شعرا کے مقابلہ میں بابر کا ذوقِ جمال زیادہ پہلو دار اور نفیس و نازک تھا لیکن افسوس کہ اس کی شخصیت کے ان کمالات کا اس کی شاعری میں بھرپور اظہار نہ ہو سکا۔

اس کے باوجود اگر غور سے دیکھئے تو اس کی شاعری میں اس کی حقیقت پسندانہ فکر کے عناصر جگہ جگہ ملیں گے۔

یہ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

بے تاب و تواں ہوں بے سر و ساماں ہوں میں
بکھرا ہوا، بے سکون، پریشاں ہوں میں
دنیا کا ہوا نہ دین و ایماں کا میں
بابر اس زندگی سے حیراں ہوں میں

انساں کو پوچھتا نہیں غربت میں آدمی
رہتا ہے یاس و رنج و مشقت میں آدمی
میں جب سے بے وطن ہوں عجب حالِ زار ہے
گم کردہ راہ جیسے ہو وحشت میں آدمی

ڈھالی گئی ہے روح لطافت کے ساتھ
ہمرا کیا تن کو کثافت کے ساتھ
جب تن کے گھروندے میں بسی روح مری
جانا کہ اڑی جان، پر آفت کے ساتھ

یہ دہر کہ دشمن کو زبردست کرے
نخوت کے نشے سے دو دن مست کرے
پہنچا دے اسے آج فلک تک لیکن
کل اس کو وہی آگے زیر و پست کرے

شیخ وزاہد کی ظاہرداری اور منافقانہ اخلاق کے حوالے سے دورِ وسطیٰ کے دوسرے شعرا نے بھی طنز وتعریض سے کام لیا ہے لیکن بابر کی شاعری میں ان کی گرفت زیادہ شدید اور تیکھی نظر آتی ہے۔ وسطی ایشیا کے حکمرانوں کے انتظامی امور اور فیصلوں میں اکابر علما اور شیوخ اکثر مداخلت کرتے اور اثر انداز ہوتے تھے لیکن الغ بیگ اور بابر مرزا تیموری خاندان کے یہ دو فرمانروا ایسے تھے جنھوں نے علماء دین کو امور مملکت میں کبھی دخیل ہونے کی اجازت نہیں دی اور اُن کی بالادستی کو نہیں مانا۔ بابر ان کے احترام کے باوجود دربار سے دور رکھتا تھا۔ خواجہ احرار سے گہری عقیدت کا مطلب یہی تھا کہ وہ شیوخ سے زیادہ صوفیا کے مسلک کو عزیز رکھتا تھا۔ فقیروں اور جوگیوں سے مل کر اسے زیادہ تسکین اور خوشی ہوتی تھی۔

یہ چند اشعار دیکھئے۔

زاہد مجھے ڈراتا ہے دوزخ کی آگ سے
وہ آتشِ فراق کے آگے شرر ہے اک

جو خون پیتا ہے اکثر ایاغ دنیا سے
نشہ نہ ہو جو پئے مے وہ ساغر جم سے

کہو مجھ کو فتنہ کہ صلح جو، ہوں مگر میں عاشق لالہ رو
یہ ہے میری زندگی زاہدو! تمہیں اس سے کیا سروکار ہے

تم کیا جانو اے شیخ حرم جو اہل عشق کا شیوہ ہے
ہے یہ دنیا بھی جنت، عالیجاہ تمہیں معلوم نہیں

بابر جاگیرداری اور شاہی نظام کا پروردہ ہونے کے باوجود انسان کی آزادیءفکر وعمل اور انسانی وقار کی حرمت کا پاس کرتا تھا۔ اس کی کھلی مے نوشی، حسن پرستی اور خوش ذوقی احباب کے ساتھ رقص وموسیقی کی طرب زا محفلوں میں دادعیش دنیا اور خودنوشت میں صاف اور بے محابا انداز سے ان کا ذکر کرنا بھی، انسان کی آزادی کے تئیں اس کے موقف کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک غزل کے کئی اشعار میں بابر نے دشمن دنیا سے انسان کو بے پرواا اور بے نیاز ہو جانے کی تلقین کی ہے مطلع میں خود اس کی ہجرتوں کا عکس ہے۔

وہ خوش نصیب، جو ترکِ دیا رو یار کرے
قلندروں کی طرح زیست اختیار کرے
رہے وہ مست، کبھی دھیان بھی نہ دے اس پر
کہ دہر دوں اسے رسوا کرے کہ خوار کرے
وہ اپنی جان کو روتا ہے، لوگ ہنستے ہیں
اسی میں خیر ہے، لوگوں سے وہ کنار کرے

'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست' کا خیامی مسلک جو کابل پہنچنے کے بعد بابر نے اختیار کیا اور اس پر عمل کیا اس کے کچھ خارجی اور داخلی اسباب ضرور تھے جن کی طرف پچھلے اوراق میں

اشارہ کیا گیا۔ لیکن شدّت پسندی اور مادی لذتوں کی گرویدگی بابر کی پہلو دار رومانوی شخصیت کا ایک حصہ بھی تھی۔ حالات جیسے، جیسے بدلتے یا سازگار ہوتے گئے اس شخصیت کے پیچ بھی کھلتے گئے اور بابر کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔

پھر موسم گل کی شامیں ہوں ارباب نظر کی صحبت ہو
پھر جام اٹھے پھر دور چلے، اک محفل شعر و حکمت ہو
ہاتھوں میں چغیری [1] ساغر ہو، ہونٹوں پر نغمہ صحرائی
یہ بزم ہو بزمِ عیش و طرب، ہر رنج و تردّد رخصت ہو
احباب کی صحبت، بزم سخن، مے کی سرشاری، سیم بدن
کچھ نرم ہواؤں کے جھونکے ان میں پھولوں کی نکہت ہو

ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

آیا رمضان تو ہوا بادہ پرست
اور عید کا دن آیا تو ہوں جام بدست
کیا فکر نماز و روزہ کی ہو بابر
دن رات ہوں مجنون و مے میں سرمست

اس بیان حقیقت کے باوجود یہ بھی صحیح ہے کہ بابر مرزا کو زندگی کے آخری ایام تک نماز روزہ کی فکر رہی اور جب رانا سانگا سے جنگ کے موقع پر اس نے شراب سے توبہ کی تو اپنی قوت ارادی سے اس عہد پر قائم بھی رہا۔ اگرچہ توبہ کرنے کے بعد دو سال تک سخت اذیت کے دور سے گزرا اور اسی زمانہ میں یہ قطعہ کہا۔

ترک مے کر کے ہوا ہوں پریشان بہت
کیا کروں ہوتا ہوں اس بات سے حیران بہت
لوگ ہوتے ہیں پشیماں تو کرے ہیں توبہ
توبہ کرنے پہ مگر میں ہوں پشیمان بہت

بظاہر بابر مرزا کی شخصیت میں کچھ متضاد رویّے نظر آتے ہیں جو کبھی کبھی شخصیت کے دولخت

---

1. ایک قسم کی شراب

ہونے کا احساس بھی دلاتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا ہے نہیں۔ تخلیقی توانائی اور خود اعتمادی کے جوہر سے بہرہ ور شخصیتیں اکثر فکر و عمل کا ایک پیچیدہ نظام رکھتی ہیں اور یہ نظام شخصیت میں ابھرنے والے متخالف رویوں کو ایک خاص سطح پر خود کار ڈھنگ سے حل کر لیتا ہے بابر مرزا کے یہاں بھی یہ عمل جاری و ساری رہا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ حکومت کی باگ ڈور یا فرمانروائی بابر کو خاندانی ورثہ کے طور پر، بہ حیثیت جانشین تفویض ہوئی تھی۔ وہ بھی گیارہ بارہ برس کی عمر میں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ حاکمیت بابر کی شخصیت کے قلندرانہ اور شاعرانہ مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ لیکن اس کی وجہ سے جب اس کی زندگی کو خطرہ درپیش ہوا اور خود اس کے عزیز و اقارب بھی دشمنوں کی صفوں میں جا کھڑے ہوئے تو بابر نے کمسنی کے باوجود اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔ اپنی قوت ارادی اور شخصی حوصلہ مندی کے بل پر دشمنوں سے لوہا لیا۔ شکست و فتح دونوں کا سامنا، زندگی کا کھیل سمجھ کر کیا۔ عہد وسطیٰ کی جنگ جوئی اور طالع آزمائی کے ماحول میں اسے جلد ہی یہ عرفان حاصل ہو گیا کہ عسکری قوت اور تیغ زنی کی طاقت کے بغیر وہ اپنے خوابوں کو پورا نہیں کر سکتا اور اس طرح وہ آتش نمرود میں بے خطر کود پڑا۔ لیکن آخر تک اسے گلزار بنانے کی تگ و دو کرتا رہا۔ ایک فرمانروا اور فوجی مدبر کی حیثیت سے اسے بعض مہمات میں ایسے فیصلے اور اقدام کرنا پڑے جو اس کی شرافت نفس، انسان دوستی اور قلندری کے مسلک و معیار سے بہت پست تھے یہ قتل و خون اور غارتگری ایک طرح کی دہشت گردی تھی جو اقتدار کے استحکام اور رعب و دبدبہ کو قائم کرنے کے لئے ضروری تصور کی جاتی تھی (جس طرح عصر حاضر کی تہذیب یافتہ، جمہوری حکومتیں کر رہی ہیں) بابر نے یہ سب مجبور ہو کر، فرمانروا کی حیثیت سے کیا۔ لیکن مجھے یقین ہے ان سفاکانہ اقدامات پر اس کا انسانی ضمیر، اس کا قلندر ضمیر، اسے ضرور ملامت کرتا رہا ہوگا۔

بابر کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے یہ گریز اس لئے ضروری ہوا کہ شاعری میں، تزک بابری، کے برعکس بابر کی ادھوری شخصیت ہی سامنے آتی ہے۔ اس میں اس کے (Erotic) حسن و عشق کے تجربات ہی جگہ پا سکے ہیں۔ یا پھر رندی و سرمستی کی کیفیات اور ان کی سہانی یادیں ہیں۔ علم النفس کی رو سے یہ مشغلے ایسے ہیں جو انسان کو باطنی فشار، گھٹن، احساس زیاں اور احساس گناہ سے نجات دلاتے ہیں۔ یا اس کے لئے پناہ گاہ ثابت ہوتے ہیں۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ بابر مرزا کبھی تنہائی میں بیٹھ کر مے نوشی نہیں کرتا تھا۔ اس کے

لئے وہ پہلے ایک خوشنما مقام اور خوشگوار ماحول کی تلاش کرتا تھا۔ پھر ایسے رفیقوں کو مدعو کرتا جو شعر و ادب کا ذوق رکھتے ہوں اور آخر میں مغنیوں اور سازنوازوں کو شامل کرتا تھا۔ یعنی نشاط و بے خودی دونوں کا طالب تھا۔ اور شعر و شاعری اور موسیقی کے ذریعہ شراب کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بناتا تھا۔

آیئے پھر اس کی شاعری کی طرف رجوع کریں۔

بابر کی پیش رو اور ہم عصر شاعری میں متصوفانہ خیالات کثرت سے ملتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ازبکستان کی سرزمین بڑے صوفی بزرگوں اور ان کے مسلکوں کا گھر رہی ہے۔ بارہویں صدی کے احمد یسوی سے شیخ بہاالدین نقش بندی اور ان کے پیر و خواجہ احرار تک کتنے ہی صوفیا اور ان کے مریدوں نے متعدد صوفی سلسلوں کے حوالے سے صوفی ازم کی نشر و اشاعت کی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ سمرقند کے خواجہ احرار سے گہری عقیدت کے باوصف بابر کی شاعری میں یا 'تزک بابری' میں صوفیا کے ان تصورات کی بازگشت نہیں ملتی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ 'برائے شعر گفتن خوب است'۔ حالانکہ بیشتر متصوفانہ افکار ایک طرح کی ماورائیت یا پھر رومانوی عینیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ بابر مرزا کے یہاں رومانوی پرواز کا رجحان تو تھا لیکن اس کی باگیں حقیقت پسندی اور ارضی فکر کھینچے رہتی تھی۔ اس لئے فقیروں، درویشوں سے ذاتی عقیدت اور احترام کے باوجود ان کی تعلیمات اسے متوجہ نہیں کر سکیں۔

میری نظر سے بابر کے ایسے ایک دو اشعار ہی گزرے ہیں جن میں وہ خدا سے مخاطب ہے مثلاً یہ

مجھے دنیا سے کیا نسبت کہ تو مقصود ہے میرا
تری اس ذات اقدس ہی سے، دنیا کو ملا آدم

حقیقت میں یہاں بھی بابر صوفیا، اور عام اہل دنیا سے الگ، ایک دوسری سطح پر خدا سے رشتہ قائم کرتا ہے اور اس کی ربوبیت اور عظمت کا اعتراف اس لئے بھی کرتا ہے کہ اس نے اس ویران کرۂ ارض کو آدم سے آباد کیا۔ آدم، جس نے اسے خوبصورت اور رہنے کے قابل بنایا۔ یہ تصور صوفیا کے تصور کے علی الرغم ہے۔ جو اس اعتباری سے دنیا سے بیزار ہو کر، اس سے ناتہ توڑ کر، ذات حق سے واصل ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔

بابر کا محبوب اسی زمین کی مخلوق ہے اور اس کی وادیوں میں بکھرے ہوئے تازہ پھولوں کی

طرح شاداب، رنگین اور پرکشش ہے۔

وہ اس کے حسن، عشوہ وادا اور جور و جفا کے گیت گاتا ہے۔ جور و جفا کے اس لئے کہ بقول اقبال ؎

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزہ ہی نہیں

اب بابر کے چند اشعار دیکھئے۔

نگاہ کی تیغِ تیز اُس کی، مرے لئے اک بلائے جاں ہے
کبھی اِدھر ہے، کبھی اُدھر ہے کبھی ہے ساکت کبھی رواں ہے

تیغ و ستاں سے اس کی ڈرا مت مجھے رقیب
اس کے جنوں میں جو بھی ملے وہ مرا نصیب

پیکاں اس کے تیر کا جیسے بُجھا ہو آبِ حیواں میں
چبھتا ہے تو ایک نئی جاں، تن کو پیکاں دیتا ہے

جانِ ابروئے کماں کے بن کروں جو سیر گل
تیر بنتا ہے صنوبر اور کلی پیکان ہے

فارسی اور ترکی کی کلاسیکی عشقیہ شاعری سے رموز و علائم کا جو سرمایہ بابر کو ملا اسے اُس نے تخلیقی حسن سے برتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے ترک ہونے اور چنگیز و تیمور جیسے سپہ گروں سے رشتہ رکھنے کی بنا پر وہ حربی لفظیات کا ترجیحی استعمال کرتا ہے اور سچ مچ اپنے محبوب یا معرکہء عشق کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ جیسا کہ درج بالا اشعار سے اندازہ ہوتا ہے۔

بابر نے اس پر فخر کیا ہے کہ وہ عشق و محبت کے اکثر محاذوں پر بھی فتحمند ہوا ہے۔ خواہ ان کا تعلق وادیء فرغانہ سے ہو سمرقند سے یا پھر افغانستان اور پشتونستان سے اس کے باوجود اس کی شاعری میں محبوب سے دوری اور مجبوری کی واردات کا بیان سوز و درد کی کیفیت سے معمور نظر آتا ہے۔ یعنی ہجر کی اذیت ناکی کا تجربہ، رسمی اور سطحی نہیں بلکہ شاعر کے داخلی کرب کو مترشح کرتا ہے۔

یہ فریادیں، یہ نالے، یہ حیات خواب گوں میری
یہ آہیں کر سکیں تجھ کو ذرا بیدار مشکل ہے

بسمل ہوں اس دوری سے، اے یار مرے
پھول سے دور نہیں کرتے ہیں خاروں کو

وہ جس کے دیدار و پیشوائی کو راستہ میں بچھی ہیں آنکھیں
خبر کوئی آ کے دے تو جانوں کہ وہ صاعقہ زاد اب کہاں ہے

تاہم دیکھئے کہ ہجر کا عذاب سہہ کر بھی بابر حقیقت پسندی کا شیوہ ترک نہیں کرتا۔

تری فرقت میں کرنا صبر اب اے یار مشکل ہے
مگر ہر بات تیری ماننا بسیار مشکل ہے

واقعہ یہ ہے کہ ہجر کا تجربہ بابر کی شاعری میں خیالی نہیں واقعی ہے۔ جواں عمری میں ہی جب وہ اندیجان کا حکمراں تھا دشمنوں اور حملہ آوروں کی وجہ سے اسے وطن اور گھر سے دور آوارگی اور بے سروسامانی کی زندگی گزارنا پڑی۔ کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ ایک ایک سال تک وہ جنگلوں میں روپوش رہا۔ کابل کی فتح کے بعد اگرچہ عدم تحفظ کا احساس کم ہوا تاہم سکون و آسائش کے ماحول میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ پھر ہندوستان میں بھی وہ ایک طرح کی جلاوطنی کی زندگی ہی گزارتا رہا۔ اس عرصہ میں صرف اقربا اور احباب ہی نہیں ان حسینوں سے دوری کو بھی بابر نے شدت سے محسوس کیا جو اس کے دل سے قریب تھیں۔ جن سے اس نے پیار کیا تھا اور بدلے میں ان سے بھی محبت اور وفاشعاری کی سوغات اسے ملی تھی یہی وجہ ہے کہ ہجر و فراق کے تجربے بابر کی شاعری کا اہم موضوع بنے رہے۔ جو کبھی کبھی شاعر کی گہری اداسی اور تنہائی کی بھی غمازی کرتے ہیں۔

اسلوب و فن کے زاویے سے دیکھئے تو بابر کی شاعری میں آہنگ اور وزن کی غنائی دلکشی کے علاوہ (جس کا احساس ترجمہ میں ممکن نہیں) رعایت لفظی کا کثیر استعمال ہے۔ از بیک لوگوں کی مجلسی زندگی اور آداب گفتگو میں بھی ضلع جگت کا خاص مقام رہا ہے۔ آج بھی ذہین اور حاضر جواب لوگ

بات میں لطف اور مزہ پیدا کرنے کے لئے ذو معنی جملے یا الفاظ ضرور بولتے ہیں اور سامعین میں سے کوئی نہ کوئی چونک کر اس کی داد بھی دیتا ہے۔ مجلسی زندگی میں اسی روایت کے تسلسل کا نتیجہ ہے کہ عصر حاضر کے ممتاز از بیک شعراء کے کلام میں بھی ابہام کے اثرات ملتے ہیں۔[1]

بابر مرزا کی اگر سب نہیں تو بیشتر غزلوں میں کوئی نہ کوئی صنعت یا کسی نہ کسی نوع کی رعایت ضرور ہوتی ہے۔ کہیں وہ تجنیس سے کام لیتا ہے اور بعض غزلوں میں ابتدا سے آخر تک صنعت لف ونشر کا التزام ملتا ہے۔ مثلاً یہ غزل ؎

خط ترا، چہرہ ترا، زلفیں تیری، پیچان ہے
اک بنفشہ، برگ گل ہے ایک، اک ریحان ہے
گفتگو کرتے ہوئے تیری زباں، دندان و لب
اک عقیق، اک یاسمیں کا پھول، اک مرجان ہے
جس نے دل کو زار، مجھ کو خوار، تن کو خم کیا
اک جفا ہے، ایک غربت، اک غمِ ہجران ہے

غزل کے ہر شعر کے پہلے مصرع میں تین چیزوں کا ذکر ہے اور پھر ان کی رعایت یا تلازمہ کے طور پر دوسرے مصرع میں ایسے الفاظ، حسب ترتیب لائے گئے ہیں جن سے شعر میں معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں بے شک ایک ارادی کوشش اور تصنع کا احساس ہوتا ہے لیکن دوسرے اشعار میں جس طرح کی رعایت یا تجنیس سے کام لیا گیا ہے ان میں اس تصنع کا احساس نہیں ہوتا اور جذبہ کی صداقت مترشح ہوتی ہے۔ مثلاً یہ اشعار ؎

تری فرقت کی جلتی دھوپ میں برسوں ستم جھیلے
ترے قامت کا سایہ اب مرے سر سے نہ ہووے کم

یہ فریادیں، یہ نالے، یہ حیات خواب گوں میری
یہ آہیں کر سکیں تجھ کو ذرا بیدار مشکل ہے

---

1. راقم الحروف نے اپنی کتاب ''بیسویں صدی کی ازبیک شاعری'' میں اس کی مثالیں دی ہیں۔

جو تو نے بال کھولے، کھل گیا بابر کا دل گویا
ترے گیسو صنم دلبند بھی ہیں دل کشا بھی ہیں

جب وہ گل ہے اس طرح نامہرباں بابر تو کیا
تیرے دل میں بڑھ گئی تو قیراب کچھ خار کی؟

لہو لہو یہ آنسو میرے اس کی مدح میں لکھے شعر
جو ہری کس دوکان کا ایسا نادر ساماں دیتا ہے

جیسا کہ قارئین نے محسوس کیا ہوگا پہلے شعر میں دھوپ کی رعایت سے سایہ، دوسرے شعر میں خواب کے ساتھ بیداری تیسرے شعر میں کھلے بالوں سے دل کا کھلنا اور ان کا دلبند اور دلکشا ہونا چوتھے میں گل کی رعایت سے خار اور پانچویں میں لہولہو آنسوؤں اور مدح محبوب میں لکھے اشعار کی لعل وگوہر بیچنے والے جوہری سے مناسبت۔ ظاہر ہے اس طرح کی رعایتوں کا مقصود قاری کو حیرت زدہ کرنا نہیں بلکہ شعر کے حسن میں اضافہ کرنا ہے۔ اس لئے کہ شعر میں احساس کی تازگی اور تاثیر قائم رہتی ہے۔

ہر چند کے بابر کی زبان پانچ سو سال پرانی ہے، اس کا لب ولہجہ، شعری محاورہ، تخیلی فضا سب روایتی اسلوب شاعری سے قریب ہیں اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ عہد حاضر کے ازبیک قارئین بابر کی شاعری سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں اور مغنی محفلوں اور ٹی۔ وی وغیرہ پر اس کی غزلیں شوق سے گاتے ہیں۔

اب کچھ اس ترجمہ کے بارے میں۔

منتخب کلام بابر کے ترجمہ کا کام یوں تو 1980ء میں شروع ہو گیا تھا جب میں تیسری بار بحیثیت پروفیسر تاشقند گیا تھا۔ لیکن اس کے سولہ سال بعد جب تاشقند میں قائم ہونے والے انڈین کلچرل سینٹر کے سربراہ کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا تو میں نے دوسرے معاصر شعرا کے ساتھ بابر مرزا کے کلام کا مطالعہ اور انتخاب بھی ترجمہ کے مقصد سے شروع کیا۔ اس کام میں میری ایک سابقہ طالبہ اور اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں اردو کی سینئر ریڈر ڈاکٹر محیہ عبدالرحمانووا نے، میری بے حد

مدد کی۔ وہ قدیم و جدید از بیک زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان پر بھی ماہرانہ قدرت رکھتی ہیں۔ صرف یہی نہیں وہ شاعری اور اس کے رموز کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ اس سے پہلے دو ممتاز از بیک عالم نبی محمدوف اور رحمان بیردی محمد جانوف (مرحومین) کلاسیکی از بیک اور اردو شاعری کے سرمایہ پر حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے مرزا غالب، فیض، سردار جعفری اور دوسرے شعرا کے کلام کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر محیہ نے میری درخواست پر بہت وقت دیا۔ ہم کئی کئی گھنٹوں کی نشستیں کرتے رہے۔ ہم نے سب سے پہلے بابر کے کم و بیش سارے کلام پر ایک نظر ڈالی اور اس میں سے پچاس غزلوں اور پچاس رباعیوں کا انتخاب ترجمہ کے لئے کیا۔ بابر کی غزلوں میں اشعار کی تعداد زیادہ نہیں لیکن ہم نے ان میں سے بھی صرف پانچ اشعار کا انتخاب ترجمہ کی غرض سے کیا۔ انتخاب کے اس عمل میں تین باتوں کو ملحوظ رکھا گیا۔

اوّل یہ کہ شعر اچھے ہوں۔ ان میں تازگی اور تاثیر ہو۔

دوئم یہ کہ شعر کی لفظیات اور بالخصوص اس کے قوافی ایسے الفاظ پر مشتمل ہوں جو اردو کی شعری اور ادبی زبان میں بھی مستعمل ہوں۔

سوئم یہ کہ اشعار قابل ترجمہ ہوں۔

میرا خیال ہے کہ کسی زبان اور کسی ممتاز اور مستند شاعر کے سارے کلام کا دوسری زبان میں کامیاب ترجمہ ممکن نہیں اس کے کلام کا ایک مخصوص حصہ اپنی تہذیبی، شعری اور لسانی، خصوصیات کے اعتبار سے ایسا ہوتا ہے کہ اس کا کامیابی سے ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ اس لئے شاعری کے ترجمہ میں Translatability یعنی ترجمہ ہونے کی صلاحیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

بہر حال پہلا قدم یہ تھا کہ ہم نے بابر کے منتخب کلام کا لفظاً لفظاً 'صحیح صحیح' نثر میں اس طرح ترجمہ کیا کہ اس کے خیال یا امیجری کا کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔

اس کے بعد کی نشستوں میں ڈاکٹر محیہ ہر غزل کے مطلع اور دوسرے اشعار کو بار بار پڑھتی تھیں اور میں خود بھی گنگنا کر غزل کے موڈ اور آہنگ کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا تھا۔ کہیں شعر کے خیال یا احساس کا کوئی نازک یا مبہم پہلو سامنے آ جاتا تو ڈاکٹر محیہ اس کی وضاحت کرتی تھیں۔ قرات کا یہ عمل خاصہ پیچیدہ اور دشوار تھا لیکن مجموعی حیثیت سے اس کے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے۔ اس کے بعد ہی میں نے ہر غزل اور رباعی یا قطعہ کو منظوم کرنے کی کوشش شروع کی۔ ابتدا

میں کچھ مایوسی ہوئی۔ میں نے کئی ترجموں کو رد کر دیا۔ ہر غزل کے ترجمہ کا اصل غزل سے موازنہ بھی کیا۔ آخر آہستہ آہستہ ایسے ترجمے ہونے لگے جن کی کامیابی سے بڑی حد تک تسلی ہوئی۔ ترجمہ پر نظر ثانی کا سلسلہ بھی متواتر جاری رہا۔

اس ترجمہ میں صرف دو اشعار ایسے ہیں جن کا قافیہ از بیکی اشعار کے اصل قافیہ سے مختلف لانا پڑا۔ بقیہ تمام غزلوں اور رباعیوں کے اصل قافیے ہی برقرار ہیں۔ البتہ کچھ رباعیوں کو قطعہ میں بدلنا پڑا وہاں بھی چند قافیوں میں تبدیلی عمل میں آئی۔

بابر مرزا کے منتخب کلام کو تخلیقی آب و رنگ دینے، یا اسے فنی اور جمالیاتی تکمیل کے اعتبار سے اصل تخلیق کے ہم پایہ بنانے کی کوشش میں جو محنت کرنا پڑی اور اس عمل میں جس طرح کے نازک مسائل اور مرحلوں کا سامنا ہوا اس کی تفصیل تو آئندہ کسی مضمون میں ہی دی جا سکے گی۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

حوالہ نمبر	نام کتاب	مصنف	صفحہ نمبر
-1	تزک بابری (ترجمہ)	بابر	15
-2	بابر (ترجمہ)	ہیرالڈلیمب	20-21
-3	تزک بابری	بابر	10-11-12
-4	تزک بابری	بابر	42
-5	تزک بابری	بابر	56
-6	تزک بابری	بابر	66
-7	تزک بابری	بابر	122
-8	تزک بابری	بابر	50
-9	بابر	ہیرالڈلیمب	29
-10	تزک بابری	ہیرالڈلیمب	76
-11	تزک بابری	ہیرالڈلیمب	139
-12	تزک بابری	ہیرالڈلیمب	135
-13	تزک بابری	ہیرالڈلیمب	117-118-119
-14	تزک بابری	بابر	120
-15	بابر	ہیرالڈلیمب	166-167
-16	تزک بابری	بابر	147

-17	تزک بابری	بابر	171-172
-18	تزک بابری	بابر	168-169
-19	تزک بابری	بابر	167
-20	تزک بابری	بابر	154
-21	تزک بابری	بابر	258
-22	ہند اسلامی جمالیات	شکیل الرحمن	19
-23	تزک بابری	بابر	85-150
-24	تزک بابری	بابر	121
-25	ہندوستان میں بابری سلطنت	الیاس ہاشیموو	105
-26	تزک بابری	بابر	109-110
-27	بابر	ہیرالڈلیمب	246
-28	بابر	خورشید مصطفےٰ زیدی	87
-29	مقالہ (مسودہ ذاتی)	انصارالدین	2
-30	دیوان بابر (پیش لفظ)	ڈینی سن راس	4
-31	مقالہ (مسودہ ذاتی)	انصارالدین	2
-32	تزک بابری (پیش لفظ)	واحدزاہدوف	
-33	بابر کی شاعری	سعید بیگ حسنوو	4-5

کتابیات

-1 بابر۔ ہیرالڈلیمب ترجمہ سیّد ہاشمی فرید آبادی لاہور۔2000ء

-2 بابر۔ خورشید مصطفےٰ رضوی۔ دہلی 2000ء

-3 بابر سے ظفر تک۔ جمیل یوسف بارسوم۔ اسلام آباد 1989ء

-4 بابرنامہ (ترکی)۔ مرتبہ پارسا شمس ایف صادق میرزائف۔ تاشقند 1960ء

-5 بابر کی شاعری۔ مرتبہ سعید بیگ حسنو و۔ تاشقند 1982ء

-6 تاریخ ترکستان۔ علی محمد شاہین۔ کراچی 1991ء

-7 تزکِ بابری۔ ظہیرالدین بابر۔ ترجمہ رشید اختر ندوی باردوم لاہور 1966ء

-8 ہندوستان میں بابری سلطنت۔ الیاس ہاشموف (ازبکی)۔ تاشقند 1996ء

-9 ہند اسلامی جمالیات۔ شکیل الرحمان۔ دہلی 2002ء

-10 ازبکستان اور علی شیر نوائی قمر رئیس۔ پنچکولہ 1994ء

1. BABUR NAMA, (Eng. Tr.) ANNETTES BEVERIDGE, DELLHI-1995.
2. BABUR, MOHIBUL HASAN, DELHI-1985.
3. DIWAN-E-BABUR, Ed. DENNISON ROSS, CULCUTTA-1910.

❁❁❁❁❁

ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی

ایڈیٹر: یاسین شیخ

اسسٹنٹ ایڈیٹر: میاں آفتاب احمد کم ذات

رابطہ آفس: 513 یونی شاپنگ سینٹر عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی

تحقیق کے نئے زاویئے

امپیریل ازم کے بدلتے نظریات

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ نویسی میں واقعات کی اہمیت ہوتی ہے، لیکن اس سے زیادہ اس کی اہمیت ہوتی ہے کہ واقعات کیوں ہوتے ہیں؟ ان کے پس منظر میں کون سی سیاسی، سماجی، اور معاشی قوتیں کام کر رہی ہوتی ہیں؟ جب واقعات کا اس تناظر میں جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے، اور اس کے بعد ہی تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔

لیکن واقعات کو دیکھنے، سمجھنے، اور ان کا تجزیہ کرنے کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ نئے نظریات اور تھیوریز وجود میں آتی رہتی ہیں جو واقعات کے تجزیہ کو بدلتی رہتی ہیں۔ ان میں سے کچھ تھیوریز کلاسیکل شکل اختیار کر لیتی ہیں، جن کی تاریخی حیثیت ہو جاتی ہے، اور کچھ تھیوریز حالات کے تحت تشکیل پاتی رہتی ہیں۔

امپیریل ازم، تاریخ کا ایک اہم موضوع رہا ہے، کیونکہ تہذیب کی ترقی، اور تکنالوجی کی ایجادات نے کچھ قوموں کو دوسروں پر برتری اور فوقیت دیدی، اس لئے طاقت ور اقوام، کمزور ملکوں اور قوموں پر حملے کر کے ان کی زمینوں اور مال و دولت کو لوٹتی رہی ہیں۔ ساتھ ہی میں امپیریل اقوام، اپنے عزائم اور مقاصد کو اخلاقی جواز کے تحت جائز اور صحیح ٹھہراتی رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں کبھی تہذیب کو استعمال کیا تو کبھی مذہبی سچائی کو اور کبھی نسلی برتری کو، تو کبھی معاشی خوش حالی کو۔

امپیریل ازم کی دو شکلیں ہیں۔ ایک میں اپنے ہی علاقے کی چھوٹی اور خود مختار ریاستوں اور حکومتوں کو شکست دے کر انہیں ایک امپائر میں بدل دیا جائے، جیسے چین، ہندوستان، اور یونان

وغیرہ میں ہوا کہ جب کسی ایک حکمراں نے فوجی طاقت وقوت سے آزاد حکمرانوں کو شکست دے کر، انہیں ایک امپائر تلے متحد کر دیا۔ اس سلسلہ میں یہ دلیل دی گئی کہ اس اتحاد نے اس علاقہ یا ملک کی بکھری ہوئی قوت کو یکجا کر دیا اور انہیں ایک سیاسی و معاشی نظام سے جوڑ دیا۔ جیسے ہندوستان میں مغلوں نے ایک بڑی امپائر کی تشکیل کر کے ہندوستان کو ایک نئی شناخت دی۔ اس اتحاد نے ایک ایسا کلچر پیدا کیا کہ جس میں پورے ہندوستان کی شمولیت تھی۔

اس کی دوسری مثال وہ ہے کہ جب کوئی ملک اپنی سرحدوں سے باہر دوسرے ملکوں پر قبضہ کرتا ہے اور اس کے ذرائع کو اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ یونانیوں، رومیوں، عربوں نے قدیم دور اور عہد وسطی میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔

جدید دور میں یورپی طاقتوں نے نہ صرف ان ملکوں پر قبضہ کیا کہ جو بقول ان کے ''دریافت'' ہوئے تھے، بلکہ ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں جا کر وہاں سیاسی اقتدار قائم کیا۔

یورپین امپیریل ازم کو تاریخی طور پر دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ 15 صدی سے 18 صدی تک، جن یورپی طاقتوں نے دوسرے ملکوں پر قبضے کئے ان میں پرتگال، اسپین، ہالینڈ، فرانس اور انگلینڈ تھے۔ ان ملکوں نے 19 صدی میں امپیریل روایات کو آگے بڑھایا اور ایشیا و افریقہ کے ملکوں پر اپنے اقتدار کو قائم کیا۔

اٹلی اور جرمنی، یورپ کے ان ملکوں میں سے تھے کہ جو 19 صدی میں متحد ہوئے، ورنہ اس سے پہلے یہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے، اس لئے دوسرے یورپی ملکوں کے مقابلہ میں یہ دیر سے میدان میں آئے۔ سب سے آخر میں آنے والا ملک امریکہ ہے، جو پہلی اور دوسری جنگ کے بعد ایک طاقت ور ملک بن کر ابھرا، اور اس کے ساتھ ہی امریکی امپیریل ازم بھی پوری قوت سے ظاہر ہوا۔

جدید امپیریل ازم اور اس کے بارے میں جو تھیوریز تشکیل ہوئیں، اس کا جائزہ جرمن مورخ وولف گانگ مومزن (Wolf-gang J. Momsen) نے اپنی کتاب تھیوریز آف امپیریل ازم (Theories of Imperialism, 1982) میں لیا ہے۔

مومزن کا کہنا ہے کہ ابتداء میں امپیریل ازم کو مثبت معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا، جس سے شہنشاہ کی عزت وعظمت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کو منفی معنوں میں سب سے پہلے انگلستان کے

وزیراعظم گلیڈ اسٹون نے استعمال کیا، جس کا مطلب تھا کہ ایک طاقتور ملک دوسرے ملکوں پر قبضہ کر کے وہاں اپنا تسلط قائم کرے۔

جدید امپیریل زم کو پیدا کرنے، پھیلانے، اور توانائی دینے میں قومی ریاستوں کا دخل ہے۔ یورپ کی ریاستوں کے قومی کردار نے انہیں ایک نئے جذبہ سے دوچار کیا اور ان میں یہ خواہش ابھری کہ قومی ریاست کو وسیع کر کے اسے عالمی سسٹم کا ایک حصہ بنا دیں۔ میکس ویبر (Max Weber) نے 1894 میں ایک لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ جرمنی ایک پرانا ملک ہے، مگر جب اس کی بکھری ہوئی ریاستیں متحد ہوئیں تو اس نے اسے نوجوان بنا کر اس میں توانائی اور طاقت بھر دی، اسی وجہ سے جرمنی کی یہ خواہش ابھری کہ اسے ایک عالمی طاقت ہونا چاہئے۔

لہٰذا یورپ کی دوسری قومی ریاستوں میں نیشنل ازم کے جذبات نے ان میں یہ عزائم پیدا کئے کہ وہ اپنے مقبوضات کو بڑھائیں۔ نیشنل ازم کے ساتھ ساتھ سوشل ڈارون ازم یا سفید نسل کی برتری کے جذبات نے بھی ان کو امپیریل طاقت بننے میں مدد دی۔

19 صدی میں یورپ کی قومیں ریاستیں کالونیز کے حصوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر مقابلہ کر رہی تھیں۔ اس مقابلہ کے نتیجہ میں ان میں باہمی جنگیں بھی ہوتی رہیں۔

جے۔ اے۔ ہابسن نے امپیریل ازم کی وجوہات میں، سرمایہ داری کے عروج کو اولیت دی ہے، کیونکہ سرمایہ داری کی وجہ سے یورپی ملکوں میں دولت اور ذرائع کی غیر منصفانہ تقسیم ہوئی، جس کی وجہ سے وہ لوگ کہ جو غریب ہوتے چلے گئے، ان کے پاس اس قدر پیسہ نہیں رہا کہ وہ اشیاء کو خرید سکیں، جب مقامی منڈیوں میں خریداروں کی تعداد گھٹ گئی، تو سرمایہ دار کو اپنے مال کی کھپت کے لئے بیرونی منڈیوں کی ضرورت پڑی، اس نے امپیریل ازم کو پیدا کیا۔ ہابسن کے نقطہ نظر کے مطابق اگر مقامی منڈیوں میں خریدار ہوں تو اس صورت میں امپیریل ازم کو روکا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس کا کہنا ہے کہ امپیریل ازم سماج کے لئے فائدے کے بجائے نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ یہ سرمایہ داروں کے لئے منافع بخش ہوتا ہے جب کہ سماج کے دوسرے طبقے اس کے فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ سرمایہ دار اپنی حکومتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ غیر ملکوں میں ان کے سرمایہ کی حفاظت کریں۔

ہابسن کا کہنا ہے کہ جب تک مقامی خریداروں کی تعداد کو نہ بڑھایا جائے گا اور ریاست کے

بنیادی ڈھانچہ کو تبدیل نہیں کیا جائے گا اس وقت تک امپیریل ازم کو بھی نہ روکا جا سکے گا۔

جوزف شم پیٹر (Joseph Schumpeter) نے اس استدلال کو رد کیا کہ امپیریل ازم، سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ اس کے مطابق یہ سرمایہ داری کے وجود میں آنے سے پہلے ابھر چکا تھا۔ اس کے پس منظر میں کسی بھی ریاست کی جانب سے بے لگام ہو کر دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنا ہے۔ یہ حکمراں طبقوں کی خواہشات و طاقت کے نشہ سے پیدا ہوتا ہے، اور دیکھا جائے تو یہ بے مقصد، بغیر افادیت کے توسیع پسندی کا نام ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے اس نے ایرانی اور رومی امپیریل ازم کی تاریخ بیان کی کہ جن کے پس منظر میں بے مقصدیت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ فرانس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ لوئی (XIV) چہاردہم کے عہد میں فرانس کے نکمے، عیاش اور نااہل امراء جنگ کے ذریعہ اپنی اہمیت کو واضح کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا تاریخی طور پر امپیریل ازم، نام و نمود، عزت و عظمت، اور لوگوں میں بلاوجہ کا احساس برتری پیدا کرنے کا نام ہے۔ عہد وسطی میں اس کے ذریعہ فیوڈل نظام کو برقرار رکھا گیا۔ موجودہ دور میں یہ ماضی کے عناصر ہیں کہ جو در پردہ امپیریل ازم کی حمایت کر رہے ہیں، اب بادشاہت اور مطلق العنانیت کی جگہ نیشنل ازم نے لے لی ہے۔

روڈولف ہلفرڈنگ (Rudolf Hilferding) (1900) نے مالیاتی سرمایہ داری کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہا کہ اس سے اجارہ داری پیدا ہوتی ہے آزادی نہیں۔ یہ مقامی منڈیوں کی حفاظت کرتا ہے، اور غیر ملکی منڈیوں پر اپنا تسلط جماتا ہے۔ اس کے مطابق جب سرمایہ داری کا پھیلاؤ ہوتا ہے، اس وقت وہ بحرانوں سے دور رہتا ہے، اس لئے جس قدر سرمایہ داری کا پھیلاؤ ہوگا اسی قدر خوش حالی زیادہ ہوگی۔

روزالکزمبرگ نے امپیریل ازم اور سرمایہ داری کے گٹھ جوڑ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس جانب توجہ دلائی کہ سرمایہ داری کو صرف غیر ملکی منڈیوں ہی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، بلکہ اسے خام مال اور لیبر کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو وہ دوسرے ملکوں پر قبضہ کر کے حاصل کرتی ہے۔ کیونکہ خام مال اور سستی مزدوری ان ملکوں میں ہے کہ جو اب تک صنعتی طور پر پس ماندہ ہیں، اس لئے ان پر قبضہ کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے سرمایہ داری فوجی طاقت و قوت اور تشدد کو اختیار کرتی ہے۔ تشدد کی یہ پالیسی غیر ملکی مقبوضات ہی میں نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ ملک کے مزدوروں

اور کاریگروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، اس ذریعہ سے سرمایہ کا ارتکاز ہوتا ہے۔

روز الکزمبرگ کے نقطہء نظر کے مطابق سرمایہ داری جب امپیریل ازم کے ذریعہ اپنا تسلط قائم کرتی ہے، تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ غیر صنعتی ملکوں کے پیداواری نظام کو تبدیل کر کے اس جگہ سرمایہ داری اور صنعتی نظام کو قائم کرے اور پس ماندہ ملکوں کے مزدوروں کو تنخواہ اور مزدوروں کی شکل میں بدل کر ان کی محنت کو اپنے لئے استعمال کرے، اس لئے اس کے نفاذ میں تشدد، طاقت، جبر اور لوٹ مار شامل ہوتی ہے۔

1916 میں لینن نے اپنا مشہور کتابچہ

Imperialism, the Highest Stage of Capitalism

لکھا۔ اس میں لینن نے جن امور کی جانب اشارہ کیا ہے، ان میں کہا گیا ہے کہ سرمایہ داری اور اس کا پیداواری نظام اس سطح پر پہنچ گیا، کہ جہاں ارتکاز کی شکل اختیار کر کے اس نے اجارہ داری کو قائم کر لیا ہے، جس کی وجہ سے اس کا معیشت پر کنٹرول بڑھ گیا ہے۔ اس کی وجہ سے چند بڑے بڑے سرمایہ داروں اور ان کی تجارتی کمپنیوں نے دنیا کو آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی سرمایہ دار ریاستوں میں باہمی رقابت اور دشمنی بھی پیدا ہو رہی ہے، جو انہیں جنگ پر تیار کرے گی۔

روز الکزمبرگ نیشنل ازم کو بورژوا طبقے اور اس کے مفادات کو پورا کرنے کے لئے ایک اہم ذریعہ سمجھتی تھی۔ جب کہ لینن نے کولونیز میں نیشنل ازم اور نیشنل تحریکوں کی حمایت کی، تا کہ ان کے ذریعہ امپیریل ازم کا مقابلہ کیا جا سکے۔

مارکسٹ دانشوروں نے امپیریل ازم کو سرمایہ داری کی پیداوار قرار دیا۔ 1969 میں ماسکو کمیونسٹ پارٹی نے ایک اعلامیہ میں کہا کہ امپیریل ازم پس ماندہ ملکوں پر معاشی معاہدے تھوپتا ہے اور ان کے ساتھ ایسے فوجی معاہدے کرتا ہے کہ جو ان کے اقتدار اعلیٰ کو کمزور کرتا ہے۔ وہ ان کا استحصال سرمایہ دارانہ نظام کے تحت کرتا ہے اور امداد کی مختلف شکلوں کے ذریعہ ان کو معاشی طور پر جکڑ لیتا ہے۔

یورپ کے کچھ دانشوروں نے اس دلیل کو مسترد کیا کہ امپیریل ازم سرمایہ داری کے سایہ میں پیدا ہوا۔ ان کی دلیل کے تحت امپیریل ازم کے پھیلاؤ میں ماضی کے وہ عناصر تھے کہ جن میں

جاگیرداروں اور بادشاہت کے اثرات تھے۔ یہ عناصر جمہوریت اور صنعتی ترقی سے پہلے یورپ کے سماج میں موجود تھے، ان ہی کے زیر اثر امپیریل ازم موجودہ دور میں ابھرا۔

اس کے برعکس کچھ دانشوروں نے انفارمل امپیریل ازم (Informal Imperialism) کی اصطلاح کو استعمال کیا۔ اس کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وکٹورین امپیریل ازم کا مقصد تجارتی مقاصد کا حصول تھا، اس لئے اس نے جہاں ضروری سمجھا طاقت کا استعمال کیا اور جہاں ضرورت نہیں تھی، وہاں بغیر طاقت کے تجارتی فوائد حاصل کر لئے۔

اس کی دوسری مثال جرمنی کی ہے کہ بسمارک نے کولونیل یا امپیریل پالیسی کو اس لئے اختیار کیا کہ وہ اپنی حکومت کی مخالف قوتوں کو منتشر کرنا چاہتا تھا، اور ساتھ ہی میں انقلاب کی راہیں مسدود کرنا چاہتا تھا۔ امپیریل ازم نے اس کے مقاصد کو پورا کر دیا۔

ڈیوڈ کے فیلڈ ہاوس (David K. Field house) نے امپیریل ازم کی پیداوار کو مرکز سے دور، کالونیز میں قرار دی۔ اس کے نزدیک امپیریل ازم کے پھیلاؤ میں کالونیز کے حالات اور وہاں مقامی تعاون کرنے والے لوگوں کی مدد شامل تھی۔ امپیریل طاقتوں کے جو سربراہ ان کالونیز میں تھے، انہوں نے مقامی حالات سے مجبور ہو کر مقبوضات میں اضافہ کیا۔ اپنے تحفظ کی خاطر بغاوتوں کو کچلا، اور سرحدوں کو مسلسل بڑھایا۔ اگرچہ مرکز میں حکومتیں اس پھیلاؤ کی مخالف تھیں، مگر وہ اس عمل کو نہیں روک سکیں۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوا کہ آخر مقامی لوگوں میں سے کچھ نے امپیریل طاقتوں کے ساتھ کیوں تعاون کیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ان کی مدد سے اپنے سماج کو جدید بنانا چاہتے تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ قدامت پرستی سے ان کا بچاؤ، ان کی حمایت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کی دوسری وجہ ان کی مختلف جماعتوں میں باہمی رقابتیں بھی تھیں۔

کیا امپیریل ازم نے اپنے مقبوضات کو جدید بنایا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے۔ یورپی طاقتوں نے بعض علاقوں میں مقامی حکمرانوں کو رہنے دیا، اور ان کی سرپرستی کی، جس کی وجہ سے وہ جدیدیت سے دور رہے۔ مثلاً ہندوستان میں مقامی ریاستوں نے اپنے علاقوں میں قدیم نظام برقرار رکھا، اور وہاں بہت کم اصلاحات کیں۔

اب موجودہ دور میں امپیریل ازم کی شکل بدل گئی ہے۔ اسے نیو امپیریل ازم بھی کہا

جاتا ہے، جس کے تحت ملک پر قبضہ کرنے کے بجائے اس کی معیشت کو باہر سے کنٹرول کیا جائے اور اسے سرمایہ دارانہ نظام پر انحصار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس وقت تیسری دنیا کے ملک اس انحصار کے پنجہ میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس نے ان ملکوں کی معیشت کو اور زیادہ پس ماندہ بنا دیا ہے۔

مغل ریاست

ڈاکٹر مبارک علی

ایشیائی ریاستوں کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ یہ مطلق العنان، جابر، اور تشدد سے بھرپور ریاستیں تھیں کہ جن کے حکمران قانون سے بالاتر ہو کر اپنے اختیارات کو استعمال کرتے تھے۔ بادشاہت کا ادارہ چاہے کسی ملک یا براعظم میں ہو، اس کے اختیارات یقیناً بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح یورپ میں بادشاہ کے اختیارات کو کنٹرول کرنے کے لئے فیوڈل لارڈ تھے، اسی طرح ایشیا میں امراء، جاگیردار اور مذہبی ادارے ان کے اختیارات کو کنٹرول کرتے تھے۔

ایشیا کے ملکوں میں بادشاہ کے اختیارات کو چیک کرنے کا ایک اور ذریعہ ایسا ''ادب'' تھا کہ جس میں بادشاہ پر زور دیا جاتا تھا کہ وہ عدل وانصاف سے کام لے اور رعایا کو اپنے بیٹوں کی طرح سمجھے۔

اس ضمن میں مغل ریاست اور اس کے ڈھانچہ پر مورخوں نے تحقیق کی ہے کہ اس ریاست کا ڈھانچہ اس کی خاصیت اور کردار کیا تھا؟ علی گڑھ اسکول کے مورخوں کے نزدیک یہ ایک مضبوط مرکزی ریاست تھی کہ جس پر نوکر شاہی کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا تھا۔ جب کہ کچھ مورخ اس کے لئے ''سرپرستانہ اور نوکر شاہی'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، کچھ یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ سلطنت مختلف صوبوں اور یونٹوں میں بٹی ہوئی تھی، اور یہ صوبے اور یونٹ اپنی جگہ خود مختار تھے، جب کہ شہنشاہ کی حیثیت محض برائے نام تھی، جو مرکز اور صوبوں کے درمیان رابطہ کا ذریعہ تھا، صوبے اس کے احکامات وصول کرتے اور ان پر عمل کرتے تھے، مگر وہ اپنے حالات کے تحت خود

فیصلے بھی کرتے تھے۔

اب ریاست کی تشکیل، اس کے اداروں، اور اس کے کردار کو مرکز کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن اب اسکالرز ریاست کے ادارے کو صوبوں کے نقطہ نظر سے دیکھ رہے ہیں کہ صوبائی تناظر میں ریاست، مرکز اور مغل بادشاہ کا کیا کردار تھا اس موضوع پر فرحت حسن کی کتاب State and Locality in Mughal India (1572-1730) (Power Relation in Western India) قابل ذکر کتاب ہے۔

فرحت حسن نے ریاست کے کردار میں طاقت کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ طاقت کو محض سنبھال کر کسی ایک جگہ محفوظ نہیں رکھا جا سکتا ہے، بلکہ اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے استعمال میں جبر و تشدد شامل ہوتا ہے، لیکن اس کے دو مقاصد ہوتے ہیں، ایک میں حکمراں یا حکمراں طبقے طاقت کے ذریعے اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں، مگر ایک دوسری صورت میں اس کے ذریعہ کمزور اور مجبور لوگوں کا تحفظ بھی کیا جاتا ہے۔ طاقت ہی کے ذریعہ جہاں بغاوتوں کو کچلا جاتا ہے وہاں تصادم، اور جھگڑے بھی روکے جاتے ہیں۔

اس لئے طاقت کا استعمال کئی طرح سے ہوتا ہے، اور اس استعمال میں مختلف طریقوں، حربوں اور حیلوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

مغل ریاست، اندرونی استحکام، اور اداروں کی بہترین کارگزاری کے لئے حمایتیوں کا طبقہ پیدا کرتی تھی کہ جو اس کے ساتھ وفادار رہیں۔ اس سلسلہ میں طریقہ کار یہ تھا کہ امراء کو جاگیریں دی جاتی تھیں، انہیں خطابات سے نوازا جاتا تھا، اور ان کی بہترین کارگزاری پر انہیں نقد انعامات اور تحفے بھی دیئے جاتے تھے۔

اسی پالیسی کو وہ ان علاقوں میں بھی نافذ کرتے تھے کہ جنہیں فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیتے تھے۔ مقامی امراء کو جاگیر، خلعت، خطاب اور انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا، تاکہ ان کے رشتے مغل ریاست سے مضبوط ہوں۔

فرحت حسن، اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ وہ امراء اور فوجی جو مغل ریاست،

یا دوسری خودمختار ریاستوں میں ملازم ہوتے تھے، ان کا اصل مقصد اپنی ملازمت کا تحفظ اور زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرنا ہوتا تھا۔ اس لئے جو ان مقاصد کو پورا کرتا تھا وہ اس کے ساتھ ہو جاتے تھے، ''وفاداری'' کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ اس کی ایک مثال ان افغان امراء کی ہے کہ جو مواقع کی تلاش میں گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ کے پاس چلے گئے۔ ہمایوں کے کچھ مغل امراء بھی اس کے پاس چلے آئے۔ اسی وجہ سے ہمایوں کو فکر ہوئی کہ بہادر شاہ کے اقتدار کو توڑا جائے۔

جب ہمایوں نے گجرات فتح کیا تو بہادر شاہ کے امراء اس کے ساتھ مل گئے، مگر گجرات کے تاجر، کسان، بھیل، کولی اور گنوار قبائل بہادر شاہ کے ساتھ رہے اور اسے پابندی سے ٹیکس بھی ادا کرتے رہے۔ اسی وجہ سے ہمایوں نے غصہ میں آ کر عام لوگوں کے قتل عام اور لوٹ مار کا حکم دیا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رعایا یا لوگ فاتح کے ساتھ نہیں ہو جاتے تھے، بلکہ اپنے حکمراں یا بادشاہ کا ساتھ دیتے تھے اگر وہ عادل اور منصف ہوتا تھا۔

رعایا یا عام لوگ مصیبت اور بحران میں اپنے بادشاہ کی پرزور حمایت کرتے تھے، اس کی ایک مثال گجرات کے ایک بادشاہ سلطان محمود کی ہے، جسے اس کے دو امیروں نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔ اس کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ ان امراء کو سزا دے سکے۔ اس لئے ایک دن وہ ہاتھی پر سوار احمد آباد میں شہر کے بازار میں آیا اور اہل شہر سے اپیل کی کہ اسے عالم خاں اور وجیہہ الملک سے چھٹکارا دلائیں۔ اس پر لوگوں نے ان دو امیروں کے مکانوں پر ہلہ بول دیا، اور ان کے مال و اسباب کو لوٹ کر انہیں بھگا دیا۔

اس لئے ہمایوں کے بعد مغل بادشاہوں نے یہ سیکھا کہ اگر نئے علاقوں کو فتح کیا جائے تو وہاں کس حکمت عملی پر عمل کیا جائے؟ فرحت حسن نے مغلوں کی فوجی کامیابی کی وجوہات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی کامیابی میں ایک تو ان کی فوجی طاقت تھی، جو ہندوستان کے دوسرے حکمرانوں کے مقابلے میں بہت بڑھی ہوئی تھی۔

دوسرے ان کا کمیونی کیشن کا نظام تھا۔ فوجیوں کی بھرتی کے بعد انہیں سہولتیں دی جاتی تھی۔ جب کسی علاقہ کو فتح کر لیا جاتا تھا تو فوراً ہی کوشش کی جاتی تھی کہ مقامی با اثر لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے، ان میں امراء، جاگیردار، علماء، اور صوفیاء ہوا کرتے تھے۔ خاص طور

سے کسانوں اور تاجروں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جاتا تھا۔ شکست کھانے والے حکمراں کے حرم پر قبضہ کر کے اس کی عورتوں اور کنیزوں کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کا اقتدار اعلیٰ ختم ہو گیا۔

اس کے علاوہ فتح کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ صرف زمین ہی پر قبضہ نہیں کیا ہے، بلکہ لوگوں پر بھی اب ان کی حکمرانی ہو گی۔

فرحت حسن نے سورت اور کمبے کی مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان علاقوں میں مغل ریاست مقامی اشرافیہ اور تاجروں کی مدد سے حکومت کرتی تھی۔ گورنر مرکز کی نمائندگی کرتا تھا، مگر وہ مقامی لوگوں کو انتظامی امور میں شریک کرتا تھا۔ اس سے مغل ریاست کے ڈھانچہ اور اس کے کام کے بارے میں وضاحت ہوتی ہے کہ وہ مکمل خود مختار اور طاقت ور نہیں تھی، اس میں مقامی لوگوں اور اداروں کا بھی حصہ تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کئی موقعوں میں سورت اور کمبے کے تاجروں نے بدعنوان اور نااہل عہدیداروں کی شکایت کر کے انہیں تبدیل کرا دیا۔ خاص طور سے مارکیٹ کے تاجر اگر کوتوال، پیادوں، اور مارکیٹ کے عہدے داروں کے رویہ سے تنگ آتے تھے تو ان کے بارے میں اپنی رائے اوپر تک پہنچاتے تھے، اکثر ان کی بات مانی جاتی تھی۔

بدعنوان عہدے داروں سے اپنی نفرت کا اعلان کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ پبلک میں ان پر آوازیں کستے تھے، ان کا مذاق اڑاتے تھے، اور کبھی کبھی ان پر پتھراؤ بھی کرتے تھے۔ 1685 میں شیخ عبدالوہاب، جن کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ مارکیٹ میں قیمتوں پر کنٹرول کریں، جب ان سے یہ کام نہیں ہوا تو لوگوں نے ان پر آوازیں کسیں ان کی سواری پر پتھر اور دھول پھینکی۔

اسی قسم کا ایک واقعہ 1714 میں کمبے کے گورنر احسان اللہ خاں کے ساتھ آیا، جو لوگوں میں غیر مقبول تھا، لوگوں نے اس کی سواری پر بھی پتھراؤ کیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ ریاست یا اس کے عہدے داروں کی بے چون و چرا تعمیل نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کے خلاف مزاحمت بھی کرتے تھے۔ شہر کے تاجر اور دکاندار بطور مزاحمت

اپنی دکانیں بند کر کے ہڑتال کر دیتے تھے۔ان کی اس مزاحمت کا اثر ریاست اور اس کی پالیسیوں پر پڑتا تھا۔اس کو اس دباؤ کے تحت اپنے احکامات بدلنے پڑتے تھے۔

فرحت حسن نے سورت اور کمبے کی مغل دور کی عدالتی دستاویزات سے یہ ثابت کیا ہے کہ شریعت کا اطلاق صرف مسلمانوں ہی پر نہیں بلکہ ہندوؤں پر بھی ہوتا تھا۔ ہندو اسے اپنے مفادات کے تحت استعمال کرتے تھے، خاص طور سے شادی بیاہ اور جائیداد کے سلسلہ میں۔ وہ شریعت کے ان قوانین کو استعمال کرتے تھے جن سے ان کے مفادات جڑے ہوتے تھے۔

تاریخ کے بنیادی مأخذ

مآثر عالمگیری

مصنف: محمد ساقی مستعد خاں
ترجمہ: مولوی محمد فدا علی طالبؔ

جلوس عالمگیری کا انیسواں سال

1086ھ/1676ء

رمضان کا مقدس ومبارک مہینہ آیا اور بادشاہ دین پناہ نے تمام ماہ صیام شبانہ روز کی اطاعت وعبادت میں بسر کیا رحمت خیز ماہ تمام ہوا اور عیدالفطر کے روز جشن جہاں افروز کا انعقاد ہوا، شہزادے وسلاطین وامرائے کبار عطیہء خلعت سے سرفراز فرمائے گئے۔

سیف خاں فقیراللہ ولد تربیت خاں بحال خطاب وخلعت خاصہ وشمشیر ومنصب کے عطیات سے گوشہء تنہائی سے باہر نکلا۔

ابوالمحمد بیجاپوری آستانہء شاہی پر

ابوالمحمد نبیرۂ ابراہیم عادل خاں پسر بحر خاں جو اپنے وقت کا بہت بڑا فاضل بھی تھا بیجاپور سے آستانہء والا پر حاضر ہوا، قبلہء عالم نے ابوالمحمد کو خلعت عطا فرمایا اور بیجاپوری فاضل شاہانہ مرحمت سے بتدریج منصب دو ہزاری دو ہزار سوار پر فائز ہوکر خطاب خانی وساٹھ ہزار روپے کے انعام سے سرفراز فرمایا گیا، ابوالمحمد کے بھائی وفرزند بھی اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق شاہانہ نوازش سے سرفراز کئے گئے۔

نوتاریخ کو امیر خاں بہادر آستانہء والا پر حاضر ہوا اور اس کے بجائے تربیت خاں کا تقرر عمل میں آیا، پچیس تاریخ شیخ نظام بہوت دی دختر راجہ کشتوار بادشاہ زادہ محمد سلطان کے عقد میں دی گئیں۔

شاہی سواری کا حسن ابدال سے تخت گاہ کو واپس ہونا

پندرہ شوال کو قبلہء عالم نے حسن ابدال سے کوچ فرمایا اور سب سے پہلے کالا باغ میں قیام

فرمایا، اکثر منزلیں صید افگنی کرتے ہوئیں، پندرہ ذی قعدہ کو باغ فیض بخش واقع لاہور میں نزول اجلال ہوا امانت خاں حارس شرف قدم بوسی سے سرفراز ہوا۔

ملاّ عبدالوہاب کی وفات

قاضی عدالت ملا عبدالوہاب نے پندرہ رمضان کو تخت گاہ میں وفات پائی تھی جہاں پناہ نے شیخ الاسلام پسر قاضی مذکور کو جو تخت گاہ کے قاضی تھے اپنے حضور میں طلب فرما کر ان کے پدر کے بجائے قاضی لشکر مقرر فرمایا۔

مولوی عبداللہ سیالکوٹی

مولوی عبداللہ سیالکوٹی پسر ملا عبدالحکیم سیال کوٹی جو علاوہ علم و فضل کے صاحب عرفان بھی تھے اور اپنے اخلاق و افعال میں اسلام کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے تھے ہنوز ملازمت عالی سے سرفراز نہ ہوئے تھے، قبلہء عالم نے حسن ابدال سے ان کے نام پیامِ شوق روانہ فرمایا کہ جہاں پناہ لاہور پہنچنے پر فاضل مذکور اپنے وطن سے روانہ ہو کر اس شہر میں بادشاہ کی ملازمت کا شرف حاصل کریں، مولوی عبداللہ لشکر شاہی کے ورود سے دو یا تین روز پیشتر ہی لاہور پہنچ گئے تھے، مولوی مذکور چند مرتبہ خدمتِ شاہی میں حاضر ہو کر صحبت فیض اثر سے بہرہ اندوز ہوئے، بادشاہ علم پرور نے فاضل سیالکوٹی کو خلعت خاص اور دو سو اشرفیاں و مادۂ فیل عطا فرما کر ان کو وطن جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

یکہ تاز خان

یکہ تاز خاں جو خدمت سفارت پر بلخ گیا ہوا تھا، چار سال تین یوم کے بعد آستانہء شاہی پر حاضر ہوا، خان مذکور نے گیارہ گھوڑے و پوستین و چاقو پیش کئے، قبلہء عالم نے یکہ تاز خاں کو خلعت مرحمت فرمایا۔

ملا محمد طاہر برادر لاعوض وجیہ فرستادہ خان والاشان سبحان قلی خاں بھی یکہ تاز خاں کے ہمراہ حاضر ہوا، جہاں پناہ نے محمد طاہر کو خلعت و سات ہزار روپیہ نقد مرحمت فرمائے۔

فیض اللہ خاں کے تبادلہ سے لطف اللہ داروغہء فیل خانہ مقرر ہوا ترک تاز خاں خلعت و

اسپ وترکش کے عطیات سے سرفراز ہو کر کابل روانہ کیا گیا۔

شہزادہ محمد معظم کے نئے اعزازات

چودہ ذی الحجہ کو شہزادہ محمد اعظم دارالامان ملتان کے انتظام کے لئے مامور ہوئے اور مندرجہ ذیل انعامات عطا ہوئے، خواجہ طالب خلعت لے کر شہزادۂ مذکور کے مکان پر حاضر ہوا۔

شہزادہ محمد اعظم دوسو عراقی وعربی وترکی گھوڑے، دو فیل با ساز نقرہ ایک کروڑ دام نقد، سلطان بیدار بخت، خلعت واسپ وفیل۔

ملا محمد طاہر سفیر بلخ کو چار ہزار روپیہ و پالکی بافرش اور اس کے ہمراہیوں کو دو ہزار روپے مرحمت ہوئے۔

نخستہ اختر فرزند محمد اکبر کی پیدائش

قبلہء عالم کو معلوم ہوا کہ شہزادہ محمد اکبر کے محل میں فرزند پیدا ہوا ہے، اور مولود نخستہ اختر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جہاں پناہ اس خبر کو سن کر بے حد خوش ہوئے اور خسرو چیلہ کی معرفت مالائے مروارید وکلاہ مروارید اور پانچ تھان ارسال فرمائے۔

دلیر خاں کو خلعت واسپ وفیل وجمدھر مرصع عطا فرما کر دکن کی مہم پر روانہ فرمایا، حسن بیگ خاں کے انتقال کی وجہ سے غیرت خاں جونپور کا فوج دار مقرر کیا گیا، ابراہیم خاں بہار سے آستانہء شاہی پر حاضر ہوا۔

چوبیس محرم کو حکم ہوا کہ روح اللہ بیساول خلعت وخنجر مرصع وفرمان آفرین عنوان بابت فتح مورنگ وصوبہ داری اڑیسہ اور دو کروڑ دام بطور انعام رکن السلطنت امیر الامراء بہادر کے پاس لے جائے وکیل کو خود بھی خلعت مرحمت ہوا۔

مُلّا عوض وجیہ جو گوشہ نشین ہو گئے تھے منصب ہزاری پر دوبارہ بحال فرمائے گئے، حسن علی خاں کے تغیر سے ہمت خاں الہ آباد کا فوج دار مقرر فرمایا گیا، اور اس کو خلعت وایک لاکھ روپیہ مرحمت ہوا۔

ہمت خاں داروغہء غسل خانہ مقرر کیا گیا، اور عبدالرحیم کی جگہ پر روح اللہ خاں خدمت آختہ

بیگی پر مامور ہوا، سربلند خاں جو منصب سے برطرف کر دیا گیا تھا اپنے عہدہ پر بحال کیا گیا، داراب خاں، اجمیر سے حاضر ہو کر شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوا اور ملتفت خاں کے تغیر سے داروغہ توپ خانہ مقرر فرمایا گیا اور سید احمد خاں داراب کے بجائے اجمیر روانہ کیا گیا۔

قوام خاں ناظم صوبہ کشمیر ہو کر اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول ہوا، بادشاہ زادہ محمد سلطان کو جواہرات قیمتی سات لاکھ بطور انعام مرحمت ہوئے، شہزادہ محمد معظم کو طُرّہ اور جواہرات کا جُھمکا قیمتی نو ہزار روپیہ پہنچی، مرصع قیمتی پچاس ہزار عطا فرمائی گئی۔

عبدالرسول خاں جو اسی سال ممالک محروسہ میں داخل ہوا تھا گلبارگہ کا داروغہ مقرر کیا گیا، حمزہ خاں حصار کلیانی کا قلعہ دار متعین ہوا، خان زمان کے تغیر سے ایرج خاں، ایرج پور کا اور معصوم خاں کے تبادلہ سے طہماسپ خاں ارہ پنوارہ کے فوج دار مقرر فرمائے گئے۔

اسلام خاں کی وفات

جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ اسلام خاں ناظم صوبہ مالوہ جو خان جہاں بہادر کوکلتاش کی تعیناتی میں مامور ہوا تھا عین معرکہء جنگ میں فوج ہراول کا کمان دار تھا اتفاق سے بارود میں آگ لگی اور اسلام خاں کا ہاتھی بھڑک کر غنیم کی فوج میں چلا گیا، دشمن نے اسلام خاں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور عماری کی رسیاں کاٹ کر اس کو زمین پر گرا دیا، اور اسلام خاں اور اس کے فرزند کو پارہ پارہ کر دیا۔

بادشاہ، خدام نواز کو اس واقعہ سے بے حد قلق ہوا اور جہاں پناہ نے اسلام خاں کے فرزند کلاں افراسیاب خاں کے منصب میں پانصدی پانصد سوار کا اضافہ فرمایا، اسی طرح اسلام خاں کے چھوٹے فرزند کے منصب میں سی صدی چہار صد سوار کا اضافہ منظور فرمایا، اسلام خاں کا مال و متاع یعنی تین لاکھ تیس ہزار اشرفیاں و دیگر ساماں اوجین و شولاپور ضبطی میں آیا، لیکن قبلہء عالم نے تمام نقدی دولت و سامان اسلام خان کے فرزندوں کو مرحمت فرما کر حکم دیا کہ فرزندان مذکور اپنے باپ کے مطالبات کے ذمہ دار ہیں۔

اسلام خاں کی وفات کی وجہ سے چھبیس رجب کو شہزادہ محمد اکبر مالوہ کے صوبہ دار مقرر فرمائے گئے، جہاں پناہ نے شہزادہ محمد اکبر کو خلعت خاصہ مع بالا بند و سرپیچ لعل و دو عراقی و عربی گھوڑے

باساز طلاء وایک عدد فیل مرحمت فرمایا، ملا محمد طاہر سفیر کو رخصت کے وقت دس ہزار نقد وعصائے مرصع کے عطیات سے سرفراز فرمایا گیا۔

پانچویں شعبان کو سلطان معز الدین کا دختر میرزا مکرم خاں صفوی کے ساتھ عقد کیا گیا، قبلہء عالم نے شہزادہ مذکور کو خلعت باچہار قب و مالائے مروارید قیمتی دس ہزار وسمرنی قیمتی دس ہزار وفیل مع جھول کے عطا فرمایا۔

یلنگتوش خاں کو کتخدائی کے روز خلعت وسر پیچ زمرد واسپ باساز طلا وفیل باساز نقرہ مرحمت ہوئے۔

مبارز خاں میر کل کے تغیر کی بنا پر سلطان قلی خاں کو خطاب خانی واسلام آباد (متھرا) کی فوج داری مرحمت ہوئی۔

دس شعبان کو عہدۂ امیران بارگاہ نواب اسد خاں وزارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہوا، قبلہء عالم نے اسد خاں کو خلعت خاصہ ودوات مرصع کار قیمتی پانچ ہزار روپیہ مرحمت فرمائی۔

شہزادہ محمد معظم کا نیا خطاب

سترہویں تاریخ بادشاہزادہ محمد معظم امیران نامدار وتوپ خانہ دشمن رُبا وبے شمار خزینہ وسامان کے ہمراہ کابل کی مہم پر روانہ فرمائے گئے، جہاں پناہ نے شہزادہ مذکور کو شاہ عالم بہادر کے خطاب امتیازی سے سرفراز فرما کر خلعت خاصہ بانیمہ آستین وجواہرات قیمتی دو لاکھ روپے وشمشیر دو قبضہ باساز مرصع وتین گھوڑے شاہ پسند عربی، جہاں پیما وعراقی باساز مرصع وترکی بازین نقاشی وایک لاکھ اشرفیاں مرحمت فرمائیں۔

سلطان معز الدین کو خلعت وکلغی مرصع وسر پیچ مرصع واسپ کوہ زرنام باساز طلاء وشمشیر میناو فیل باساز نقرہ وترکش وکمان مرصع مرحمت فرمائی گئیں، سلطان دولت افزا کو لیکن یاقوت وسلطان نجستہ اختر کو کنگن زمرد مرحمت ہوئے، امیر خاں وسیف خاں وراجہ رام سنگھ وغیرہ امرائے کبار جواہرات وخلعت واسپ کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے۔

مغل خاں منصب دو ہزار و پانصدی و چہار صد سوار سے برطرف فرمایا گیا، محتشم خاں کو سہارنپور کی فوج داری مرحمت ہوئی، حسن علی خاں کے تغیر سے ہمت خاں الہ آباد کا صوبہ دار مقرر

ہوا، محمد شجاع پسر قوام الدین خاں ولایت سے آستانہ ءشاہی پر حاضر ہوا اور بادشاہ رعایا پرور نے اس کو منصب ایک ہزاری سی صد سوار عطا فرمایا۔

عادل خاں خدمت سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشیں ہوا اور اس کو بارہ ہزار روپے سالانہ وظیفہ عطا فرمایا گیا۔

ابراہیم خاں نے ترک منصب کی درخواست کی جو قبول فرمائی گئی۔

افتخار خاں بنگشات کا فوج دار مقرر ہوا۔

عالم پناہ پر گورو تیغ سنگھ کے ایک چیلے کا حملہ

انیس تاریخ سواری مبارک مسجد جامع سے واپس ہو رہی تھی قبلہ ءعالم کشتی سے اُتر کر تخت رواں پر سوار ہو رہے تھے، ایک بد بخت شوریدہ سر نے جو گورو تیغ سنگھ کا چیلہ تھا دو اینٹیں پھینکیں جن میں سے ایک تخت پر گری، پیادگانِ جلو نے اس بدنصیب کو گرفتار کر کے کوتوال کے حوالے کیا۔

جہاں پناہ کا لاہور سے تخت گاہ واپس آنا

انیس ذی الحجہ کو قبلہ ءعالم لاہور سے تخت گاہ کی طرف روانہ ہوئے کمال الدین ولد دلیر خاں کو خطاب خانی عطا ہوا، بادشاہ زادہ محمد سلطان کی زوجہ مسماۃ ودوست دار بانو بیگم نے سولہ ذی الحجہ کو سرائے رستم خاں میں اس سرائے فانی سے کوچ کیا۔

بائیس محرم کو جہاں پناہ تخت گاہ پہنچے، بائیس ربیع الآخر کو راجہ رام سنگھ آسام سے واپس آ کر آستانہ ءشاہی پر حاضر ہوا۔

قبلہ ءعالم پر ایک فریادی کا حملہ

ایک فریاد خواہ نے چوک میں قبلہ ءعالم کی سواری کے وقت ایک لکڑی پھینکی جو چتر مبارک کے اس طرف گری یہ شخص گرفتار کر کے کوتوال کے حوالہ کیا گیا۔

قراولوں نے ایک ہرن سفید رنگ ملاحظہ ءوالا میں پیش کیا۔

بارہ جمادی الاوّل کو شہزادۂ سپہر شکوہ کے محل میں عصمت قباب نواب زبدۃ النساء بیگم کے بطن سے فرزند پیدا ہوا، مولود عالی تبار کے نام سے موسوم کیا گیا، جہاں پناہ مولود کے دیدار کے لئے

سپہر شکوہ کے مکان پر تشریف فرما ہوئے۔

پانچویں جمادی الآخر شہزادہ محمد سلطان کے محل میں فرزند پیدا ہوا اور مسعود بخت کے نام سے موسوم کیا گیا، یکم رجب کو دولت آبادی محل کی برادر زادی کا عقد شہزادہ محمد سلطان سے کیا گیا۔

اللہ قلی ولد مراد قلی کی دختر تیسری رجب کو شہزادہ محمد اکبر کے حبالہ عقد میں دی گئی۔

قبلہ عالم کو معلوم ہوا کہ محمد بخش ولد خان جہاں بہادر قلعہ نلدرگ (دکن) کی جنگ میں کام آیا۔

جہاں پناہ پر ایک اور حملہ

اکیس شعبان کو جہاں پناہ مسجد جامع سے واپس ہو کر گھوڑے پر سوار ہوئے ایک بدنصیب تلوار ہاتھ میں بلند کئے ہوئے قریب پہنچا، بندگانِ جلو نے اس کو گرفتار کیا، مکرم خاں کی انگلی پر ایک زخم لگا، گرز برداروں نے اس کے قتل کا ارادہ کیا لیکن بادشاہ رحم پرور نے گرد برداروں کو منع کیا اور نیم روپیہ یومیہ اس کا وظیفہ مقرر کر کے مجرم کو رنتھنبور روانہ کر دیا۔

ستائیسویں شعبان کو ایک آب دار، مسجد کے زینوں پر قریب پہنچا اور بہ آواز بلند سلام علیکم کہا، حکم ہوا کہ یہ شخص کوتوال کے حوالے کیا جائے۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا بیسواں سال

1087ھ/1677ء

اس زمانہ میں رمضان المبارک کا مقدس مہینہ آیا اور مخلوقِ خدا پر فلاح و بہبود کے دروازے کشادہ ہوئے، ہر شخص سعادت دارین سے بہرہ اندوز ہوا، اور بادشاہ دین پناہ نے تمام ماہ شبانہ روز کی طاعت وعبادت میں بسر کیا، قبلہء عالم نے سترہ رمضان سے کثیر وقت غسل خانے کی مسجد کے اندر طاعت میں گزارا اور اس مقدس مقام پر دیوان عدالت بھی گرم رہا۔

یکم شوال کا مسرت انگیز روز آیا اور اہل استحقاق و امید کے آرزوئیں بر آئیں، شہزادگان نامدار و امرائے کبار حضرت ظل سبحانی کے مراحم خسروانہ سے معزز و مفتخر ہوئے، جہاں پناہ نے حسب ذیل مراعات فرمائیں:۔

شہزادوں اور امراء کے لئے مراعات

(1) شہزادہ محمد معظم۔ دراصل چہل ہزاری ہشت و پنج ہزار سوار، اضافہ پنج ہزار سوار۔

(2) شہزادہ محمد اعظم۔ اصل پانزدہ ہزاری نہ ہزار سوار، اضافہ پنج ہزاری ذات۔

(3) ینگ توش خاں، اصل ہزاری پانصد سوار، اضافہ پانصدی دوصد سوار۔

اعتقاد خاں میر کل برطرفی کے بعد دو ہزاری ہزار سوار کے منصب پر بحال فرمایا گیا۔

سید مصطفیٰ ولد سید مرتضیٰ خاں کو پانصدی یک صد سوار کا منصب مرحمت ہوا۔

روح اللہ خاں، اشرف خاں کے تغیر سے خدمت خانسامانی پر فائز ہوا۔

ینگ توش خاں بہادر نے جہالت سے اپنے چاقو مار لیا، اور اس کے منصب سے جدید اضافہ یعنی پانصدی دوصد سوار کی کمی کر دی گئی۔

ملاّ عوض وجیہ کی وفات

علامہء زماں وسرگروہ فضلائے دوراں، ملاّ محمد عوض وجیہ نے انتقال فرمایا، ملاّئے مرحوم انیس پکت کے باشندے تھے، اور یہ مقام مضافات سمرقند میں داخل ہے ملاعوض وجیہ میر عوض ناشقندی کے حلقہء درس کے بہترین طالب العلم تھے، جو اپنے تمام ہم سبق طلباء پر سبقت لے گئے، ملائے مرحوم نے ایک مدت تک بلخ میں درس دیا، اور حضرت فردوس آشیانی کے عہد معدلت بمطابق سنہ 13 جلوس شاہجہانی میں اعلیٰ حضرت کی فضیلت پناہ بارگاہ میں حاضر ہوئے، حضرت فردوس آشیانی نے ملاعوض وجیہ کو مفتی لشکر کے عہدہ پر مقرر فرمایا۔

عہد مبارک عالم گیری میں ملاعوض محتسب لشکر مقرر فرمائے گئے، اس میں شبہ نہیں کہ ملاعوض نے بے حد انتقاد و پرہیز گاری کے ساتھ احکام شرع کی پابندی کی اور عوام کو اس راہ پر قائم رکھنے و نیز بدعات کا قلع قمع کرنے میں پوری سعی و کوشش سے کام لیا اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں ہے کہ ملائے مرحوم کا ایسا محتسب کوئی دوسرا نہیں ہوا۔

ملاّ نے خدمت احتساب سے علیحدہ ہونے کے بعد بقیہ عمر درس و تدریس میں بسر کی اور ان کے فیض کمال کا ہر صاحب کمال کو اعتراف ہے۔

شہزادہ محمد اعظم آستانہ بوسی کے ارادے سے روانہ ہو کر اعز آباد پہنچے، اور قبلہء عالم نے پاندان و خوانچہ و دو گبرہ و رکابی و اگالدان سب سنگ پشم کے ساختہ اور مرصع ماہ بانو کے ذریعہ سے شہزادۂ موصوف کے لئے بطور انعام روانہ فرمائے۔

بیس ذی قعدہ کو شہزادہ محمد اعظم شرف ملازمت سے فیض یاب ہوئے۔ جہاں پناہ نے شہزادہ مذکور کو خلعت با سرپیچ و دیگر پوشاک خاصہ و نو گھوڑے مرحمت فرمائے، سلطان بیدار بخت و سکندر نشان سرپیچ قیمتی پانچ ہزار روپے کے عطیہ سے سرفراز کئے گئے۔

چوبیس ذی الحجہ کو میرزا بیگ شاہ عالم بہادر کے ملازم نے شہزادۂ مذکور کی عرض داشت و ایک ہزار اشرفیاں نذر تولد فرزند ملاحظہء عالی میں پیش کیں، جہاں پناہ نے مولود کو محمد ہمایوں کے نام سے موسوم کر کے شاہ عالم بہادر کے لئے سرپیچ مرصع و سلطان کے لئے مالائے مروارید ملازم مذکور کی معرفت روانہ فرمایا۔

شاہ عالم بہادر کے معروضہ کے مطابق اعظم خاں کوکہ کے تغیر سے امیر خاں کابل کی صوبہ داری پر مامور فرمایا گیا، بخشی الملک سربلند خاں کو دوات یتیم مرصع عطا ہوئی۔

منوہر داس قلعہ دار شولاپور نے عطائے خطاب راجگی کی نذر پچاس ہزار روپیہ پیش کئے جو قبول فرمائی گئی۔

شہزادہ محمد اعظم کا نیا تقرر

انیس صفر کو تربیت خاں کے تغیر سے شہزادہ محمد اعظم صوبہ بہار کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور جہاں پناہ نے خلعت خاص و جمدھر و سرپیچ مرصع و کلگی و دو گھوڑے و پانچ کروڑ دام بطور انعام مرحمت فرمائے۔

ہادی خاں کے تغیر سے تربیت خاں ترھٹ دور سنگھ کا فوج دار مقرر فرمایا گیا، روح اللہ خاں کے تغیر سے داراب خاں میر توزک اوّل و مکرم خاں کے تغیر سے عبدالرحیم خاں داروغہ گرز برداران مقرر فرمائے گئے، افتخار خاں کے تغیر سے سید خاں بنگشات کا فوج دار مقرر ہوا، اور خان زماں کو مظفر آباد و بیدر کی صوبہ داری و قلعہ دار کی خدمت مرحمت ہوئی۔

شاہ بیگ کاشغری کی آمد

شاہ بیگ کاشغری اپنے طالع کی یاوری سے ہندوستان وارد ہوا، جہاں پناہ نے شاہ بیگ کو شرف حضوری سے بہرہ اندوز فرما کر خلعت خاصہ و خنجر بادستہ طلاء و علاقہ مروارید و جیغہ مرصع و سپر باگل طلاء و مادۂ فیل و پانچ ہزار روپیہ نقد کے عطیات مرحمت فرمائے، اور سات قاب طعام و تین قاب نان اور ایک منزل پالکی بافرش اس کے مکان پر روانہ فرمایا۔

قبلۂ عالم نے شاہ بیگ کو ہزار و پانصدی و دو صد سوار کے منصب سے سرفراز فرما کر اس کو گروہ امراء میں داخل کیا۔

کشن سنگھ ولد رام سنگھ کابل سے آستانۂ شاہی پر حاضر ہوا راجہ نے چار ماہ کی رخصت طلب کی جو عطیۂ خلعت کے ساتھ منظور ہوا۔

عنایت اللہ ولد سعد اللہ خاں مرحوم حکیم محمد بخش کے تغیر سے بخشی شاگرد پیشہ مقرر ہوا، حسن علی

خاں کے نام اکبرآباد کی صوبہ داری کا فرمان گرز بردار کی معرفت روانہ فرمایا گیا۔

محمد اسمٰعیل پسر جمدۃ الملک اسد خاں نے امیر الامراء کی دختر کے ساتھ عقد کیا، جہاں پناہ نے نوشہ کو خلعت واسپ باساز مرصع مرحمت فرما کر اس کو اعتقاد خاں کا خطاب عطا کیا، محمد اسمٰعیل کلگی وسہرا خود لایا تھا قبلہء عالم نے دونوں اشیاء اپنے دست مبارک سے اُٹھا کر شہزادہ سپہر شکوہ کو مرحمت فرمائیں اور شہزادہ نے نوشہ کے سر پر سہرا باندھا۔

محتشم خاں کے تغیر سے کامیاب خاں سہارنپور کا فوج دار مقرر فرمایا گیا، اور محتشم خاں کو بجائے فولاد خاں کے میوات کی فوج داری عطا ہوئی سید احمد خاں کے تغیر سے حامد خاں اجمیر کا صوبہ دار بنایا گیا، حاکم بخارا کے نامہ برمسمی خواجہ نعمت اللہ کو چار سو روپیہ مرحمت ہوئے۔

غیاث الدین خاں کے تغیر سے محمد قاسم خاں متصدی بندر کہنایت بندر سورت کا متصدی مقرر ہوا۔

شہزادہ محمد کام بخش نے حفظ کلام اللہ سے فراغت پائی اور خلعت ودواسپ باساز طلاء وسر پیچ ومالائے مروارید وسپر باگل مرصع وترکش باکمان کے عطیات سے سرفراز ہوئے۔

خانہ زاد خاں تھانہ دار غزنی والہ یار خاں قلعہ دار کابل کی خدمات میں باہم تبادلہ فرمایا گیا۔

امیر الامراء شائستہ خاں کے تغیر سے اعظم خاں کوکہ بنگالہ کا صوبہ دار مقرر ہوا، اور خلعت و خنجر مرصع واسپ پانصد مہری باساز طلاء اسے مرحمت فرمائے گئے، کفایت خاں کے تغیر سے عنایت خاں دفتر خالصہ کا پیش دست مقرر فرمایا گیا، مغل خاں برطرفی کے بعد دو ہزاری ہزار سوار کے منصب پر بحال فرمایا گیا، فضل اللہ خاں برطرفی کے بعد اپنے منصب پر بحال ہوکر بنگالہ میں متعین فرمایا گیا۔

شہزادہ محمد سلطان کا انتقال پُر ملال

چمن عالم میں بہار کے بعد خزاں کا آنا لازمی ہے اور دنیائے فانی کے ہر گوشہ میں راحت کے ہر ذرہ کے برابر اندوہ والم کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں، کاشانہء شاہی میں ہر طرف عیش و عشرت کا دور دورہ تھا کہ دفعتاً زمانے نے پلٹا کھایا اور شہزادہ محمد سلطان شدید بیمار ہوئے، ساتویں شوال کو خاص مقام شکار میں یہ خبر وحشت اثر پہنچی کہ شہزادۂ مذکور نے رحلت فرمائی، باوجود اس قوت

حوصلہ و طاقت صبر و ثبات کے جو پروردگار نے قبلہء عالم کو عطا فرمائی ہے، فرزند رشید کے اس ناگزیر واقعے نے حضرت کو بے قرار کر دیا، قلب مبارک پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے، اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔

روح اللہ خانساماں، سیادت خاں و عبدالرحیم خاں و شیخ نظام و ملا محمد یعقوب کو حکم ہوا کہ شہزادۂ مرحوم کو حضرت قطب الاولیاء خواجہ قطب الدین بختیار رحمتہ اللہ علیہ کے جوار میں پیوند خاک کریں۔

جہاں پناہ نے شہزادۂ مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کی غرض سے خیرات و مبرات جاری کرنے کا حکم دیا۔

شہزادہ محمد سلطان 1049 ہجری (1639ء) میں پیدا ہوئے اور اڑتیس سال دو ماہ کی عمر میں وفات پائی۔

''ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد''

شہزادہ محمد اکبر کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ سلطان عالی تبار پسر شہزادہ سپہر شکوہ نے وفات پائی۔

ستائیس تاریخ جہاں پناہ اجین پہنچے۔

چوتھی ذی الحجہ کو حضرت فردوس آشیانی کی زوجہ المعروف اکبر آبادی محل نے دنیا سے رحلت کی۔

بخشی الملک سربلند خاں کو حکم ہوا کہ تنخواہ ہفت ماہہ و ہشت ماہہ موقوف ہو اور نقد وصول کنندگان کو شش ماہی تنخواہ ادا کی جائے۔

پانچ صفر کو معلوم ہوا کہ فیض اللہ خاں کو جو بنگالہ میں متعین کیا گیا تھا اس کے کسی ملازم نے جمدھر سے قتل کیا۔

نویں صفر کو سکندر شان پسر شہزادہ محمد اعظم نے وفات پائی۔

خان جہاں بہادر کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ اکیس ربیع الاوّل کو قلعہء نلدرگ پر شاہی قبضہ ہو گیا۔

سترہ ربیع الآخر کو سلطان مسعود بخت پسر سلطان محمد نے انتقال کیا۔

کشن سنگھ کی خودکشی

اجین کے واقعات سے معلوم ہوا کہ کشن سنگھ ہاڑ شہزادہ محمد اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا، کشن سنگھ و شہزادۂ مذکور میں سخت گفتگو ہوئی اور ہندو امیر نے جمدھر اپنے پیٹ میں بھونک کر جان دی اس کے چار ملازم برسر پیکار ہوئے اور پندرہ شاہی نوکروں کو قتل کر کے خود ہلاک ہوئے۔

چودہ جمادی الآخر کو شہزادہ محمد اعظم پٹنہ پہنچے اور پچیس تاریخ کو شاہ عالم بہادر کابل میں داخل ہوئے۔

قطب الدین خاں و راجہ اندرمند بوندیلہ نے وفات پائی۔

عبدالرحمٰن خاں بخشی واقعہ نویس دکن کے نام اس مضمون کا فرمان صادر ہوا کہ

''خان جہاں بہادر حضور میں طلب کیا گیا ہے، صوبہ دار کے پہنچنے تک دلیر خاں دکن کا حاکم سمجھا جائے، اور مہماتِ ملک اس کی رائے کے مطابق طے کئے جائیں۔''

جملۃ الملک بہادر نواب اسد خاں بے شمار فوج و سامان کے ساتھ دکن روانہ فرمایا گیا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا اکیسواں سال

1088ھ/1678ء

ماہ صیام کا چاند مطلع فیض اثر پر نمودار ہوا اور آفتاب جمال وجلال الٰہی نے اس مہمان عظیم الشان کی ضیافت ومہمان داری میں شبانہ روز کی طاعت وعبادت سے دنیا کے ہر گوشے کو منور و روشن فرمایا۔

تیرہویں رمضان کو شہزادہ محمد اکبر اُجین سے آستانہء والا پر حاضر ہوئے اور خلعت بانیمہ آستین وبالا بند و پانچ اسپ کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے۔

عید کا راحت اندوز دن آیا اور قبلہء عالم دولت خانے سے عیدگاہ کو تشریف لے گئے، دوسری شوال کو بدستور جشن مبارک کا انعقاد ہوا، اور فرمانروائے عالم و عالمیان نے تخت کامرانی پر جلوس فرمایا، حاضرین دربار کو پان اور عطر تقسیم ہوئے، جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا کہ جو مختصر سامان جشن کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہ بھی اٹھالیا جائے۔

نقرئی دوات کے استعمال کی ممانعت

بخشی الملک صفی خاں سے ارشاد ہوا کہ جشن کا انعقاد موقوف کیا جاتا ہے امیر الامراء کا پیش کش واپس کیا جائے اور دیگر امراء بھی نذریں نہ پیش کریں، فرمان واجب الاذعان صادر ہوا کہ اہل قلم نقرئی دوات کے بجائے چینی وسنگ ملمع کی دواتیں استعمال کریں، طلائی ونقرئی عود سوز دربار خاص و عام میں نہ سلگائی جائیں، انعامات کی رقوم بجائے خوان ہائے نقرہ کے سپر میں رکھ کر ملاحظہء عالی میں لائی جائیں۔

شرعی پائجامے پہننے کا حکم

جو اشخاص شرعی پائجامہ نہیں پہنتے وہ موزے پہن کر دربار میں حاضر ہوں خلعت خانہ میں بجائے مغرق پارچہ کے کلاتبونی کپڑے استعمال کئے جائیں کارخانہ دو والی جو چندیری میں قائم کیا گیا ہے موقوف کیا جائے، طلائی نقرئی نامشروع کپڑوں کے بجائے لاجوردی کپڑے نصب کئے جائیں، سوائے باغ اعزاونور باڑی کے اور کسی باغ شاہی میں جشن گلزار موسمی نہ منعقد کیا جائے۔

جدید عمارات کی تعمیر پر پابندی

چہار صدی سے بالاتر امراء بلاحکم شاہی جدید عمارات تعمیر کرنے کی جرأت نہ کریں۔

دسویں شوال کو شہزادہ محمد کام بخش منصب ہشت ہزاری و دو ہزار سوار سے سرفراز فرما کر توسن وطوغ وعلم و نقارہ و سائبان وبیس گھوڑوں و پندرہ فیل کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے، تمام شہزادوں وامرائے دربار صوبجات کو خلعت زمستانی مرحمت ہوئے۔

بارہ شوال کو قوام الدین خاں کے تغیر سے ابراہیم خان کشمیر کا صوبہ دار مقرر فرمایا گیا، خدمت گارخاں کے تغیر سے محمد یار خاں ولد اعتقاد خاں زرگرخانہ کا داروغہ مقرر فرمایا گیا سزاوار خاں کو قنوج کی فوج داری مرحمت ہوئی محمد نعیم اشرف اصطبل شہزادہ محمد کام بخش کا بخشی مقرر فرمایا گیا۔

خواجہ بہاء الدین ولد خواجہ پارسا نبیسہ ءسبحان قلی خاں والیء بخارا ولایت سے ہندوستان وارد ہوا قبلہء عالم نے نووارد مہمان کو خلعت خاصہ اور چودہ ہزار روپیہ نقد و خنجر مرصع مرحمت فرمایا، اعتقاد خاں کے تغیر سے خواجہ خدمت خاں کو جواہر و بازار کی خدمت داروغگی عطا ہوئی، روح اللہ خاں کے تغیر سے مغل خاں خدمت آختہ بیگی پر فائز ہوا، سوبھکرن بوندیلہ کے تغیر سے منور خاں راٹھہ ومہوبہ وجلال پور، کہدوب کا فوج دار مقرر فرمایا گیا۔

ماہی بیگم کی وفات

ماہی بیگم ہمشیرۂ نجابت خان ولد سربلند خاں نے وفات پائی، نامدار خاں، نجابت خاں کو حضور شاہی میں لے آیا اور جہاں پناہ نے خلعت عطا فرما کر اس کو ماتم سے آزاد فرمایا۔

سید مرتضیٰ خاں کی وفات

تیسری ربیع الاوّل کو سید مرتضیٰ خاں نے وفات پائی مرحوم عالی نسب و والاحسب سید تھا، سیادت وشجاعت کا نوراس کی پیشانی پر تاباں تھا سید مرتضیٰ مرحوم، سپاہ کو بے حد عزیز رکھتا تھا، مرحوم کی رحلت سے پیشتر جہاں پناہ نے ایک روز بختاور خاں کو پُرسش احوال کے لئے بھیجا، خان نے سیّد کی طرف سے عرض کیا کہ دلی تمنا یہ تھی کہ مالک کی جاں نثاری میں کسی میدان جنگ میں کام آؤں لیکن تقدیر میں یہ سعادت لکھی نہ تھی، اور یہ آرزو دل میں لے کر جاتا ہوں، دیگر خدام، موت کے بعد زر و جواہر چھوڑتے ہیں بندہ بے درم چند نفوس کو چھوڑ کر تہی دست دنیا سے جاتا ہے، امید ہے کہ پس ماندگان کبھی حضرت پر تصدق وقربان ہوں گے، سید مرتضیٰ مرحوم کے بعد اس کے اکثر ملازموں نے جاں نثاری کی جن میں سے بعض منصب ہزاری تک پہنچے، مرحوم کے ملازمین کا ایک کثیر گروہ ہزاری سے لے کر چہار بستی تک سرکار شاہی میں نوکر ہوئے، سید مرتضیٰ کے اکثر پیادے بھی کارخانجات میں ملازم ہوئے۔

شیخ عبدالعزیز کی وفات

چھ ربیع الاوّل کو شیخ عبدالعزیز نے وفات پائی، شیخ مذکور کی وفات سے چند روز پیشتر بختاور خاں نے خاکسار مئولف کو مرحوم کے پاس بھیج کر یہ پیغام دیا کہ علاج میں اس قدر تعصب جائز نہیں ہے اگر آپ معالجہ کرانے پر تیار ہوں تو اطبائے یونانی میں سے جس کو آپ فرمائیں خدمت میں روانہ کیا جائے اور آپ اس سے علاج کرائیں، خاکسار مئولف اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ شیخ بستر بیماری پر دراز، مگر تصنیف میں مشغول ہیں خود املا کرا رہے ہیں، اور میر ہادی ومحمد سعید اعجاز جیسے شاگردانِ رشید لکھتے جاتے ہیں، بختاور خاں کا پیغام سن کر راقم الحروف کو جواب دیا کہ مجھ کو ان اطباء کی قابلیت پر بھروسہ نہیں ہے اگر ان میں سے کوئی قابل خطاب ہو تو بسم اللہ اسے میرے پاس بھیج دیجئے، عبدالملک نام ایک شخص ہے جس کے علم وعقل وتجربہ ونیز اصابت رائے پر مجھے فی الجملہ اعتماد ہے، میں نے اس طبیب سے رجوع کیا ہے خود حد سے زیادہ کوشش کرنا بیکار ہے، حیات ایسی گراں قدر دولت نہیں ہے جس کے لئے بے انتہا ہاتھ پاؤں مارے جائیں، اس

قسم کی کوشش کرنا بعینہ اس پانی میں غوطہ لگانا ہے جو سر سے گزر چکا ہے۔

راقم الحروف نے شیخ کے ارشادات بختاور خاں سے بیان کئے، خان مذکور نے فرمایا کہ ان کلمات کو ایک کاغذ پر لکھ دو، میں نے حکم کی تعمیل کی، اور بختاور خاں نے یہ نوشتہ قبلہء عالم کے حضور میں پیش کیا، جہاں پناہ نے خان مذکور سے فرمایا کہ صرف اسی قدر اعتقاد مت رکھو شیخ عبدالعزیز جیسے فاضل نے اس طرح فرمایا ہے ہم کو جو خوف ہے وہ عاقبت کا ہے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدا کی بارگاہ میں ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔

شیخ مذکور کے بجائے اشرف خاں داروغہء عرض مکرر مقرر فرمایا گیا، امام وردی خاں کو فوج دار سہارنپور بنایا گیا، اور اس کے تغیر سے محمد یار خاں، داروغہء قورخانہ مقرر ہوا، محمد علی خاں کے تغیر سے محسن خاں داروغہء چینی خانہ مقرر فرمایا گیا۔

اٹھائیس جمادی الاوّل کو حامد خاں بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا اور اپنے مرحوم باپ کے بجائے داروغگی خاص چوکی کی خدمت پر مامور ہو کر خلعت کے عطیے سے سرفراز کیا گیا، بجائے حامد خاں کے افتخار خاں اجمیر میں متعین کیا گیا، قوام الدین کشمیر سے آستانہء والا پر حاضر ہو کر عطیہء خلعت سے فیض یاب ہوا، مغل خاں کے تغیر سے عبدالرحیم خاں آختہ بیگی کی خدمت پر مامور ہوا، لطف اللہ خاں کو یہ تمغہء اعزازی حاصل ہوا کہ خان مذکور قلعہ میں پالکی پر سوار حاضر ہوا کرے۔

دکن کے حالات

دکن کے واقعہ نگار کے معروضے سے معلوم ہوا کہ دلیر خاں و حریفاں گولکنڈہ میں شدید و خونریز لڑائی واقع ہوئی، ایک فیل بان کے زخم سے ہلاک ہوا، دلیر خاں کے ہاتھی کو ایک گولی لگی جو خدمت گار کہ خان کے عقب میں ہاتھی پر سوار تھا، بان کے زخم سے فوت ہوا، اور اس کی آگ خاں مذکور کے گریبان میں بھی لگی، لیکن چھاگل کے پانی سے فرو کر دی گئی، حریف کا ایک گروہ ہلاک ہوا، اور دلیر خاں کے بھی اکثر سپاہی میدان جنگ میں کام آئے، دلیر خاں لشکر کی خبر پا کر جنگ کناں شام کے وقت اپنے خیمہ کو واپس آیا۔

چھ ذی الحجہ کو شاہ عالم بہادر کابل سے آستانہء شاہی پر حاضر ہوئے اور خلعت خاصہ و جیغہء

مرصع کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے، سلاطین والا تبار و دیگر امرائے شاہ عالم بھی جواہرات و خلعت کے عطیات سے سعادت اندوز ہوئے۔

سیواجی کا مونگی پٹن پر حملہ

دسویں ذی الحجہ کو نماز و قربانی کے مراسم ادا فرمائے گئے، چھبیس ربیع الاوّل کو معلوم ہوا کہ سیواجی نے مونگی پٹن کو تاخت و تاراج کیا۔

سورت کے واقعہ نگار کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ ایک گھوڑی نے تین پاؤں کا بچہ جنا، تیسرا پاؤں سینہ سے متصل ہے، اور بچہ ہر سہ پاؤں سے چلتا ہے۔

دختر شہزادہ مراد بخش، خواجہ یعقوب برادر زادہ خواجہ صالح نقش بندی کے حبالہء عقد میں دی گئی، اور نوشہ کو خلعت و اسپ با ساز طلاء و جیغہء سنگ پشم و چہار ہزار روپیہ نقد و ایک مادۂ فیل مرحمت فرمائے گئے، سربلند خاں خواجہ یعقوب کو پہلے نواب قدسیہ بیگم صاحبہ کے در دولت پر ادائے آداب کے لئے لے گیا بعد ازاں مسجد اکبر آبادی میں خطبہء نکاح پڑھا گیا اور دو لاکھ روپیہ دینِ مہر مقرر فرمایا۔

خواجہ بہاء الدین پسر خواجہ پارسا کا نکاح دختر شہزادہ سلیمان شکوہ سے کیا گیا، خواجہ بہاء الدین کو بھی مذکورہ بالا مراحم خسروانہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

سلطان الدین ولد سید محمد سجادہ نشین خانقاہ حضرت قطب عالم رحمتہ اللہ علیہ کو احمد آباد جانے کی اجازت مرحمت ہوئی اور خلعت و مادۂ فیل و نیز ایک ہزار روپیہ کا انعام عطا ہوا۔

سترہ تاریخ کو قوام الدین خاں کو صوبہ دار لاہور مقرر فرمایا گیا اور رحمت خاں کے تغیر سے کامگار خاں خدمت بیوتات پر متعین کیا گیا۔

سیّد محمد بیجاپوری کا وظیفہ

حضرت سید محمد بیجاپوری جو حضرت غوث الاعظم قدس سرہ العزیز کی اولاد اور شہر بیجاپور کے بے حد معزز و مکرم بزرگ تھے، آستانہء والا پر حاضر ہوئے قبلہء عالم و عالمیان نے جناب سید کو چھ ہزار روپیہ سالانہ کے وظیفہ سے مطمئن خاطر فرمایا۔

پچیس جمادی الاوّل کو بادشاہ زادہ محمد اکبر ناظم صوبہء ملتان مقرر فرمائے گئے، جہاں پناہ نے شہزادہ مذکور کو خلعت خاصہ و مالائے مروارید و گلو آویز لعل، دو اسپ با ساز طلاء و فیل مع جھول مرصع مرحمت فرمائے صفی خاں شہزادہ کی خدمت پر متعین ہوا اور عبدالرحیم خاں اس کا نائب مقرر فرمایا گیا۔

شہزادہ محمد عظیم کا نکاح

کیرت سنگھ کی دختر شہزادہ محمد عظیم کے حبالہء عقد میں دی گئی، جہاں پناہ نے ترسٹھ ہزار کے جواہرات و چوڈول طلائی اور ایک پالکی نقرئی و پانچ ڈولیاں چاندی سے منڈھی ہوئی عروس کے جہیز میں عطا فرمائیں، اور خود شاہ زادہ کو کتخدائی کے روز خلعت خاصہ و مالائے مروارید و کلغی مرصع مرحمت فرمائی گئی۔

عادل خاں بیجاپوری کے پیش کش قیمتی گیارہ لاکھ قبول فرمائے گئے۔

ایک عجیب وغریب آئینہ

عمدہ اعیان مملکت اخلاص نواب شائستہ خاں بہادر بنگالہ سے آستانہ شاہی پر حاضر ہو کر خلوت میں شرف قدم بوسی سے فیض اندوز ہوا، جہاں پناہ نے اپنے باوفا امیر کو خلعت خاصہ و خنجر دستہ مرصع با ساز مینا با علاقہ اور طلائی چتر وغیرہ اشیاء بطور انعام مرحمت فرمائیں، قبلہء عالم نے علاوہ ان انعامات کے عصائے سنگِ پشم جو خاص دست مبارک میں رہتا تھا، امیر الامراء کو عطا فرما کر اس کی قدر و منزلت دہ چند کیا گیا، امیر الامراء کے پیش کش یعنی تیس لاکھ روپے نقد و جواہرات قیمتی چار لاکھ ملاحظہ والا میں پیش ہو کر قبول فرمائے گئے، ان تحائف میں ایک آئینہ تھا جس کی خاصیت یہ تھی کہ تربوز اس کے سامنے رکھنے سے خشک ہو جاتا تھا، اور خشک پھل سے پانی کے قطرات ٹپکنے لگتے تھے۔

ایک نادر صندوق

انہیں تحائف میں ایک عجیب وغریب صندوق تھا، جس کے ایک طرف ہاتھی بندھا تھا اور دوسری جانب بکرا۔

ہاتھی اس صندوق کو نہ کھینچ سکتا تھا اور بکر اصندوق کو مع ہاتھی کے کھینچ لے جاتا تھا۔

امیر الامراء کی درخواست کے مطابق یہ امیر انتہائی اعزاز سے سرفراز فرمایا گیا، اس عزت افزائی سے امیر الامراء بہادر در دولت خداداد تیموری کے بہترین واعلیٰ بندگان شاہی میں داخل ہوا، جہاں پناہ نے حکم دیا کہ امیر الامراء غسل خانہ ءمبارک تک پالکی سوار آیا کرے اور نیز یہ کہ شاہ عالم بہادر کی نوبت کے بعد شائستہ خاں کے دروازے پر نوبت بجائی جائے، امیر الامراء نے شاہی حکم کے مطابق شاہ عالم بہادر کی ملازمت میں حاضر ہو کر دو سو اشرفیاں اور دو ہزار روپے نذر پیش کئے، شاہ عالم بہادر نے کھڑے ہو کر امیر الامراء سے معانقہ کیا اور اپنی مسند کے متصل بٹھا کر خلعت باچہار قب وخنجر دستہ پشم عطا کیا۔

چھ جمادی الاوّل کو حسن علی خاں کے تغیر سے امیر الامراء صوبہ دار اکبر آباد مقرر فرمایا گیا، جہاں پناہ نے نواب شائستہ خاں کو خلعت خاصہ دو دو راس اسپ عربی وعراقی مرحمت فرمائے۔

عبدالرحمٰن بخشی کی خطاب خانی سے برطرفی

عبدالرحمٰن بخشی واقعہ نویس دکن اس جرم پر خطاب خانی سے برطرف کیا گیا کہ جو رقم بہادر خاں نے مرزبان سے وصول کی تھی اس کا صحیح اندراج نہیں کیا، بہادر خاں صوبہ داری دکن سے معزول کر دیا گیا، اور اپنے مستقر سے آستانہ ءشاہی پر حاضر ہوا، اس امیر سے بعض لغزشیں ہوگئی تھیں، اور مال سرکاری میں خیانت کرنے و نیز پیش کش مقررہ کو بہ تاخیر ارسال کرنے کے جرم میں بادشاہ ادب آموز نے مجرم کو منصب وخطاب سے برطرف فرما کر اس کے مال ومتاع کی ضبطی کے احکام نافذ فرمائے تھے، بہادر خاں شرف حضوری سے باریاب ہوا، اور اس نے اصل واقعات سماعت مبارک تک پہنچائے، بادشاہ جرم بخش نے اس امیر کو ناکردہ گناہ تصور فرما کر اپنے قدیم نمک خوار کا قصور معاف فرمایا۔

دلیر خاں گیارہ ربیع الاوّل کو عفو تقصیر کی عزت سے سرفراز ہوا، اور بدستور سابق منصب و خطاب پر بحال فرمایا گیا، شاہی حکم کے مطابق عاقل خاں اس امیر کو شاہ عالم بہادر کی خدمت میں لے گیا اور شہزادۂ مذکور نے دلیر خاں کو خلعت وخنجر قیمتی سات ہزار مرحمت فرمائے۔

جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ بنگال کا معزول صوبہ دار عظیم خاں کو کہ بہار جا رہا تھا لیکن قضائے

الٰہی سے بارہ ربیع الآخر کو ڈھاکہ میں فوت ہو گیا بادشادہ زادہ محمد اعظم صوبہ دار صوبہء پٹنہ جلد اس طرف روانہ ہوئے، نوراللہ خاں شہزادہ مذکور کی نیابت میں صوبہء اڑیسہ کی نظامت پر فائز ہوا، سیف خاں صوبہ دار بہار مقرر ہوا، اعظم خاں کا برادر خرد خان جہاں بہادر خلعت کے عطیہ سے سرفراز ہو کر گوشہء ماتم سے باہر آیا، اس کے دونوں بیٹوں کو بھی خلعت مرحمت ہوئے، اعظم خاں کے فرزندوں صالح خاں وغیرہ کے لئے گرز بردار کی معرفت خلعت روانہ فرمائے گئے، متوفی کا مال ومتاع یعنی دو لاکھ روپے اور ایک لاکھ بارہ ہزار اشرفیاں ضبط سرکار ہوئیں۔

شاہ عالم بہادر کی دکن کی طرف روانگی

گیارہ شعبان کو شاہ عالم بہادر لشکر حشر انبوہ کے ہمراہ صوبجات دکن کے انتظام کرنے کے لئے روانہ فرمائے گئے۔

جہاں پناہ نے خلعت خاص با بالا بند مرصع و مالائے مروارید وجیغہ و تین راس اسپ و فیل با ساز طلاء و ایک لاکھ اشرفیاں نقد اور اصل چھ کرور دام اضافہء چہار کرور مرحمت فرمائے، دیگر شہزادے بھی اضافہء مناصب وعطیات جواہر سے سرفراز فرمائے گئے، اس لشکر کے ہر متعینہ امیر کو خلعت واسپ وفیل مرحمت ہوئے، قوام الدین خاں ناظم صوبہء لاہور کو جموں کی فوج داری مرحمت ہوئی، راجہ جسونت سنگھ بوندیلہ، چپت بوندیلہ کے بیٹوں کی سرکوبی وتنبیہ کے لئے روانہ فرمایا گیا، بادشاہ فریادرس کو معلوم ہوا کہ لاہور میں غلہ بے حد گراں ہو گیا ہے، قبلہء عالم نے حکم دیا کہ سرکاری غلہ خانے میں بیس روپیہ یومیہ کا اضافہ فرمایا جائے۔

کابل کے حالات

کابل کے واقعات سے معلوم ہوا کہ والیان بلخ و بخارا ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں اور ہر دو ممالک میں ایسا شدید قحط ہے کہ انسان مردخوری پر زندگی بسر کر رہے ہیں، چودہویں شعبان کو معلوم ہوا کہ جمدۃ الملک اسد خاں برہانپور سے اورنگ آباد روانہ ہوا، خان بیگ ولد سبحان بیگ آتش خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔

فرمان مبارک صادر ہوا کہ کفایت خاں وعنایت خاں یک شنبہ و پنج شنبہ کو عرض مطالب

دیوانی کے لئے حضور میں حاضر ہوا کریں۔

آسائش بانو بیگم، دختر مراد بخش وزوجہ محمد صالح نے وفات پائی۔

امیر خاں صوبہ دار کابل، ستائیس ربیع الآخر کو اپنے محال پر پہنچ گیا۔

جون پور میں شدید بارش

جون پور کے واقعہ نویس نے اطلاع دی کہ سترہویں ربیع الآخر سے شدید بارش کا سلسلہ شروع ہوا، غیرت خاں مشرقی ایوان پر بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً برق گری چھ آدمی ہلاک ہوئے، اور چار اشخاص مدت کے بعد ہوش میں آئے، خان مذکور کے پاؤں کو صدمہ پہنچا، لیکن جان سلامت ہے۔

انیسویں جمادی الآخر کو شہزادۂ محمد اعظم جہاں نگر میں داخل ہوئے۔

شفیع خاں دیوان بنگالہ کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ تمام سال کی تنخواہ کے علاوہ امیر الامراء نے ایک کرور تیس لاکھ روپے زائد صرف کئے، حکم ہوا کہ اس رقم کا امیر الامراء سے مطالبہ کیا جائے۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا بائیسواں سال

1089ھ/1679ء

رمضان کا مقدس مہینہ آیا اور بادشاہ عالم و عالمیان پیر و مرشد جہانیاں نے طاعت الٰہی پر کمر باندھی اور شبانہ روز کی عبادت گزاری سے ذخیرۂ سعادت جمع فرمایا۔

دسویں رمضان کو حکم ہوا کہ میر مغیث دیوانی بنگالہ جا رہا ہے ایک سر پیچ مرصع قیمتی پینتیس ہزار شہزادہ محمد اعظم کے لئے اپنے ہمراہ لے جائے۔

سالگرہ کے روز شہزادہ محمد کام بخش کو جن کا سن اب بارہ سال کا ہو چکا تھا مالائے مروارید و سر باگل مرصع مرحمت فرمائی۔

خواجہ محمد صالح نقش بندی نے دختر شیخ میر مرحوم سے عقد کیا اور عطیہ ءخلعت سے سرفراز فرمایا گیا، غیاث الدین خاں کی وفات پر عبدالرحیم خاں و عبدالرحمن خاں اس کے بھائیوں اور رضی الدین خاں متوفی کے فرزند کو خلعت ماتمی عطا ہوئے۔

بہرہ مند خاں و شرف الدین کو ان کی والدہ کی وفات پر خلعت ماتمی عطا ہوئے، اور یہ امیر گوشہء سوگواری سے باہر نکلے، تہور خاں کے تغیر سے ابوالمحمد بیجاپوری اُودھ کا فوج دار مقرر فرمایا گیا، داراب خاں ایک شائستہ لشکر کے ہمراہ راجپوتان کھنڈیلہ کی تنبیہ اور وہاں کے بُت خانہ کے انہدام کے لئے روانہ فرمایا گیا، بہرہ مند خاں کو داراب خاں کی نیابت عطا ہوئی، اور بہرہ مند خاں کے تغیر سے خواجہ میرزا داروغہء فیل خانہ مقرر فرمایا گیا۔

راجہ جسونت سنگھ کی وفات

غرۂ شوال کو عیدگاہ میں دوگانہء عیدالفطر ادا فرمایا گیا، پنج شنبہ کو پشاور کے معروضہ سے معلوم

ہوا کہ سرگروہ راجگاں ہند مہاراجہ جسونت سنگھ نے چھ ذی قعدہ کو وفات پائی۔

دسویں ذی الحجہ کو نماز وقربانی کے مراسم ادا فرمائے گئے، لطف اللہ خاں کے تغیر سے بہرہ مند خاں کو خدمت میر بخشی گری عطا ہوئی، طاہر خاں مہاراجہ متوفی کے دمن جودھپور کا فوج دار مقرر فرمایا گیا، اور خدمت گارخاں کو تعلقہ داری اور شیخ انور کو خدمت امانت عطا ہوئی، عبدالرحیم خاں جودھپور کا کوتوال مقرر ہوا۔

جہاں پناہ کا پہلی مرتبہ دارالخیر اجمیر روانہ ہونا

چھ ذی الحجہ کو قبلہء عالم تخت گاہ سے اجمیر روانہ ہوئے، کامگار خاں تخت گاہ کا قلعہ دار وفولاد خاں فوجدار مقرر ہوا، یہ دونوں امیر بھی دیگر حکام کی طرح بہ اعزاز تمام رخصت فرمائے گئے۔

چھ محرم کو خان جہاں بہادر حسن علی خاں و دیگر امراء کی ہمراہی میں راجہ جسونت سنگھ کے ممالک کے انتظام کے لئے روانہ ہوا، تیرہ محرم کو کنور کشن سنگھ نبیرۂ راجہ سنگھ اپنے وطن سے آستانہء شاہی پر حاضر ہوا۔

عبدالرحیم خاں کے تغیر سے روح اللہ بیگ خدمت آختہ بیگی پر متعین فرمایا گیا۔

سولہویں محرم الحرام کو حمدۃ الملک اسد خاں دکن سے واپس ہو کر کشن گڑھ میں شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوا۔

اٹھارہویں محرم الحرام کو قبلہء عالم اجمیر پہنچ گئے، بادشاہ دیں پناہ نے دارالخیر میں ورود فرماتے ہی سب سے پہلے حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے روضہء پاک پر حاضر ہو کر سعادت زیارت حاصل فرمائی، آستانہء چشتیہ پر حاضری دے کر بادشاہ دولت خانہ پر تشریف لائے۔

پچیسویں محرم الحرام کو مہاراجہ متوفی کے وکیل نے عرض کیا کہ راجہ کی دو رانیاں حاملہ تھیں، جسونت سنگھ کے لاہور پہنچنے کے بعد راجہ کے محل میں چند ساعت کے تفاوت سے دو فرزند پیدا ہوئے۔

انتیسویں محرم الحرام کو بادشاہ زادہ محمد اعظم کے ملازم میرزا شاہ رُخ نے فتح گواہٹی کی عرض داشت ملاحظہء عالی میں پیش کی اور ایک ہزار روپیہ انعام پایا۔

سترہویں صفر کو شہزادہ محمد اکبر ملتان سے خدمت شاہی میں حاضر ہوئے، اور خلعت بانیمہ آستین و بالا بند کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے، ملتان کے واقعہ نویس نے اطلاع دی کہ ٹھٹھہ کا معزول صوبہ دار غیرت خاں، بادشاہ زادہ محمد اکبر کی نیابت میں ملتان پہنچ گیا صفی خاں لاہور روانہ ہوا، سید عبداللہ مہاراجہ جسونت سنگھ کے اموال کی ضبطی کے لئے قلعہ سیوانہ روانہ فرمایا گیا، امیر الامراء کو خلعت خاصہ بانیمہ آستین و بالا بند و خنجر مرصع عطا فرما کر اکبر آباد روانہ ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

کھنڈیلہ کے مندروں کا انہدام

داراب خاں جو شاہی حکم کے مطابق کھنڈیلہ کے شورہ پشتوں کی تنبیہ اور بُت خانوں کو منہدم کرنے کے لئے روانہ ہوا تھا، پانچ صفر کو اپنی آماجگاہ پر پہنچا، ایک سو سے زیادہ راجپوتوں نے مقابلہ کیا جو سب کے سب ہلاک ہوئے، کھنڈیلہ، سانومیلہ و دیگر اطراف ونواح کے تمام مندر زمین کے برابر کر دیئے گئے۔

افتخار خاں کے تغیر سے تہور خاں اجمیر کا فوج دار مقرر ہوا۔ رانا راج سنگھ کے وکلاء کو اجازت مرحمت ہوئی کہ رانا کی درخواست ملاحظہء عالی میں پیش کریں۔ رانا نے درخواست کی تھی کہ اس کے فرزند کنور جے سنگھ کو بارگاہ شاہی میں حاضر ہونے کے شرف عطا ہوا، رانا کا معروضہ قبول فرمایا گیا اور محمد نعیم اس کی راہ نمائی کے لئے مقرر ہوا۔

انتیس صفر کو اندر سنگھ ولد راؤ رائے سنگھ نے خیمہ تک جے سنگھ کا استقبال کیا اور اسے بارگاہ شاہی میں لے آیا، جہاں پناہ نے جے سنگھ کو خلعت خاصہ و مالائے مروارید و زمرد اریسی سنگ پشم پہنچی مرصع و مادۂ فیل کے عطیات سے سرفراز فرمایا۔

فیض اللہ خاں مراد آباد سے اور ممتاز خاں مالوہ سے بارگاہ شاہی میں حاضر ہوئے تھے، ہر دو امیروں کو مستقر واپس جانے کی اجازت مرحمت ہوئی۔

معتمد خاں کے تغیر سے امان اللہ خاں گوالیار کا فوج دار مقرر فرمایا گیا۔

ساتویں صفر کو قبلہء عالم نے اجمیر سے روانہ ہو کر عزۂ ربیع الاوّل کو تخت گاہ میں نزول اجلال فرمایا، چونکہ بادشاہ دیں پناہ نے احکام شریعت اسلام کے رواج دینے اور کفر و بے دینی کا قلع قمع

کرنے کا مصمم ارادہ فرمالیا تھا، اس لئے فرمان واجب الاذعان صادر ہوا کہ موافق حکم الٰہی وارشاد رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تخت گاہ نیز صوبجات کے ذمیوں سے جزیہ وصول کیا جائے۔

بارہ ربیع الاوّل کو شہزادہ محمد اکبر کو لاہور جانے کی اجازت ہوئی، اور خلعت خاصہ بائیمہ آستین وسر پیچ مرصع مرحمت فرمائے گئے۔

محمد زماں خاں لوحانی کو خطاب خانی مرحمت ہوا اور شاہ بیگ خاں کاشغری، عبداللہ خاں کے نام سے موسوم ہوا۔ افتخار خاں وغیرہ عنایات بادشاہی سے سرفراز فرما کر شہزادہ کے ہمراہ روانہ کئے گئے، اٹھارہ ربیع الاوّل کنور جے سنگھ پسر رانا کو خلعت وسر پیچ مروارید وآویزۂ لعل وطرۂ مرصع و اسپ عربی باساز طلاء وفیل مرحمت ہوئے، اور اس کو وطن جانے کی اجازت عطا ہوئی رانا راج سنگھ کے لئے فرمان خوشنودی کے ہمراہ خلعت وسر پیچ مرصع اور بیس ہزار روپے روانہ فرمائے گئے۔

جودھ پور کے بُت خانے

چوبیس ربیع الآخر کو خان جہاں بہادر جودھپور سے بُت خانوں کو منہدم کر کے آستانۂ شاہی پر حاضر ہوا اور کئی گاڑیاں بتوں سے لدی ہوئی اپنے ہمراہ لایا، قبلۂ عالم نے خان جہاں کی کارگزاری کی بے حد تعریف کی اور حکم دیا کہ یہ اصنام جن میں اکثر مرصع وطلائی ونقرئی ومسی وبرنجی تھے، جلوخانے کے دروازوں اور مسجد کے زینوں کے نیچے ڈال دیئے جائیں تاکہ پامال ہوں، عرصہ تک یہ بت ان مقامات پر پڑے رہے یہاں تک کہ قطعاً نیست ونابود ہو گئے۔

پچیسویں تاریخ اندر سنگھ ولد راؤ رائے سنگھ نبیرۂ امر سنگھ اپنے چچا راجہ جسونت سنگھ کی وفات کے بعد خطاب راجگی وخلعت خاصہ وشمشیر باساز مرصع واسپ باساز طلاء وفیل وعلم وطوغ ونقارہ کے عطیات سے سرفراز فرمایا گیا، اندر سنگھ نے چھتیس لاکھ روپے نذر پیش کی جو قبول فرمائے گئے، قدیم زمانہ میں دستور تھا کہ فرمانروا اپنے ہاتھوں سے عالی مرتبہ راجاؤں کی پیشانی پر قشقہ لگاتے تھے، عہد معدلت عالم گیری میں راجہ رام سنگھ کی پیشانی پر اسد خاں نے بموجب حکم قشقہ لگایا، لیکن آخر میں یہ بھی موقوف فرما کر صرف تسلیم کافی سمجھی گئی۔

داراب خاں کی وفات

صفی خاں کے تغیر سے عاقل خاں خدمت بخشی گری پر فائز ہوا، پچیس تاریخ داراب خاں

یعنی مختار نے وفات پائی، جان سپار خاں اس کے برادر اور محمد تقی خلیل ومحمد کامیاب مرحوم کے بیٹوں اور اشکر خاں اس کے داماد کو ماتمی خلعت عطا ہوئے، داراب خاں کی وفات پر روح اللہ خاں میر آتش مقرر فرمایا گیا، اور روح اللہ خاں کے بجائے بہرہ مند خاں کو خدمت آختہ بیگی اور اعتقاد خاں کو بخشی گری احدیاں کا عہدہ عطا ہوا۔

بادشاہ زادۂ محمد معظم کی فوج کے واقعہ نویس نے اطلاع دی کہ شرزہ خاں بیجاپوری، شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوا، جہاں پناہ نے شرزہ خاں کو رستم خاں کے خطاب سے سرفراز فرما کر فرمان خوشنودی کے ہمراہ اس کے لئے خلعت واسپ وفیل ونقارہ روانہ فرمائے۔

راجہ جسونت سنگھ نے جس وقت دارالملک کابل میں وفات پائی اس کے کوئی بیٹا نہ تھا، راجہ کی وفات کے بعد اس کے معتمد ملازمین یعنی سونک ورگھناتھ بہائی وسنجھور ودرگا داس وغیرہ نے جیسا کہ قبل مذکور ہوا جہاں پناہ کے حضور میں عرض داشت روانہ کی کہ راجہ کی دو بیویاں حاملہ ہیں، راجہ کے متعلقین لاہور پہنچے اور دونوں رانیوں کے بطن سے فرزند پیدا ہوئے، راجہ کے ملازمین نے اصل واقعہ عرض کر کے یہ التجا کی کہ ان کو منصب وراج عطا فرمایا جائے، قبلہء عالم نے حکم دیا کہ راجہ کے ہر دو فرزند آستانہء شاہی پر حاضر کئے جائیں، جب یہ بچے سن تمیز کو پہنچیں گے، تو ان کو منصب و راج مرحمت فرمایا جائے گا۔

جسونت سنگھ کے ملازمین کی ناعاقبت اندیشی

جسونت سنگھ کے ناعاقبت اندیش ملازمین شاہجہان آباد پہنچے اور اپنی درخواست کے قبول فرمانے میں بے حد مبالغہ واظہار عاجزی کیا، اس دوران میں ایک بچہ بھی فوت ہو گیا۔

شاہی فرمان

قبلہء عالم کو معلوم ہوا کہ اس کمینہ خصائل گروہ کا ارادہ ہے کہ دوسرے بچہ کو اس کی دونوں ماؤں کے ساتھ جودھپور لے جائیں اور وہاں پہنچ کر فتنہ وفساد کا بازار گرم کریں، جہاں پناہ نے سولہ جمادی الآخر کو فرمان جاری فرمایا کہ جسونت سنگھ کا فرزند اور متوفی کی دونوں رانیاں روپ سنگھ راٹھور کی حویلی سے منتقل کر کے نورگڑھ میں بہ حفاظت رکھے جائیں، اور فولاد خاں کوتوال وسید احمد خاں

چوکی خاص کے ملازمین کے ہمراہ وحید خاں پسر داؤد خاں وکمال الدین خاں پسر دلیر خاں وخواجہ میر احسن جس نے صلابت خاں کا خطاب حاصل کیا بادشاہ زادہ محمد سلطان مرحوم کے رسالے کے ساتھ اس گمراہ فرقے کو اس کے ارادۂ بد سے روکیں اس امر کی پوری نگہداشت کریں کہ یہ گروہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہونے پائے، جہاں پناہ نے فرمان مبارک میں یہ صراحت فرمادی کہ اگر یہ بد بخت گروہ اپنی شامت اعمال سے برسر پیکار ہوتو ان کو ان کے کردار کی قرار واقعی سزا دے کر ان کو نیست ونابود کر دیا جائے۔

حکم عدولی

معتبر امیروں نے فرمان مبارک کے بموجب پیشتر ان بدنصیبوں کو نصیحت کی لیکن ان برگشتہ بخت ملازمین پر کچھ اثر نہ ہوا اور اپنے نفع ونقصان میں کچھ تمیز نہ کر سکے، ہندوؤں نے مسلمان امیروں کا مقابلہ کیا طرفین سے ایک گروہ میدان جنگ میں کام آیا، فرقہ ءراجپوت نے جب دیکھا کہ ان کو غلبہ نہیں ہوسکتا، تو راجہ کی دونوں رانیوں کو جو سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لئے میدان کارزار میں ان کے ہمراہ تھیں قتل کر ڈالا اور دوسرے بچہ کو جو ایک شیر فروش کے مکان میں مخفی کر دیا گیا تھا اسی حال میں چھوڑ کر بے حد پریشانی وکمال اضطراب کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے فولاد خاں کو اس بچے کے حال سے آگاہی ہوئی، اور اس نے راجہ کے فرزند کو شیر فروش سے لے کر آستانہء شاہی پر حاضر کیا، جہاں پناہ نے حکم دیا کہ راجہ کی کنیزوں سے جو نظر بند ہو کر آئی ہیں دریافت کیا جائے کہ یہ لڑکا کون ہے، کنیزوں نے اقرار کیا کہ بچہ مہاراجہ کا صلبی فرزند ہے، جہاں پناہ نے لڑکے کو محمدی راج کے نام سے موسوم کر کے اس کی پرورش و پرداخت ملکہ فلک احتجاب نواب زیب النساء بیگم کے سپرد فرمائی، فولاد خاں دوسرے روز اس بچہ کے زیورات اور دوسری چیزیں لے کر حاضر ہوا، اس ہنگامہ میں راجہ و نیز رانیوں و دیگر راجپوتوں کے مال ومتاع تاراجیوں کے قبضہ میں آئے اور جو مال کہ متصدیاں سرکار نے بطور ضبطی حاصل کیا بیت المال کے کوٹھے میں داخل کیا گیا۔

شورہ پسندوں کا حشر

میدان جنگ میں دونوں رانیوں و رنچھور رئیس راجپوتان اور دوسرے تیس راجپوتوں کے

لاشے پائے گئے، بقیہ افراد جو مسلمانوں سے شکست کھا کر فرار ہوئے تھے، چودہ جمادی الآخر کو جودھپور پہنچے اور دُرگا اور دیگر شورہ پست افراد کے اغوا سے فتنہ وفساد کی آگ روشن ہوئی، یہ فتنہ پرداز دوجعلی لڑکوں یعنی رن متھن جو جلد ہلاک ہوا، اور راجیت سنگھ کو جسونت سنگھ کے فرزند مشہور کر کے برسر پیکار ہوئے، طاہر خاں فوج دار راجپوتوں کے مقابلہ میں شاہی احکام کی پابندی نہ کر سکا اور اس جرم میں معزول کیا گیا، اندر سنگھ اپنی ناقابلیت کی وجہ سے ملک کا انتظام نہ کر سکا اور اس فتنہ کو فرو کرنا اس کی طاقت سے باہر نظر آیا، یہ ناقابل راجہ آستانہ والا پر طلب کر لیا گیا۔

بیس رجب کو جہاں پناہ باغ خضر آباد میں وارد ہوئے، اور ایک جرار لشکر سربلند خاں کے تحت جودھپور پر قبضہ وفتنہ پردازان کو پامال وتباہ کرنے کے لئے روانہ فرمایا گیا۔

چھبیس رجب کو معلوم ہوا کہ راجہ جسونت سنگھ کے ملازمین میں ایک شخص مسمی راج سنگھ نے بہت بڑی فوج فراہم کر کے تہور خاں فوج دار اجمیر سے مقابلہ کیا، تین روز کامل لڑائی کا سلسلہ جاری رہا اور معرکہ کارزار نے تیر وتفنگ سے گزر کر تلوار وگرز کی بے پناہ ضرب تک طول کھینچا، لیکن آخر کار اقبال شاہی نے اپنا کام کیا اور تہور خاں کو فتح حاصل ہوئی، راج سنگھ ایک گروہ کثیر کے ہمراہ ہلاک ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس معرکہ میں راجپوت ایسے پسپا و پامال ہوئے کہ پھر کبھی ان کو فتنہ پردازی و جنگ آزمائی کی ہمت نہ ہوئی ان سرکشوں میں اکثر تو تہ تیغ ہوئے اور بقیہ نے صحرانوردی کے عالم میں جان دی۔

دوسری شعبان کو شہزادہ محمد اکبر لاہور سے خدمت والا میں حاضر ہوئے جہاں پناہ نے شہزادۂ مذکور کو خلعت وجواہرات قیمتی 77 ہزار روپے خواجہ ہمت کی معرفت عطا فرمائے۔

قبلہء عالم کا تخت گاہ سے دوبارہ اجمیر کا سفر فرمانا

سات شعبان 22 جلوس مبارک کو جہاں پناہ نے سرکشوں کو پامال فرمانے کے ارادے سے سفر کیا شہزادہ محمد اکبر اس روز قصبہء پالم سے رخصت کر دیئے گئے، تاکہ ورود مبارک سے پیشتر اجمیر پہنچ جائیں، شہزادہ کو خلعت خاصہ مع بالا بند اور سات گھوڑے مرحمت ہوئے، محمد اکبر کے تمام ہم رکاب امیر بھی شاہانہ نوازش سے سرفراز فرمائے گئے۔

اعتماد خاں برہان الدین کو تخت گاہ کی دیوانی اور امیر ہدایت اللہ کو بخشی گری و واقعہ نویسی کی خدمتیں عطا ہوئیں، افلاطون خان قلعہ دار عبداللہ چینی ناظر بیوتات و نورالحق پسر قاضی عبدالوہاب قاضی عدالت و ابوسعید خویش دوامادم قاضی مذکور داروغہ عدالت مقرر فرمائے گئے، دیگر ملازمین دولت مہمات سلطنت کو انجام دینے کی غرض سے مختلف عہدوں پر متعین ہو کر رخصت فرمائے گئے۔

تیرہ تاریخ امیر الامراء وکلائے شہزادۂ محمد اعظم کے تغیر سے صوبہ دار بنگالہ مقرر فرمایا گیا، صفی خاں کو اکبر آباد کی صوبہ داری مرحمت ہوئی ان تقررات کے فرامین و خلعت، گرز برداروں کی معرفت روانہ فرمائے گئے۔

بیس شعبان کو محتشم خاں صوبہ دار میوات مقرر فرمایا گیا، انیس شعبان کو قبلہء عالم نے حضرت غریب نواز سلطان الہند رحمتہ اللہ علیہ کے روضہء مبارک کی سعادت زیارت حاصل کر کے محلات جہانگیری واقعہء کنار تالاب اناساگر میں نزول اجلال فرمایا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا تیئسواں سال

1090ھ/1680ء

بابرکت ماہ صیام کا آغاز ہوا اور اہلِ عالم، فلاح دارین سے بہرہ اندوز ہوئے، خدیو خدا آگاہ نے تمام ماہ طاعت وعبادت میں بسر فرمایا۔

عزۂ رمضان کو ہمت خاں صوبہ دار الٰہ آباد شرف قدم بوسی سے سرفراز ہوا، اور شہزادہ محمد اکبر کی خدمت میں روانہ فرمایا گیا۔

ہمت خاں کو خلعت خاصہ واسپ باساز طلا مرحمت ہوئے اور شہزادہ مذکور کے لئے خاں مذکور کی معرفت سرپیچ مرصع ارسال فرمایا گیا۔

ساتویں رمضان کو شہزادہ محمد اعظم کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ شہزادۂ مذکور کے محل میں دختر کیرت سنگھ کے بطن سے فرزند پیدا ہوا ہے، عرض داشت کے ہمراہ چار سو اشرفیاں نذر پیش کی گئیں، جہاں پناہ نے مولود کو سلطان محمد کریم کے نام سے موسوم کیا۔

قلعہ ءمنگل پر شاہی قبضہ

نویں رمضان کو دلیر خاں کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ قلعہ ءمنگل بیدہ سیواجی کے قبضے سے نکال لیا گیا، عزۂ شوال کو جہاں پناہ ادائے نماز کے لئے عیدگاہ تشریف لے گئے۔

سبحان سنگھ کے نام قلعے کی فتح کا فرمانِ تحسین صادر فرمایا گیا، حافظ محمد امین صوبہ دار احمد آباد آستانہ ءشاہی پر حاضر ہوا، صوبہ دار اور اس کے تمام ہمراہی عطیہ ءخلعت سے سرفراز فرمائے گئے۔

فاخر خاں کو تخت گاہ جانے کی اجازت ہوئی اور خلعت رخصت مرحمت فرمایا گیا، تہور خاں کو خلعت وترکش وکمان اور ایک زنجیر فیل مرحمت ہوئی اور خان مذکور ماندل ودیگر پرگنوں کے انتظام

کے لئے روانہ کیا گیا۔

اندر سنگھ مہسمج کی، رگھناتھ سنگھ کو سیانا و دھامان کی، اور محکم سنگھ کو قصبہ پور کی تھانہ داریاں عطا ہوئیں۔

غرۂ ذی قعدہ کو شہزادہ محمد اکبر کی عرض داشت پیش ہوئی، معروضہ کے ہمراہ نو سو اشرفیاں بھی بطور نذر ملاحظہ والا میں پیش کی گئیں، عرض داشت سے معلوم ہوا کہ شہزادے کے محل میں فرزند پیدا ہوا ہے، جہاں پناہ اس خبر مسرت اثر سے بے حد خوش ہوئے شہزادے کی نذر قبول فرمائی گئی اور مولود کو نیکو سیر کے نام سے موسوم کیا گیا۔

جہاں پناہ کا اجمیر شریف سے اودے پور تشریف لے جانا

ساتویں ذی قعدہ قبلہء عالم، رانا کی گوش مالی کے لئے اجمیر سے اُودے پور روانہ ہوئے، بادشاہ زادہ محمد اکبر اسی روز میرٹھ سے روانہ ہو کر مقام دیورانی میں شرف ملازمت سے فیض اندوز ہوئے۔

بادشاہزادہ محمد اعظم کا حسب الحکم اقدس بنگالہ سے آستانہ والا پر حاضر ہونا

قبلہء عالم و عالمیان کے احکام کی اس سعادت و اطاعت کے ساتھ فرمانبرداری کرنا اور موانع کے باوجود جن سے اکثر عظیم الشان مقاصد کے فوت ہونے کا اندیشہ تھا، فرمان شاہی کے مطابق روانہ ہونا اور اس قدر جلد سفر کی منزلیں طے کر کے سعادت قدم بوسی حاصل کرنا حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ زادگان سعادت اطوار ہی کا کام ہے۔

ملازمین ہمراہی جن کی راست بیانی میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے بیان کرتے ہیں کہ شہزادۂ مذکور نصف شب کے بعد پالکی میں سوار ہو کر آرام فرماتے تھے، مصطفےٰ کاشی ولہراسپ بیگ و قاسم بیگ وغیرہ نوبت بہ نوبت جلو میں چلتے تھے، اور نماز فجر کے بعد سے دوپہر تک گھوڑے پر سوار ہو کر راہ طے فرماتے تھے، سواری سے اترنے کے وقت دو یا تین اشخاص سے زیادہ ہمراہی نہیں پہنچ سکتے تھے، بقیہ ہمراہی یکے بعد دیگرے ملازمت میں حاضر ہو جاتے تھے، خیمہ و خرگاہ و محل و کارخانجات میر ہادی کے ہمراہ پٹنہ میں چھوڑ دیئے گئے تھے کہ متعاقب پہنچ جائیں گے، بادشاہزادے نے پٹنہ

سے بنارس تک سات روز میں سفر کیا اور اس تمام سفر میں نواب عالیہ جہاں زیب بانو بیگم ہمراہ تھیں، میر خاں و شاہ قلی خاں اس امر پر مامور تھے کہ نواب عالیہ کے ہودج کو منزل بہ منزل پہنچاتے رہیں یہ اشخاص شہزادے کے ورود کے پچیس روز بعد پہنچے، بادشاہ زادہ محمد اعظم بنارس سے جریدہ روانہ ہوئے، اور بارہ دن ایک پہر میں تمام راہ طے کر کے تیئیس ذی قعدہ کو شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہو گئے۔

جس روز کہ بادشاہ زادۂ مذکور چار پایہ چپر پر سوار ہوئے قاسم بیگ سے فرمایا کہ اب ترکش ہم کو بار گراں معلوم ہوتا ہے، مخاطب نے عرض کیا کہ فدوی کو عنایت ہو میں اس کو اٹھاؤں گا، بادشاہ زادہ نے فرمایا کہ تم اپنا ترکش کیا کرو گے، اس نے عرض کیا کہ اس کو اپنی پیٹھ پر باندھ لوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، پانچ سوار خوش اسپہ بادشاہ زادہ کے ہمراہ تھے، اکثر سواروں کو گھوڑے عنایت فرمائے گئے، بارہ سوار چار پیادے، ایک چوبدار ایک جریب کش دو گھڑیالی ہر وقت ہمراہ حاضر رہتے تھے۔

ایک روز قطع مسافت کے دوران میں جبکہ خود بادشاہ زادہ اور شہزادہ بیدار بخت چار پایہ چپر پر سوار سفر کی منزلیں طے کر رہے تھے شہزادہ پر تشنگی کا غلبہ ہوا ایک موضع کے قریب پہنچے جس کے کنارے ایک کنواں واقع تھا، آب کش پانی کا ایک پیالہ لایا اور بادشاہ زادہ نے دو اشرفیاں اسے عنایت فرمائیں، ایک بدمعاش نے یہ واقعہ دیکھا اور سمجھا گرز بردار کے پاس بے شمار اشرفیاں ہیں، یہ بد بخت سر راہ کھڑا ہو گیا اور کرخت آواز سے مزدوروں سے کہا کہ خبردار آگے نہ بڑھو، بادشاہ زادہ متوجہ نہ ہوئے اور نیز مزدور بھی اس کے منع کرنے سے نہ رُکے، اس اجل رسیدہ بد گہر نے سختی کی اور بادشاہ زادہ نے تیر کمان میں رکھ کر اس کی طرف پھینکا، تیر سینے میں بیٹھ گیا اور بد اندیش وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

ملازمین شاہی کے چند اشخاص بادشاہ زادہ کے عقب میں آ رہے تھے جن میں سے سہراب بیگ اس بد بخت کے سر پر پہنچا، اور تیر کو فوراً پہچان لیا کہ اس والا نژاد کے کمان سے نکلا ہے جس پر ہزار جانیں قربان ہیں سہراب بیگ نے اس سرگراں کا سر قلم کیا اور تیر اس کے سینہ سے نکال کر جلد سے جلد خدمت عالی میں پہنچا اور تیر سامنے پیش کر دیا، بادشاہ زادہ نے اس کے بعد فرمایا کہ ہر وقت جیب میں چند چرن دو آنہ چہار آنہ طلاء و نقرہ و نیز تنگ ہائے سیاہ رکھنے چاہئیں۔

اکثر منازل میں شاہ عالم بہادر و نیز دیگر اراکین دولت کی جاگیروں کے عمال گھوڑے اونٹ و خچر بہ قیمت خرید کر لاتے اور جلوان و مرغ پیش کرتے تھے لیکن اس زمانہ میں کسی وقت بھی شہزادہ نے طعام تناول نہیں فرمایا، ایک روز البتہ جب کہ قاضی مالپور کے مکان سے کھانا آیا تو خشک روٹی و میوہ خشک پر بسر فرمایا۔

ایک روز شہزادہ نے کھچڑی کا نام زبان سے لیا، ہمراہی پیادے سرا میں گئے اور کھچڑی پکا کر لکڑی کے برتن میں لے آئے، اگرچہ پدر و فرزند دونوں بھوکے تھے، لیکن بادشاہ زادہ نے کھانے کو دیکھا اور فرزند سے اشارہ کیا کہ نہ کھایئے فرزند ارجمند دیکھتا رہ گیا، اور کھانے کو ہاتھ نہ لگایا، بادشاہ زادہ نے فرزند کو تسلی دی اور کہا کہ تھوڑا صبر کرو انشاء اللہ دو ہی تین روز میں قبلہء دین و دولت حضرت ولی نعمت کا انوش نصیب ہوگا۔

اللہ اللہ فرمان مبارک کی تاثیر تعمیل اور اس کی قوت نفاذ و نیز فرزند ارجمند کی سعادت و فدویت کا کیا ذکر ہے۔

چوبیس تاریخ شہزادہ بیدار بخت کو منصب ہشت ہزاری دو ہزار سوار مرحمت ہوا، اور عابد خاں کو غائبانہ قلیچ خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا پانچویں ذی الحجہ کو ماندل سے کوچ ہوا اور قبلہء عالم کو معلوم ہوا کہ رانا کے ملازمین درۂ دوباری کو چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں، حافظ محمد امین خاں نے عرض کیا کہ فدوی کے ملازم پہاڑ پر گئے تھے درے کے اس طرف کسی شخص کا نام و نشان بھی نہیں ہے، رانا نے اودے پور کو خالی کیا اور خود رو بہ فرار ہوا۔

بارہویں تاریخ کو جہاں پناہ نے درۂ مذکور پر قیام فرمایا اور حسن علی خاں رانا کے تعاقب میں روانہ فرمایا گیا۔

اودے پور کا بُت خانہ

بادشاہ زادہ محمد اعظم و خان جہاں بہادر کو اودے پور کے دیکھنے کی اجازت مرحمت ہوئی، روح اللہ خاں و یکہ تاز خاں اُس نادرۂ روزگار بُت خانے کے مسمار کرنے پر متعین ہوئے، جو رانا کی حویلی کے سامنے واقع اور اودے پور کے غیر مسلم باشندوں کی جان اور ان کے مال کی خرابی کا باعث ہوا۔

بیس نفر راج پوت بُت خانے پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے وہاں موجود تھے، باری باری سے ایک ہندو مقابلے کے لئے بُت خانے سے باہر آتا تھا اور چند سپاہیوں کو قتل کر کے خود بھی ہلاک ہو جاتا تھا اسی طرح بیسوں نفر تہ تیغ ہو گئے سرکاری فوج کا ایک گروہ اخلاص چیلے کے سمیت اس لڑائی میں کام آیا، بُت خانہ ہندوؤں سے خالی ہو گیا، اور شاہی بیلداروں اور تبرداروں نے تمام بت توڑ ڈالے۔

میر شہاب الدین

میر شہاب الدین کی تقدیر میں مرتبہء امارت پر فائز ہونا لکھا تھا، زمانے نے اس کے لئے ایک عمدہ موقع پیدا کیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میر مذکور میر شکاروں کی ایک جماعت کے ساتھ دولت خانہء شاہی میں قیام پذیر تھا، قبلہء عالم نے اس کو اپنے حضور میں طلب فرما کر فرمایا کہ حسن علی خاں چند روز ہوئے کہ رانا کے تعاقب میں درّے کے اندر داخل ہوا تھا خان مذکور کا کچھ حال معلوم نہیں کہ اس پر کیا گذری تم جاؤ اور خبر لے کر جلد واپس آؤ۔

میر شہاب الدین اسی وقت مع اپنی جماعت کے تعمیل ارشاد میں روانہ ہوا، اور باوجود اس کے کہ بنگالہ ملک ہونے کی وجہ سے راہ کے نشیب و فراز و نیز مختلف راستوں سے ناواقف اور دشمنوں کے خوف سے مطمئن نہ تھا، لیکن اپنے طالع کی یاوری اور عقیدت کے خلوص نے اسے ایک راست باز راہبر سے ملا دیا اور یہ قاصد خان مذکور کے لشکر تک پہنچ گیا۔

میر شہاب الدین نے حالات سے واقفیت حاصل کی اور حسن علی خاں کی عرض داشت کے ہمراہ دو روز کے اندر آستانہء شاہی پر حاضر ہو گیا امیر مذکور بلا وساطت بخشیاں، دو صدی کے اضافے سے سرفراز ہو کر ہفت صدی امراء میں داخل ہوا، قبلہء عالم نے میر شہاب الدین کو علاوہ اضافہء منصب کے خطاب خانی و فیل و کمان و ترکش خاصہ بھی مرحمت فرما کر احکام رسانی کے لئے دوبارہ حسن علی خان کی خدمت میں روانہ کیا۔

غرضیکہ یہ واقعہ میر مذکور کی ترقی کی ابتدا ہے اس کے بعد جو مواقع کہ یاوری تقدیر سے حاصل ہوئے اور جس طرح کہ یہ امیر مدارج اعلیٰ پر فائز ہوا وہ اپنی اپنی جگہ تالیف مذکور میں بیان

کیے جائیں گے۔

سربلند خاں کی وفات

سربلند خاں میر یحییٰ کی ناسازگاری مزاج نے طول کھینچا اور اس امیر نے چوتھی ذی الحجہ کو وفات پائی، سربلند خاں ان امرائے عظام میں داخل تھا جو ظاہر و باطن ہر قسم کی ہر خوبیوں کا مجمع تھے، قبلہء عالم کو ایسے بندۂ اخلاص مند کے انتقال سے بے حد ملال ہوا۔

چوتھی ذی الحجہ کو ہمت خاں الٰہ آباد روانہ فرمایا گیا، شہزادہ محمد اکبر کو سرپیچ قیمتی چالیس ہزار مرحمت فرما کر اودے پور روانہ ہونے کی اجازت مرحمت ہوئی۔

جہاں پناہ نے حسن علی خاں کے تحت ایک فوج مع بہترین ساز و سامان کے رانا کے تعاقب میں روانہ فرمائی، حسن علی خاں کے تمام ہمراہیوں کو خلعت عطا ہوئے، شیخ رضی الدین جو حسن علی خاں کے رفقاء کا سرگروہ تھا، اس مہم میں مشتبہ سمجھا گیا جس کی بناء پر شیخ مذکور خطاب خانی سے برطرف فرمایا گیا۔

سربلند خاں کی وفات پر روح اللہ خاں کو خدمت میر بخشی گری عطا ہوئی اور بجائے اس کے صامت خاں داروغہء توپ خانہ مقرر فرمایا گیا، صلابت خاں کے بجائے صالح خاں داروغہء فیل خانہ ہوا اور تہور خاں کو بادشاہ قلی خاں کا خطاب عطا ہوا۔

سید علی اکبر قاضی شہر لاہور

دارالسلطنت لاہور کے واقعہ نگار نے اطلاع دی کہ سید علی اکبر قاضی شہر اپنی دیانت و طبیعت کی سختی اور تیزی کی وجہ سے کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا تھا، قاضی مذکور کی وضع کے خلاف اس کا ہمشیر زادہ سیّد فاضل نام اپنی کم عقلی کی وجہ سے دست دراز و بدزبان تھا، لاہور کے حکام یعنی ناظر و کوتوال شہر اس شخص کے دست و زبان سے تنگ آ گئے تھے اور مجبور ہو کر اس کی جان لینے کے خواہاں ہوئے۔

قاضی مذکور نے بھی اس فتنہ و آشوب میں امیر قوام الدین ناظم لاہور کے ہاتھوں بے حد ذلت و رسوائی کے ساتھ اپنی جان دی۔

ناظم ونظام الدین کوتوال دونوں اشخاص خدمت وخطاب سے برطرف فرمائے گئے، نظام الدین کوتوال لاہور ہی میں ختم ہوا اور قوام الدین حضور شاہی میں طلب کیا گیا، قوام الدین کے بجائے بادشاہ زادہ محمد اعظم ناظم پنجاب مقرر ہوئے، اور طرۂ مرصع کے عطیے سے سرفراز فرمائے گئے، لطف اللہ خاں کو صوبے کی نیابت عطا ہوئی، اور اس امیر کے تغیر سے ابونصر خاں خدمت عرض مکرر پر مقرر فرمایا گیا۔

قوام الدین خاں اجمیر میں آستانہء والا پر حاضر ہوا محکمیہ شرعیہ میں مقدمہ دائر ہوا، اور قوام الدین روزانہ عدالت میں ذلیل وخوار ہونے لگا، آخرکار پسر سید علی اکبر مرحوم اعزۂ دربار کی شفاعت سے دعوئے قصاص طلبی سے باز آیا، خان مذکور کو خود ہی اپنے حال پر رحم آیا اور اس نے جلد سے جلد دنیا کو خیر باد کہا۔

اودے ساگر کے مندروں کا انہدام

دوسری محرم کو قبلہء عالم تالاب اودے ساگر تشریف لے گئے تالاب مذکور کے کنارے تین بُت خانے نظر آئے، بادشاہ دیں پناہ نے ان منادر کے انہدام کا حکم دیا جس پر فوراً عمل کیا گیا۔

جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ حسن علی خاں نے انیسویں ذی الحجہ کو درّے عبور کر کے رانا پر حملہ کیا۔ ہندو راجہ خیمہ واسباب چھوڑ کر فرار ہوا اس سفر میں بے حد غلّہ اہل لشکر کے ہاتھ آیا جس کی وجہ سے ارزانی ہوگئی۔

ساتویں محرم کو حسن علی خاں بیس اونٹ غلّہ ودیگر اسباب غنیمت لے کر آستانہء والا پر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ رانا کی حویلی والے بُت خانے کے علاوہ ایک سو بہتر دیگر منادر بھی جو نواح اودے پور میں واقع تھے مسمار کر دیئے گئے، جہاں پناہ نے خان مذکور کو خطاب بہادر عالم گیر شاہی عطا فرمایا۔

نویں محرم کو خان جہاں بہادر خلعت وخنجر مرصع واسپ باساز طلاء کے عطیات سے سرفراز ہو کر مندسور روانہ ہوا، عزۂ صفر کو بادشاہ دین پناہ نے چتوڑ کا سفر کیا اور فرمان مبارک کے مطابق اس مقام کے ترسٹھ بُت خانے منہدم کئے گئے۔

پانچویں صفر کو خان جہاں بہادر لہاور سے چتوڑ میں آستانہء شاہی پر حاضر ہوا، جہاں پناہ

نے نیم آستین جسم مبارک سے اتار کر خاں جہاں کو مرحمت فرمائی۔

ساتویں صفر کو حافظ محمد امین خاں ناظم احمد آباد کو خلعت واسپ وفیل عطا فرما کر مستقر جانے کی اجازت مرحمت ہوئی۔

نویں صفر کو خان جہاں بہادر ظفر جنگ کو کلتاش خاں، وکلا کے شاہ عالم بہادر کے تغیر کی وجہ سے ناظم دکن مقرر ہوا، اور خلعت وجمدھر مرصع واسپ وفیل کے عطیات سے بہرہ اندوز ہوا۔

شیخ سلیمان داروغہ عدالت کو فاضل خاں کا خطاب عطا ہوا۔

شہزادہ محمد اکبر کی چتوڑ کو روانگی

بارہ صفر کو بادشاہ زادہ محمد اکبر مرتب و باقاعدہ فوج کے ہمراہ چتوڑ کی مخالفت پر مامور کئے گئے، جہاں پناہ نے بادشاہ زادے کو خلعت خاص و مالائے مروارید جیغہ، مرصع واسپ وفیل مرحمت فرمائے۔

حسن علی خاں و رضی الدین خاں خلعت کے عطیے سے شرف یاب ہو کر بادشاہ زادۂ مذکور کے ہمراہ روانہ ہوئے۔

حکیم شمسا، دختر عادل خاں بیجاپوری کے ہمراہ بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا تھا قبلہء عالم نے حکیم مذکور کو خلعت خاصہ واسپ باساز طلاء وفیل ومنصب سہ ہزاری ہزار سوار عطا فرما کر شمس الدین خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا، شمس الدین خاں، خان جہاں بہادر کی مہم پر متعین فرمایا گیا۔

جہاں پناہ کا اودے پور سے دارالخیر اجمیر کو واپس آنا

چودھویں صفر کو قبلہء عالم اودے پور سے اجمیر روانہ ہوئے عبداللہ خاں سالانہ دار عبدالرسول خاں کے تبادلے کی وجہ سے اکبر آباد کا قلعہ دار مقرر فرمایا گیا، مکرم خاں کو خلعت واسپ عطا ہوا، اور مفسدوں کی تنبیہ کے لئے رنتھنبور روانہ ہوا۔

ملکہ عالیہ اورنگ آبادی محل عفت مآب بادشاہ زادہ، زیب النساء بیگم کے ہمراہ حضور میں طلب کی گئی تھی، چوبیسویں صفر کو ینگ توش خاں بہادر ملکہء موصوف کو بارگاہ شاہی میں حاضر کرنے کے لئے روانہ ہوا۔

قابل خاں کی برطرفی

قابل خاں میر منشی برادر ابوالفتح قابل خاں ٹھٹھوی قدیمی والا شاہی جو خاندانی خدمات و مزاج دانی کی وجہ سے تربیت وعنایت شاہی کا ممنون منت تھا اپنی بدنصیبی سے جادۂ اعتدال سے منحرف ہوا اور بے جا لغزشوں کی وجہ سے راہ راست پر قائم نہ رہا، جہاں پناہ نے قابل خاں کو منصب ہزاری و ہفتادسوار و خدمت تقرب سے برطرف فرمایا، قابل خاں کا داماد مسمی عبدالواسع بھی خدمت قانون گوئی صوبہ ٹھٹھہ سے معزول فرمایا گیا۔

قابل خاں کی درخواست کے مطابق اسے حکم ہوا کہ تخت گاہ کو روانہ ہو، فرمان مبارک صادر ہوا کہ اس کا گھر ضبطی میں لے لیا جائے، اس طور پر کہ قابل خاں جریدہ مکان سے باہر نکلے اور گھوڑے پر سوار کر کے شہر بدر کر دیا جائے، شاہی حکم کی تعمیل کی گئی، اور مال کی ضبطی کا اندازہ کرنے سے معلوم ہوا کہ قابل خاں نے صرف دو سال کی خدمت تقرب میں علاوہ اسباب وحویلی نو ساختہ کے بارہ لاکھ روپے جمع کئے تھے، قابل خاں نے لاہور پہنچ کر وفات پائی۔

فضائل خاں کی وفات

قابل خاں کے بجائے فضائل خاں داروغہ ڈاک چوکی مقرر ہوا، شیخ مخدوم منشی بادشاہزادہ محمد اعظم کی خدمت انشاء پر مامور فرما کر منصب پانصدی وسی صد سوار و جمدھر سادہ کار و دو ہزار روپیہ نقد کے عطیات سے سرفراز فرمایا گیا، جہاں پناہ نے شیخ مخدوم کو دس دس تھان چیدہ جامہ دار اور کمخواب کے بھی عطا فرمائے، اس واقعہ کے بعد شیخ مخدوم نے بتدریج ترقی کی یہاں تک کہ ہزار و پانصدی کے منصب و فاضل خاں کے خطاب سے سرفراز ہو کر خدمت صدارت پر فائز ہوا، فاضل خاں مدارج ترقی طے کر رہا تھا کہ دفعتاً دست اجل نے اس کو نیستی کے عمیق غار میں گرا دیا۔

شیخ مخدوم کی جگہ پر شیخ عبدالوالی پسر شیخ عبدالصمد جعفر خانی بادشاہ زادہ محمد اعظم کی سرکار میں مقرر فرمایا گیا۔

عزۂ ربیع الاوّل کو جہاں پناہ اجمیر پہنچے اور سب سے پیشتر حضرت قدوۃ الواصلین خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے روضہ اقدس پر پیادہ پا حاضر ہوئے اور سعادت زیارت حاصل کر کے دولت خانہ پر جلوہ افروز ہوئے۔

مغل خاں ولد طاہر خاں دکن سے حاضر ہوا، اور میر توزک اوّل مقرر ہو کر خلعت سے سرفراز فرمایا گیا، صلابت خاں سے لغزش ہوئی اور منصب سے برطرف کیا گیا، اس امیر کے بجائے بہرہ مند خاں داروغہ توپ خانہ اور بہرہ مند کی خدمت پر عبدالرحیم خاں آختہ بیگ مقرر ہوئے۔

حیات بیگ کو خطاب خانی و خواجہ کمال کو خنجر خاں و عبدالواحد ولد میرزا خاں کو خطاب نامدار خاں مرحمت ہوا۔

کامگار خاں ولد ہوش دار خاں نے جو منصب سے برطرف فرمادیا گیا تھا اپنے جسم پر چار زخم جمدھر کے لگائے لیکن الطاف سلطانی کے اکیر اثر مرہم نے اسے شفا بخشی۔

وارث خاں مئولف بادشاہ نامہ کی وفات

دس ربیع الاوّل کو وارث خاں واقعہ خواں نے کتاب بادشاہ نامہ کی تیسری جلد تالیف کی ہے، ایک سودا زادہ طالب العلم نے جس پر وارث خاں بے حد مہربانی کرتا اور اس کو بے رحموں کی ایذا رسانی سے بچاتا اور اس کی کفالت کرتا تھا چاقو سے ہلاک کیا۔

بیجاپور میں خطبہ وسکّہ

پندرہ ربیع الاوّل کو شاہ عالم بہادر کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ شہر بیجاپور میں قبلہء عالم کے نام نامی کا خطبہ وسکہ جاری ہوا، حاضرین دربار نے مبارک باد عرض کی۔

سولہ ربیع الاوّل کو بادشاہ زادہ محمد اعظم، شاہی حکم کے مطابق ہمشیرۂ معظمہ نواب عالیہ زیب النساء بیگم کے استقبال کے لئے گئے اور بادشاہ زادہ ملک احتجاب کو مع عفت مرتبت اورنگ آبادی محل کے حرم سرائے عزت میں لے گئے۔

بادشاہ غربا پرور و اغنیاء نواز کو معلوم ہوا کہ نذیر بے اتالیق سلیمان قلی خاں والی بلخ آستانہ والا پر حاضر ہو رہا ہے فرمان مبارک صادر ہوا کہ پانچ پانچ ہزار روپے لاہور و کابل کے خزانہ سے اتالیق مذکور کو دیئے جائیں۔

قلندر بے سفیر بلخ شرف باریابی سے بہرہ اندوز ہوا اور خلعت و خنجر و ہزار روپے نقد کے عطیات سے سرفراز فرمایا گیا۔

میر مغیث کے تغیر سے حاجی شفیع خاں دیوانی بنگالہ کی خدمت پر مامور ہوا، اور اس کے

بجائے شریف خاں داروغہء داغ و تصحیحہ مقرر ہوا، محمد میرک گرز بردار کو خطاب خانی مرحمت ہوا، شجاعت خاں کے تغیر سے افتخار خاں جونپور کا فوج دار مقرر فرمایا گیا، ملتفت خاں برطرفی سہ ہزاری سوار کے منصب پر بحال ہو کر غازی پور زمانیہ کی فوج داری پر فائز ہوا۔

عزۂ جمادی الاوّل کو بہرہ مند خاں داروغہء توپ خانہ انا ساگر تالاب کے اس طرف ایک باغ میں فروکش اور ایک درخت کے سایہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً برق گری، خان مذکور حوض میں کود پڑا چند ساعت بے خود رہنے کے بعد ہوش میں آیا۔

اکیس تاریخ کو معلوم ہوا کہ خان جہاں بہادر اورنگ آباد پہنچ کر شاہ عالم بہادر کی خدمت میں حاضر ہو گیا، اور بادشاہ زادہ مذکور نے آستانہء والا پر حاضر ہونے کا ارادہ فرمایا۔

چھبیس جمادی الاوّل کو بادشاہزادہ محمد اعظم و سلطان بیدار بخت مرحمت خسروانہ سے بہرہ اندوز ہو کر رانا کی مہم پر روانہ ہوئے۔

نذیر بے کو اورنگ خاں کا خطاب مرحمت ہوا اور منصب دو ہزاری ہفت صد سوار کے عہدہ پر فائز ہوا۔

محمد امین کو شاہ قلی خاں اور حاجی محمد کو میر خاں کے خطابات مرحمت ہوئے۔

سیواجی کی وفات

سات جمادی الآخر کو بادشاہ زادہ محمد اعظم چتوڑ پہنچے، بادشاہ زادہ محمد اکبر سے سرسواری ملاقات کی اور سوجیت چتارن روانہ ہوئے۔

دکن کے واقعہ نگار نے عرض داشت کے ذریعہ اطلاع دی کہ چوبیس ربیع الآخر کو سیواجی پر گرمی کا غلبہ ہوا اور گھوڑے سے اترتے ہی اس نے دو مرتبہ خون کی قے کی اور فوت ہوا۔

ابوتراب خاں جو بیسنر کے منادر منہدم کرنے کے لئے روانہ فرمایا گیا تھا، چوبیس رجب کو آستانہء والا پر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس نواح کے چھیاسٹھ بُت خانے زمین کے برابر کر دیئے گئے۔

دسویں شعبان کو خواجہ معتمد خاں قلعہ دار گوالیار نے وفات پائی۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا چوبیسواں سال

1091ھ/1681ء

رمضان کا ارشاد بخش وفیض انگیز زمانہ جو ابتدا سے لے کر انتہا تک خیر و برکات کے نزول و آثار کا باعث ہے آیا اور اہل اسلام کے فلاح دارین میں اضافہ کرنے کا غلغلہ بلند ہوا، قبلہء ایمان و بادشاہ عالمیان نے شبانہ روز طاعت الٰہی میں بسر فرما کر اس مقدس ماہ کو تمام فرمایا۔

یکہ تاز خاں کی وفات

خدمت گزار خاں کو چتوڑ کی واقعہ نگاری اور خدمت بخشی گری عطا ہوئی، گیارہ رمضان کو یکہ تاز خاں نے وفات پائی اور اس کے بیٹوں یعنی میر عبداللہ، میر نور اللہ و عطاء اللہ کو خلعت تعزیت مرحمت ہوئے۔

عاقل خاں کو صوبہء تخت گاہ کی بخشی گری دوم عطا ہوئی اور خلعت خاصہ و خنجر مرصع با علاقہء مروارید کے عطیات سے سرفراز فرمایا گیا۔

دسویں شوال کو غضنفر خاں کو چار سو سواروں کے ہمراہ اور محمد شریف خوش منزل و نیز قراولوں کو حکم ہوا کہ اجمیر سے راج سمندر تک منازل سفر متعین کر کے حاضر حضور ہوں۔

دسویں شوال کو ہمت خاں بخشی گری اوّل کے عہدہ پر فائز ہوا، خلعت اور زری کا دوپٹہ اس کے مکان پر روانہ فرمایا گیا، اس تاریخ معتمد خاں کے اموال میں سے بارہ لاکھ پچاس ہزار روپیہ علاوہ جواہرات اور چوپایوں کے گوالیار سے لا کر حضور میں پیش کئے گئے۔

عطیات

چھبیس شوال کو حامد خاں راٹھور کے مفسدوں کی تنبیہ کے لئے میرٹھ روانہ فرمایا گیا، اس کے

ہمراہیوں میں سے میر شہاب الدین کو خلعت و مادہ فیل عطا ہوئے حامد خاں کے دیگر ہمراہی خلعت کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے۔

روح اللہ خاں بخشی دوم مقرر ہوا اور خلعت و فیل و اسپ کے عطیات سے بہرہ اندوز ہو کر عزہ ذی قعدہ کو شہزادہ محمد اکبر کی خدمت میں روانہ ہوا، مغل خاں سانبھرہ و ڈیڈوانہ کے سرکشوں کی تنبیہ کے لئے روانہ ہوا، مختار بیگ ولد اسلام خاں رومی کو نوازش خاں کا خطاب مرحمت ہوا، قبلہء عالم نے اس امیر کو خلعت عطا فرما کر ہندی لباس زیب تن کرنے کا شرف عطا فرمایا۔

اٹھارہ ذی قعدہ کو محمد نعیم بخشی سرکار بادشاہ زادہ کام بخش کو اپنے مالک کی سرکار سے خلعت عطا ہوا، اور اپنی جمعیت کے ہمراہ بادشاہ زادہ محمد اکبر کی خدمت میں روانہ ہوا۔

صدر الدین ولد قوام الدین کو اس کے باپ کا خلعت ماتمی عطا ہوا، اودت سنگھ بھدوانہ چتوڑ کا قلعہ دار مقرر ہوا، سید خاں کے انتقال کے بعد شہامت خاں کو قلعہ داری کابل کی خدمت عطا ہوئی۔

چھ ذی الحجہ کو لطف اللہ خاں لاہور سے آستانہء شاہی پر حاضر ہوا، اور عبدالرحیم خاں کے تبادلہ کی وجہ سے غسل خانہ کا داروغہ مقرر فرمایا گیا، عبدالرحیم خاں کو خدمت بخشی گری سوم عطا ہوئی اور سنگ یشم کی دوات مرحمت فرمائی گئی، سزاوار خاں بخشی گری سے آختہ بیگی کی خدمت پر مامور ہوا۔

ابوالقاسم ولد قاضی عارف، پیش دست بخشی سوم کو شال مرحمت فرمائی گئی۔

راج سنگھ و پرتھی سنگھ راٹھور کو خلعت و دو ہزار روپیہ بطور انعام مرحمت ہوئے، اعز خان راہداری کابل کی خدمت پر فائز ہوا اور اس کو نقارہ عطا فرمایا گیا۔

شہاب الدین خاں کو خلعت و اسپ با ساز طلا مرحمت ہوئے کہ قلیچ خاں کے پاس روانہ کرے دیو افگن پسر دیانت کو معتمد خاں کا خطاب مرحمت ہوا اور شریف خاں کے تغیر سے داروغہء داغ و تصحیحہ مقرر فرمایا گیا، سلطان بیدار بخت حفظ کلام اللہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے اور شہزادہ مذکور کو مالائے مروارید و ڈیزہ یاقوت مرحمت فرمائے گئے۔

شہزادہ محمد اکبر کی بغاوت

اللہ اکبر، کیا اقبال شاہی ہے، سبحان اللہ، کیا خدا کی مہربانی اور اس کا فضل و کرم ہے کہ بادشاہ

دیں پناہ اگر ناممکنات کے پرشکوہ پہاڑ پر بھی قہر آلود نگاہیں ڈالیں تو یہ کوہ سنگی بھی موم کی طرح پگھل جائے، اقبال: وقارِ بادشاہی کا یہ عالم ہے کہ اگر تمام عالم بھی مخالفت پر کمر باندھے تو فتح ونصرت جو ہمیشہ ہم رکاب رہتی ہے بدخواہوں کو ایک دم میں معدوم کردے ہر میدان میں فتح وظفر قدم مبارک کو بوسہ دیتے ہیں اور ہر مہم ادنیٰ توجہ سے سر ہو جاتی ہے۔

قبلہء عالم وعالمیان وبداندیش محمد اکبر کا واقعہ میری اس تمہید کا شاہد وعادل ہے، محمد اکبر کے کاشانہء اقبال پر ادبار کی گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں، اور تقریر کی برگشتگی نے اس پروردۂ ناز ونعم کو عصیاں کے مہلک جنگل میں تباہ وبرباد کیا، اس بدنصیب بادشاہ زادہ نے ولی نعمت کی مخالفت پر کمر ہمت باندھ کر اپنے شیرازۂ اطمینان کو ایسا پراگندہ ومنتشر کیا کہ پھر تادم آخر اس کو سکون نصیب نہ ہوا، اس بدبخت مریض پر ہوا وہوس کی روح فرسا بیماری کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ تمام عمر بستر شقاوت وبدبختی پر صاحب فراش رہا۔

چھبیس ذی الحجہ کو واقعہ نگاروں ونیز دیگر عمال شاہی نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ بادشاہ زادہ محمد اکبر باوجود صاحب فہم وفراست وذی شعور ہونے کے راٹھوروں ودیگر نمک حرام حاشیہ نشینوں کے دام مکر میں گرفتار ہوا اور اس بدبخت نے اطاعت شاہی کے دائرہ سے قدم آگے بڑھا کر علم مخالفت بلند کیا، ملازمین شاہی میں جو اشخاص محمد اکبر کے موافق ہوئے ان کو مناصب واضافے و خطابات دیئے اور جن کو اپنا مخالف خیال کیا ان غریبوں کو نظر بند کر دیا ہے۔

قبلہء عالم جذبہء فطری سے مجبور ہوئے شفقت پدری نے فرزند کی اس ناعاقبت اندیشی سے حضرت کو آزردہ خاطر کیا، جہاں پناہ کو فرزند کی اس مخالفت کا بے انتہا ملال ہوا، لیکن اس سانحہ کے تدارک کو توفیق الٰہی کے سپرد کر کے حضرت نے اس بلائے ناگہانی کے دفع کرنے پر توجہ فرمائی۔

بہرہ مند خاں میر آتش کو حکم ہوا کہ لشکر کے گرد مورچال باندھے ونیز دَرّوں کی محافظت پر سپاہیوں کو متعین کر کے دولت خانہ سے متصل پہاڑیوں پر توپیں لگا دے۔

حاف محمد امین خان ناظم احمد آباد ودیگر اعیان وصوبہ داران ملک کے نام فرامین روانہ ہوئے کہ اپنے اپنے صوبوں کی محافظت کریں۔

اس وقت شاہی لشکر اطراف وجوانب کے سرکشوں کی تنبیہ کے لئے روانہ ہو چکا تھا، اور دس ہزار سواروں سے زیادہ فوج ہم رکاب نہ تھی قبلہء عالم نے اکثر فرمایا کہ بہادر نے موقع تو اچھا پایا

ہے اب تاخیر کیوں کر رہا ہے۔

تیس ذی الحجہ کو قبلہء عالم شکار کے لئے تشریف لے گئے اور واپسی میں اکثر اعیان دولت کے محل قیام وجمدۃ الملک اسد خاں کے مورچال ملاحظہ فرمائے، جمدۃ الملک کو حکم ہوا کہ ہر روز شام کے وقت مورچلوں کا معائنہ کرلیا کرے۔

فرمان مبارک صادر ہوا کہ بادشاہ زادہ کے وکیل ونیز شجاعت خاں ولد نجابت خاں و بادشاہ قلی خاں کے وکلاء جنہوں نے محمد اکبر کو ترغیب دے کر گمراہ کیا ہے گڑھ مٹیلی کے قلعہ میں نظر بند رکھے جائیں۔

شہاب الدین پسر قلیچ خاں سوتک ودرگا داس ودیگر راٹھوروں کی سرکوبی کے لئے گجرات کے سفر کے ارادہ سے سردھی روانہ ہو چکا تھا۔

اس زمانہ میں جب کہ بد بخت ونمک حرام افراد تمام شاہ زادہ کے گرد جمع ہو چکے تھے، محمد اکبر نے میرک خاں کو، خان مذکور کے پاس روانہ کر کے عنایات ورعایتوں کا امیدوار بنایا، اور شہاب الدین کو بھی اپنے پاس آنے کی ہدایت کی، خان مذکور نے جس کے پاس بہت بڑی جمعیت تھی اور نیز اس کے اور بادشاہ زادہ کے درمیان فاصلہ بھی تھا اپنے طالع کی یاوری ومآل اندیشی سے میرک خاں کو اپنے ہمراہ لیا اور صرف دو روز میں ساٹھ کوس کی مسافت طے کر کے آستانہء شاہی پر حاضر ہو گیا۔

قبلہء عالم نے شہاب الدین کی نمک حلالی اور وفاداری کی بے حد تعریف فرمائی اور خلعت عطا فرما کر ترقیات وعطیات سے بھی اسے سرفراز فرمایا اس واقعہ کا تفصیلی ذکر اپنے موقع پر بیان کیا جائے گا۔

خواجہ میرک اپنا خیمہ واسباب محمد اکبر کے پاس چھوڑ کر چلا آیا تھا، جہاں پناہ نے اس امیر کو خلعت ودو ہزار روپیہ نقد عطا فرما کر دو صدی و پنجاہ سوار کے اضافہ سے سرفراز فرمایا محمد عارف برادر شہاب الدین خاں کو بھی خلعت واضافہ مرحمت ہوا، الغرض کم وبیش تمام منصب دار خلعت واضافہ سے شاد کام فرمائے گئے۔

انیس ذی الحجہ کو بادشاہ عدو کش نے خود سوار ہو کر مورچلوں کا معائنہ فرمایا، حامد خاں جو درجن سنگھ کی سرکوبی کے لئے مامور ہوا تھا، دھاوا کرتا ہوا حاضر حضور ہو گیا، اور سرسواری جہاں پناہ کے

شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوا، قبلہء عالم اس امیر کی وفاداری سے بے حد خوش ہوئے۔

دوسری محرم کو شاہ عالم بہادر کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ بادشاہ زادۂ مذکور تالاب رانا پر پہنچے اور جلد سے جلد آستانہء شاہی پر حاضر ہوا چاہتے ہیں، اسد خاں و محمد قلی خاں و ابونصر خاں وغیرہ بھکر کی سمت روانہ ہو کر واپس آئے، ہمت خاں شدید بیمار تھا اس لئے اجمیر کی حفاظت کرنے کے لئے قلعہ میں چھوڑ دیا گیا۔

تیسری محرم کو جہاں پناہ نے نماز جمعہ ادا کی اور حضرت خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ کے مزار شریف پر فاتحہ خوانی فرما کر موضع دیورائی میں نزول اجلال فرمایا، شہاب الدین خاں نے قراولی کی خدمت انجام دی اور عرض کیا کہ باغی کی فوج مقام کرکی میں پراگندہ ہے جہاں پناہ نے اس شب دیورائی میں قیام فرمایا۔

بخشیانِ بادشاہی نے اطلاع دی کہ محمد اکبر کی تمام فوج دس ہزار تعداد میں موجود ہے، قبلہء عالم نے لشکر کو آراستہ کرنے کا حکم دیا، قول و ہراول و قراول کی صفوف میں دس ہزار اور جرانغار و برانغار میں ہزار سوار ترتیب کے ساتھ آراستہ ہوئے۔

جاسوسوں نے خبر دی کہ بادشاہ زادہ نے مقابلہ کے ارادہ سے قدم آگے بڑھایا، لیکن اہلِ لشکر پر کچھ ایسا خوف طاری ہوا ہے کہ اکثر جرگے سپاہیوں کے بے قابو ہو گئے ہیں۔

کمال الدین خاں و دیگر افسران فوج شاہی حضور میں حاضر ہو گئے ہیں، قبلہء عالم نے پانچویں محرم کو نماز صبح سے فراغت حاصل کر کے اپنی فوج کے ہمراہ فرودگاہ سے پینتیس جریب کا سفر کیا اور موضع دوبارہ میں فروکش ہوئے، جہاں پناہ نے شامیانے اور ڈوری قنات میں قیام فرمایا، حریف کی آمد آمد کی خبر آ رہی تھی حکم ہوا کہ خود سبقت نہ کرو بلکہ باغیوں کو یہاں تک پہنچ جانے دو، نماز ظہر کے بعد شاہ عالم بہادر شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوئے اور دیورائی کا خیمہ جو جہاں پناہ کے قیام کے لائق تھا وہاں سے منتقل کر کے دوبارہ میں نصب کیا گیا۔

شب کے ایک پہر دو گھڑی گزرنے کے بعد جب کہ جہاں پناہ نے سجادۂ عبادت پر جلوہ فرمایا اور شاہ عالم بہادر حضوری میں حاضر تھے معلوم ہوا کہ بادشاہ قلی خاں محمد اکبر کے ہزیمت اثر لشکر سے نکل کر دربار خاص و عام پر حاضر ہوا ہے قبلہء عالم نے لطف اللہ خاں داروغہء غسل خانہ کو حکم دیا کہ محمد اکبر کا مفرور امیر بے ہتھیار حضور میں لایا جائے۔

بادشاہ قلی بدنصیب کے دل میں خیالات بد، جاں گزین تھے، غسل خانہ کی ڈیوڑھی پر پہنچ کر اس نے ہتھیار رکھولنے میں مبالغہ کو عاجزی کے مرتبہ تک پہنچادیا۔

لطف اللہ خاں نے جہاں پناہ کے حضور میں حاضر ہوکر کیفیت حال عرض کی، حکم ہوا کہ یہ شخص ہتھیار بند ہرگز نہ آنے پائے، بادشاہ قلی پر ایسا خوف طاری ہوا کہ قبل اس کے کہ لطف اللہ خاں واپس آئے آستانہ مبارک سے بے حواس بھاگا، لیکن نمک حرامی کا وبال اس کے پاؤں میں زنجیر ہوکر لپٹ گیا اور جیسے ہی اس نے غسل خانہ مبارک کی قنات سے قدم آگے بڑھایا، جلو خاص کے سوار اور چیلے اس پر حملہ آور ہوئے۔

بادشاہ قلی خاں لباس کے اندر چہل قدوزرہ ریز پہنے ہوا تھا اس لئے اس کے جسم پر زخم کاری نہ لگتے تھے کہ دفعتہً ایک ہاتھ اس کے حلق پر پڑا، اور اس زخم نے اس کے دماغ کے فتنہ کو فرو کردیا، پانچویں محرم کو جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ ہمت خاں بخشی اوّل پسر اسلام خاں بہادر قدیمی والا شاہی نے وفات پائی، یہ امیر نیک ذات و پسندیدہ صفات تھا، ارباب علم و ہنر اس کی مجلس میں باریاب ہو کر کامیاب و مالا مال ہوتے تھے، ہر دو پدر و پسر موزوں طبع و سخن سنج بھی تھے، ان کی نظم و نثر فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے فارسی زبان کے بہترین کلام میں داخل اور اُن کی یادگار موجود ہیں۔

شہزادہ محمد اکبر کی شکست

چھ محرم کو سپیدۂ صبح طلوع ہونے کے قبل معروضہ پیش ہوا کہ محمد اکبر جو دولت خانہ بادشاہی سے ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر مقیم تھا نصف شب اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر فرار ہوا، حقیقت یہ ہے کہ ظلِ الٰہی ہوکر دنیا کے سر پر سایہ رحمت ہونا اور مخلوق کی نگہداشت کا عہد و پیمان خالق بے نیاز سے کرنا اور اپنے عہد پر قائم رہنا ایسا امر سہل نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس کلاہ سرداری سر پر رکھ کر مسند حکمرانی پر جلوہ فرما ہو، اس فریب خوردہ بادشاہ زادہ نے تباہ کار و سفلہ مزاج غول بیابانی کے اغوا سے ایسے امر عظیم الشان کا بار اپنے کاندھوں پر رکھنا چاہا تھا جس کے برداشت کرنے کی بالفعل اس کے بازو میں طاقت نہ تھی، جس کی سزا یہ ملی کہ تمام عمر ندامت و آوارہ وطنی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا اور اپنے ولی نعمت قبلہ دین و دولت کی شفقت و شرف قدم بوسی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

حاضرین دربار نے فتح کی مبارک باد عرض کی اور ایک پہر کامل شادیانہ کی آواز کانوں میں

گونجتی رہی۔

محمد علی خاں خان زماں نے محمد اکبر کے تمام کارخانجات کو ضبط کیا اور دربار خاں ناظر نیکو سیر و محمد اصغر اس کے بیٹوں اور صفیتہ النساء ذکیتہ النساء و نجیبتہ النساء اس کی بیٹیوں اور سلیمہ بانو بیگم محمد اکبر کی زوجہ و دیگر متعلقین کو شاہی حضور میں لے آیا۔

زندان نافرمانی کے قیدی یعنی محتشم خاں پسر شیخ میر مرحوم و معمور خاں و محمد نعیم خاں و سید عبداللہ قید سے آزاد فرمائے گئے ان امیروں نے شرف زمیں بوسی حاصل کیا اور جہاں پناہ نے ان میں سے ہر ایک کو خلعت مرحمت فرمایا۔

شہاب الدین خاں نے حریف کا تعاقب کر کے گروہ کثیر کو ہلاک کیا، شاہ عالم بہادر، محمد اکبر کے تعاقب میں روانہ کئے گئے، قلیچ خاں و خان زماں و اندر سنگھ و رام سنگھ و سلیمان سنگھ وغیرہ شاہ عالم بہادر کے ہمراہ متعین کئے گئے۔

قبلہء عالم نے پچاس ہزار اشرفیاں شاہ عالم بہادر کو، دو لاکھ روپے شہزادہ معز الدین کو اور تین ہزار اشرفیاں شہزادہ محمد عظیم کو اور پچاس ہزار اشرفیاں شاہ عالم بہادر کے ہمراہیوں کو عطا فرمائیں، اور روح اللہ خاں کو حکم ہوا کہ رقم مذکور اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔

ساتویں محرم کو بادشاہ زمین و زماں فتح مند واپس ہوئے اور قدوۂ ارباب یقین حضرت خواجہ معین الدین کی زیارت سے فیض یاب ہو کر دولت خانہ شاہی میں مقیم ہوئے۔

نو محرم کو معلوم ہوا کہ تھانہ دار ماندل کام آیا اور قلعہ پر مفسدوں کا قبضہ ہو گیا، محمد اکبر کے رفیق فساد گروہ کے بارے میں حکم ہوا کہ خواجہ منظور و محرم گڑھ تھلی میں و مرتضیٰ قلی الور میں اور فراق خاں گوالیار میں اور محمد قاسم و غضنفر خاں کانگڑہ میں نظر بند رہیں۔

قاضی خوب اللہ محمد عاقل و شیخ طبیب و میر غلام محمد امروہہ تختہ کشی و شلاق کے بعد گڑھ تھلی کے قلعہ میں نظر بند کئے گئے، ان اشخاص کے علاوہ بھی ایک گروہ قید و شلاق کی سزا میں گرفتار ہوا۔

زیب النساء بیگم پر عتاب شاہی

بادشاہ زادہ محمد اکبر کے نام زیب النساء کے خطوط پکڑے گئے ملکہء مذکور پر عتاب شاہی ہوا اور وظیفہ رقمی چار لاکھ روپے سالانہ کی برطرفی کے علاوہ تمام مال و اسباب ضبط ہوا، شہزادی کو قلعہ

سلیم گڑھ میں قیام کرنے کا حکم ہوا۔

تیرہ محرم کو فخر جہاں خانم دختر برخوردار بیگ منصب دار بادشاہ زادہ محمد کام بخش کے حبالہء عقد میں دی گئی۔

سولہ محرم کو عفت مرتبت اورنگ آبادی محل اور سلیمہ بانو بیگم زوجہ محمد اکبر مع اپنی اولاد و ملازمین کے تخت گاہ روانہ ہوئیں۔

شاہ عالم بہادر کی فوج کے واقعہ نگار نے اطلاع دی کہ بادشاہزادہ مذکور جالور پہنچ گئے ہیں، اور محمد اکبر نے سانچور کا رُخ کیا ہے قلیچ خاں اور افواج متعینہ مفرور کے تعاقب میں دھاوا کر رہی ہے۔

بادشاہ زادہ محمد اعظم کے واقعہ نویس نے اطلاع دی کہ بادشاہ زادہ نے حریف پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا، پال داس رانا کا دیوان اس ارادہ سے آگاہ ہوا اور بادشاہ زادہ نے دلاور خاں کو اس کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا، دلاور خاں نے اکثر نافرمانوں کے خون سے اپنی تلوار کو لال کیا، اور پال داس نے فرار کے وقت اپنی زوجہ کو قتل کر دیا اس کی دختر چند دیگر عورتوں کے ہمراہ گرفتار ہوئی۔

قلیچ خاں بے اجازت بادشاہ زادہ کے حضور میں حاضر ہوا اور اس جرم کی سزا میں شرف باریابی سے محروم سے کیا گیا، پہلے اہتمام خاں کوتوال نے اس کو نظر بند رکھا بعد ازاں صلابت خاں کے حوالہ کیا گیا۔

محمد ابراہیم شجاعت خاں محمد اکبر سے جدا ہو کر شاہ عالم بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا، بادشاہ زادہ نے شجاعت خاں کو جہاں پناہ کے حضور میں روانہ کیا، مجرم اہتمام خاں کے سپرد فرمایا گیا کہ محلات اکبری میں نظر بند رہے۔

شہزادہ محمد اکبر کا دکن کی طرف فرار

حافظ محمد امین خاں نے عرض داشت کے ذریعہ سے اطلاع دی کہ محمد اکبر پہلے راٹھوروں کے گروہ کے ہمراہ کوہ دونگر سے رانا کے ملک میں وارد ہوا اور احمد آباد روانہ ہونے کا عازم ہوا لیکن اب جاسوسوں نے خبر دی ہے کہ سرون گڑھ کی راہ سے راج پتھلی ہوتا ہوا دکن روانہ ہو گیا ہے۔

سزاوار خاں ایک قصور کی بنا پر مع اپنے فرزند کے گرفتار کیا گیا اور جلال بیگ منکباشی کے

حوالہ کیا گیا، محمد شفیع مشرف غسل خانہ جو بظاہر اس تقصیر میں سزاوار خاں کا شریک پایا گیا منصب و خدمت سے برطرف کر دیا گیا، مغل خاں بجائے اس کے آختہ بیگ و بہرہ مند خاں، مغل خاں کی جگہ میر توزک مقرر فرمایا گیا، میرزا محمد ولد مرشد علی خاں مشرف غسل خانہ ہوا۔

روح اللہ خاں کے پیش دست مسمی تاپی داس اور خان مذکور کے منشی بالکشن نے خان جہاں بہادر کے باغی عامل کی جوالہ آباد میں فتنہ وفساد برپا کر رہا تھا ضمانت کی اور ہر دو ضامن اس جرم کی پاداش میں کوتوال کے سپرد کئے گئے۔

شہزادہ محمد اکبر کی مرہٹوں سے ساز باز

خان جہاں بہادر کی عرض داشت ملاحظہء والا میں پیش ہوئی کہ ساتویں جمادی الاوّل کو محمد اکبر نواح برہان پور سے گزرتا ہوا سنبھاجی مرہٹہ کے ملک میں وارد ہوا اور اس حربی زادہ نے شاہی باغی کی بے حد خاطر مدارات کر کے اس کو اپنے ملک میں قیام کرنے کی اجازت دی۔

ہمت خاں کے فرزند محمد مسیح اور اس کے بھائیوں اور نیز متوفی کے برادر واعزاء کو خلعت ماتمی عطا ہوئے، ہمت خاں کی وفات پر اشرف خاں بخشی اوّل مقرر فرمایا گیا، کامگار خاں اس کے تغیر سے واقعہ خان اور کامگار کے بجائے عنایت خاں ناظر بیوتات مقرر ہوئے، بدیع الزماں مہابت خانی جو اپنے طالع کی یاوری سے درگاہ والا میں حاضر ہوا تھا، رشید خاں کے خطاب سے سرفراز ہو کر عنایت خاں کے بجائے پیش دستی خالصہ کی خدمت پر مامور ہوا۔

بیس محرم کو جامع الکمالات میر سید محمد قنوجی تخت گاہ سے آستانہء شاہی پر حاضر ہوئے اور شرف باریابی سے شادکام ہو کر ایک ہزار روپیہ و دو خوان میوہ کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے۔

خان جہاں بہادر کے تغیر سے ایرج خاں صوبہء برہان پور کا ناظم مقرر ہوا، افراسیاب خاں پسر اسلام خاں دھامونی کی فوج داری سے حضور میں حاضر ہو کر خلعت ملازمت کے عطیہ سے فیض یاب ہوا۔

سید اشرف خطابت خانی پر بحال ہو کر ملکہء ملک خصلت بیگم صاحبہ کی سرکار کا میر سامان مقرر فرمایا گیا۔

دسویں ربیع الاوّل کو فیض اللہ خاں خلعت و فیل کے عطیات سے سرفراز ہو کر حسب الحکم

مراد آباد روانہ ہوا۔

عنایت خاں اجمیر کی فوج داری پر مامور ہو کر راٹھوروں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔

خان میرزا سفیر حاکم اُرنگ پندرہ ربیع الاوّل کو حضور میں حاضر ہو کر خلعت و کمر و خنجر کے عطیہ سے بہرہ اندوز ہوا اور ساتویں ربیع الآخر کو یعنی وقت رخصت جیغہ مرصع و پانچ ہزار روپے و مہر پنجاہ مہری کے عطیات سے سرفراز فرمایا گیا، قبلہء عالم نے نوشہ خاں حاکم اُرنگ کے لئے شمشیر مرصع قیمتی دو ہزار روپیہ خان میرزا کی معرفت روانہ فرمائی۔

تیس ربیع الاوّل کو محمدی راج پسر راجہ جسونت سنگھ شاہ جہان آباد سے آستانہ والا پر حاضر ہوا، چودہ ربیع الآخر کو حمید خاں ولد داؤد خاں کو بھوج پور کی اور میرک خاں کو دوآجالندھر کی تھانہ داریاں عطا ہوئیں۔

شہامت خاں کے تغیر سے مرید خاں کابل کا قلعہ دار مقرر ہوا، راجہ ماندھاتا کو غور بند کی تھانہ داری عطا فرمائی گئی، سیف اللہ میر بحر شاہ عالم بہادر کی خدمت میں پہنچ کر بغیر حصول انعام واپس آیا تھا، حکم ہوا کہ پانچ ہزار روپے سیف اللہ کو سرکار شاہی کے خزانہ سے ادا کئے جائیں اور رقم مذکور بادشاہ زادہ کی نقدی سالانہ سے وضع کر لی جائے۔

اشرف خاں میر بخشی و اعتماد خاں پیش دستِ دفترِ تن کو بلوریں دواتیں مرحمت ہوئیں۔

تیس ربیع الآخر کو قلیچ خاں زندان تادیب سے نکل کر ملازمت شاہی میں حاضر ہوا، اور رضوی خاں کے انتقال کی وجہ سے سولہ تاریخ اس کو دوبارہ خلعتِ صدارت عطا ہوا۔

رانا اودے پور کی تباہی

رانا اودے پور راندۂ ملک و مسکن ہوا حسن اتفاق سے اس کی تباہی و بربادی کا مصرع تاریخ بھی یہی مصرع برآمد ہوا کہ ع

''رانا راندہ شُد از ملک و مسکن''

اس باغی رانا نے لشکر شاہی کے ہاتھوں ضرب شدید کھائیں اور اس کا ملک تاراج و برباد کر دیا گیا، رانا اپنے ملک کی سرحد تک تو ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھاگتا رہا، لیکن آخر کار اس ہزیمت اثر فرار سے تھک گیا اور سوا امان طلبی و درخواست عفو قصور کے اس کو چارۂ کار نظر نہ آیا، رانا

نے عطا پیشہ، فرزند شاہ یعنی بادشاہ زادہ محمد اعظم کے دامن میں پناہ لی اور اقرار کیا کہ رقم جزیہ کے عوض ماندل پورہ بدھنور کے پرگنے نذر کرے گا۔

رانا اودے پور نے بادشاہ زادہ کی ملازمت حاصل کی اور شہزادہ نے اس کی پریشان حالی پر رحم فرما کر قبلہء عالم کے حضور میں معروضہ روانہ کیا، بادشاہ کرم گستر نے اپنے قلب مبارک کے اندیشوں پر فرزند رشید کی خاطر داری کو مقدم رکھا اور رانا کا قصور معاف فرمایا۔

ساتویں جمادی الآخر کو رانا اودے پور، راج سمدر کے تالاب پر شرف ملازمت سے فیض یاب ہوا۔

دلیر خاں ولد حسن خاں، رانا کو دربار میں لے آئے، قبلہء عالم و عالمیان نے رانا کو دست چپ کی طرف نشست کا حکم صادر فرمایا، اور رانا نے ادائے آداب و مجرا کے بعد پانچ سو اشرفیاں اٹھارہ گھوڑے باساز طلا و نقرہ نذر پیش کئے، جہاں پناہ نے رانا کو خلعت و شمشیر مرصع و جمدھر با پھول کٹارہ و اسپ باساز طلا و فیل باساز نقرہ عطا فرما کر خطاب رانا پر بحال فرمایا، رانا کو واپسی کی اجازت مرحمت ہوئی، اور اس کے ہمراہیوں کو ایک سو دس خلعت اور دس قبضہ جمدھر مرصع و چالیس گھوڑے مرحمت ہوئے۔

رانا بارگاہ شاہی سے دلیر خاں کی مجلس میں آیا اور خان مذکور نے کھڑے ہو کر استقبال کیا، دلیر خاں نے رانا کو نو تھان پارچہ و شمشیر مرصع ایک قبضہ و سپر با گل مرصع و نقشی برچھی و نو گھوڑے اور ایک فیل دیا، اور اس کے فرزند کو تین تھان پارچے کے خنجر مرصع و باز و بند مرصع اور دو گھوڑے عطا کئے۔

ملتفت خاں کی وفات

ملتفت خاں غازی پور زمانیہ کی فوج داری سے معزول فرما کر اکبر آباد کا فوج دار مقرر فرمایا گیا، اس امیر نے ایک گاؤں پر حملہ کیا اور کاری زخم کھایا جس کے صدمہ سے انیس جمادی الآخر کو وفات پائی۔

چوبیس تاریخ خان زماں پسر اعظم خاں و داماد آصف خاں جو شاہ عالم بہادر کے ہمراہ دکن سے آیا تھا اور ہنوز بادشاہ زادہ کے ہم رکاب، خدمات انجام دے رہا تھا ایرج خاں کے تغیر سے برہان پور کا صوبہ دار مقرر فرمایا گیا، جہاں پناہ نے اس امیر کو خلعت و اسپ باساز طلا عطا فرما کر اس کے

منصب میں ایک ہزاری کا اضافہ فرمایا، اور خان زماں پنج ہزاری و دو ہزار سوار کا منصب دار قرار پایا۔

انیس جمادی الآخر کو شاہ عالم بہادر سوجت جتیارن سے روانہ ہو کر آستانہء شاہی پر حاضر ہوئے، تربیت خاں، افتخار خاں کے انتقال کی وجہ سے اجمیر کے عہدہ سے جونپور کی فوج داری پر متعین کیا گیا۔ شکر اللہ خاں کے تغیر سے نظام الدین احمد سرہند کا فوج دار مقرر ہوا، میر محمد خاں کی وفات پر جان سپار خاں بندر کا قلعہ دار بنایا گیا، لطف اللہ خاں کے تبادلہ کی وجہ سے بہرہ مند خاں کو ملی خانہ کی داروغگی اور اس کے بجائے شہاب الدین خاں کو خدمت عرض مکرر عطا ہوئی۔

فیض اللہ خاں کی وفات

مراد آباد کے واقعہ نگار نے اطلاع دی، کہ فیض اللہ خاں ولد زاہد خاں کو کہ زادۂ نواب فلک قباب ثریا جناب بادشاہ بیگم صاحبہ نے مراد آباد میں وفات پائی، یہ شخص قبلہء عالم و نیز بیگم صاحبہ کی خدمت میں بے حد مقرب تھا فیض اللہ خاں نے عجیب بے خبر و آزاد زندگی بسر کی اور کسی شخص کے سامنے سر نیاز نہیں جھکایا یہ امیر بے حد باخبر تھا، اہل استحقاق کے ساتھ رعایات کرتا اور دنیاوی امور کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوتا تھا، اس کا تمام وقت چوپاؤں اور درندوں اور وحوش و طیور کی جو دور و دراز ممالک و بندرگاہوں سے خاص اسی امیر کے لئے لائے جاتے تھے پرورش و پرداخت اور ان کے سیر و تماشہ میں صرف ہوتا تھا، غرض کہ عجیب شخص تھا، آخر میں فیض اللہ خاں عارضہء فیل پا میں ایسا مبتلا ہوا کہ ہاتھی کی پشت پر سوار رہنے لگا، کبھی کبھی حضور شاہی میں حاضر ہوتا تھا لیکن دربار میں نہ آتا تھا اور جب کبھی آستانہء شاہی پر حاضر ہوتا تو زمین پر نہ اترتا تھا بلکہ سر سواری آداب و مجرا بجالا کر واپس ہو جاتا تھا، فیض اللہ خاں مرحوم کے انتقال کے بعد افراسیاب خان مراد آباد کا فوج دار مقرر ہوا۔

چوتھی رجب کو بادشاہ زادہ محمد اعظم و سلطان بیدار بخت رانا کی مہم کو سر کر کے آستانہء والا پر حاضر ہوئے، اور خلوت خانہ میں شرف قدم بوسی سے فیض یاب فرمائے گئے۔

تیرہ رجب کو سید یحییٰ، ملکہ شہر بانو دختر عادل شاہ بیجاپوری کو ساتھ لے کر حاضر حضور ہوا، ملکہ حرام سرا میں پہنچائی گئی اور بیس رجب کو بادشاہ زادہ محمد اعظم کے نکاح میں دی گئی، مسجد خاص و عام میں قاضی شیخ الاسلام نے خطبہء نکاح پڑھا اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقلید کو مدنظر رکھ کر پانچ سو درم دین مہر قرار پایا۔

چوبیسویں رجب کو جمیلتہ النساء عرف کلیان کنور دختر امر چند وخواہر جگت سنگھ زمیندار منوہر پور بادشاہ زادہ محمد کام بخش کے حبالہ ءعقد میں دی گئی، قاضی نے مسجد خاص و عام میں خطبہء نکاح پڑھا اور پچاس ہزار روپے کابین مقرر ہوئے۔

شیر محمد کوہانی کو شیر خاں کا خطاب عطا ہوا، غزہ شعبان کو خان جہاں بہادر کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ محمد اکبر قلعہ پالی میں جو قلعہ مسپولی سے متصل ہے قیام پذیر ہے، اور دوسو سواروں وآٹھ سو پیادوں کی جمعیت اس کے ہمراہ ہے، سنبھاجی نے ان فوجی ملازمین کے اخراجات کے لئے ایک رقم مقرر کردی ہے۔

بادشاہزادہ محمد اعظم کی سنبھاجی اور محمد اکبر کی تنبیہ کے لئے روانگی

پچیس رجب کو بادشاہ زادہ محمد اعظم، شاہ کے خطاب سے سرفراز ہو کر دکن کی مہم پر مامور فرمائے گئے، خدمت گار خاں نے خلعت یا بالا بند و سر پیچ مرصع محمد اعظم شاہ کے در دولت پر پہنچا دیا، بادشاہزادہ خواب گاہ مبارک میں حاضر ہو کر آداب بجالائے، اور جہاں پناہ نے فرزند رشید کو خواب گاہ مبارک میں نیمہ آستین، مروارید دوز قیمتی دو لاکھ پچیس ہزار چار سو روپے اور دیوان خانہ میں دو عربی و عراقی گھوڑے و فیل گج مانگ و پانچ چیتے مرحمت فرمائے، سلطان بیدار بخت بھی خلعت و اسپ اور مرصع کنگن کے عطیات سے فیض یاب فرما کر اپنے پدر عالی قدر کے ہمراہ روانہ کئے گئے، محمد اعظم شاہ کے دیگر ہمراہیوں کو بھی انعامات عطا ہوئے۔

تیرہ شعبان کو جمدۃ الملک اسد خاں کو حکم ہوا کہ اپنی فوج کے ہمراہ حکیم محسن خاں کو تخت گاہ روانہ کرے، اور فولاد خاں کی مہری رسید حاصل کر کے حضور میں پیش کرے۔

راجہ بھیم برادر رانا جے سنگھ آستانہءشاہی پر حاضر ہوا، محمد نعیم رانا راج سنگھ کی تعزیت کا خلعت اس کے فرزند رانا جے سنگھ کے لئے اپنے ہمراہ لے کر گیا تھا اب ملازمت شاہی میں حاضر ہوا، محمد نعیم کو رانا کی سرکار سے چار ہزار روپیہ نقد، دو گھوڑے، انیس تھان کپڑے کے اور چار اونٹ بطور انعام ملے تھے، محمد نعیم نے تمام اشیاء ملاحظہء عالی میں پیش کیں جو اس کو عطا فرمادی گئی۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا پچیسواں سال

1092ھ/1682ء

رمضان کا مبارک مہینہ اہل عالم کے لئے کرامت وافضال کا مژدہ لے کر آیا اور مسلمانوں کے سر پر رحمت الٰہی سایہ فگن ہوئی۔

جہاں پناہ کا اجمیر سے برہانپور تشریف لے جانا

دوسری رمضان کو قبلہء عالم نے حکم دیا کہ سواری مبارک اجمیر سے برہان پور روانہ ہو، اور پانچویں تاریخ اجمیر سے کوچ کر کے دیورائی میں پہلی منزل ہوئی۔

چھ رمضان کو شاہ زادہ محمد عظیم کو خلعت خاص وسمرنی مروارید وخنجر مرصع وشمشیر واسپ وفیل مرحمت فرمائے گئے، اور حکم ہوا کہ شہزادۂ مذکور اجمیر واپس جائیں، جمدۃ الملک اسد خاں شہزادہ کے ہمراہ کیا گیا، جمدۃ الملک کو خلعت خاص وخنجر مرصع واسپ مرحمت ہوئے۔

اعتقاد خاں پسر اسد خاں وکمال الدین خاں پسر دلیر خاں وراجہ بھیم اور اس کا فرزند اور دین دار خاں پسر نامدار خاں جس کو آخر میں مرحمت خان کا خطاب عطا ہوا، اور نیز دیگر ہمراہی بھی خلعت وجواہرات واسپ وفیل کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے، عنایت خاں فوج دار اجمیر و سید یوسف بخاری قلعہ دار گڑھ پتلی کو خلعتِ رخصت عطا ہوئے۔

جہاں آرا بانو بیگم کی وفات

ساتویں رمضان کو تخت گاہ کے واقعہ نویسوں نے اطلاع دی کہ نواب جہاں آرا بانو بیگم نے تیسری رمضان کو رحلت فرمائی اور حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمتہ علیہ کے روضہء

مقدس کے صحن میں اسی خانہ آخرت میں دفن ہوئیں جو مرحومہ نے اپنی حیات میں تعمیر کرایا تھا۔

قبلہ عالم کو ہمشیرۂ کلاں کے سانحہ وفات سے جو ماں کی طرح برادر گرامی قدر پر مہربان تھیں، بے حد افسوس ہوا، حقیقت یہ ہے کہ مرحومہ تمام پسندیدہ خصائل و بہترین شمائل کا مجموعہ تھیں، احسان و انعام حفظ آداب اخلاق و مخلوق کی پرورش کا خیال وغیرہ بہ صفات حسنہ مرحومہ کی سرشت میں داخل تھے، افسوس ہے کہ سایہ فیض اہل عالم کے سر پر نہ رہا اور زمانہ نے مایہ کرم وجود کو پیوند خاک کیا، حکم ہوا کہ مرحومہ کو نواب جنت مآب صاحبۃ الزمانی کے القاب سے یاد کیا جائے فرمان صادر ہوا کہ تین روز نوبت نوازی موقوف رکھی جائے، جہاں پناہ نے صبر سے کام لیا اور صاحبۃ الزمانی کے ملازمین و حشم کو طرح طرح کی نوازشوں سے سرفراز فرما کر مرحومہ کی روح کو خوش کیا۔

اوزبک خاں نذر بے، جس نے منصب سے برطرف ہو کر مکہ معظمہ حاضر ہونے کی اجازت حاصل کی تھی، اٹھارہ رمضان کو فوت ہوا۔

ساتویں شوال کو مختار خاں کو خلعت خاصہ عطا ہوا اور دوسرے روز عبا کے ریشم کے عطیئے سے سرفراز فرمایا گیا۔

انیس شوال کو معلوم ہوا کہ فوج دار شاہجہان آباد نے وفات پائی، اور اس عہدہ پر شکر اللہ خاں کا تقرر عمل میں آیا۔

چوبیس تاریخ قلیچ خاں دکن روانہ ہوا اور خلعت خاصہ واسپ ونقارہ کے عطیات سے سرفراز فرمایا گیا، شہاب الدین خاں کو حکم ہوا کہ افواج شاہی کے چند آدمی کے پہنچنے تک اپنے مقام سے حرکت نہ کرے۔

معروضہ پیش ہوا کہ محمد اعظم شاہ چھبیس تاریخ کو برہان پور سے اورنگ آباد روانہ ہو کر دسویں ذی قعدہ کو اورنگ آباد پہنچ گئے، بارہ ذی قعدہ بروز یک شنبہ جہاں پناہ نے برہان پور میں نزول اجلال فرمایا، قبلہ عالم کو معلوم ہوا کہ تیرہ ذی قعدہ کو اعتقاد خاں نے افواج شاہی کی ہمراہی میں راٹھوروں پر جو میرٹھ کے قریب تقریباً تین ہزار کی تعداد میں جمع تھے حملہ کیا، ایک شدید لڑائی کے بعد اقبال شاہی نے اپنا کام کیا اور اس لشکر نے حریف کو پامال و تباہ کیا، دشمن کے پانچ سو افراد جن میں سوتک اور اس کا بھائی عجب سنگھ و سانول داس و بہاری داس و گوکل داس وغیرہ زخمیوں اور مقتول میں داخل ہیں ہلاک ہوئے، اور بقیہ تعداد نے راہ فرار اختیار کی اس عجیب ہنگامے میں شاہی

سواروں کی بھی کثیر تعداد کام آئی اور شیر افگن وغیرہ نامی سردار زخمی ہوئے، اعتقاد خاں کے منصب میں پانصدی اضافہ فرمایا گیا و دیگر ثابت قدم بہادر بھی عنایات بادشاہی سے سرفراز ہوئے۔

اکیس تاریخ کو عبدالنبی بیگ روز بہائی کو خطاب خانی عطا ہوا اور توپ خانہ دکن کا داروغہ مقرر فرمایا گیا۔

بائیس تاریخ دوپہر کے وقت باروت کے دو حجروں میں جو برہانپور کے ارک قلعہ سے متصل واقع تھے آگ لگی جس سے بے شمار انسان ضائع ہوئے اور اسی شب لطف اللہ خاں کے دائرہ میں لال باغ کے قریب ڈاکہ پڑا، چھ آدمی ہلاک اور انیس نفر زخمی ہوئے اور اسباب تاراج ہوا۔

عجیب الخلقت بچے

واقعہ نگار جنیر نے اطلاع دی کہ ایک زمیندار کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا جس کے سر پر دو سینگ نمودار تھے۔ مولود دو روز کے بعد راہی عدم ہوا، اور ایک عورت نے ایسی دختر جنی جس کے سر اور منہ سیاہ اور ناک سفید و سرخ ہے بچی ہنوز زندہ ہے۔

حسن علی خاں اسلام آباد سے شاہی حضور میں حاضر ہو کر خلعت و اسپ و فیل کے عطیات سے بہرہ اندوز ہوا اور دکن کی مہم پر روانہ فرمایا گیا رضی الدین خان جو حسب الحکم حسن علی خاں کے خانگی و سرکاری مہمات کو سرانجام دیتا تھا، خلعت حاصل کر کے رخصت ہوا۔

بیس ذی قعدہ کو جہاں پناہ قدوۂ مشائخ کبار شیخ عبداللطیف رحمتہ اللہ کے مزار پر حاضر ہوئے اور فاتحہ خیر پڑھنے کے بعد حضرت شیخ کی روح پُرفتوح سے اعدائے دین کے مقابلہ میں مدد طلب کی۔

اکیس تاریخ رحمٰن قلی سفیر بخارا آستانہ والا پر حاضر ہوا اور اس نے دو گھوڑے، دس جوڑ دانہ اور ایک قطار اونٹوں کی ملاحظہ میں پیش کی سفیر مذکور خلعت و پانچ ہزار روپیہ کے انعام سے سرفراز ہو کر رخصت فرمایا گیا۔

غضنفر خاں کو حکم ہوا کہ محمد اعظم شاہ کے حضور میں خزانہ لے کر حاضر ہو۔ شہاب الدین خاں کو بخشی گری احدیاں کی خدمت عطا ہوئی۔

صلابت خاں خدمت و منصب پر بحال فرمایا گیا، اور بہرہ مند خاں کے تغیر سے داروغہ

توپ خانہ مقرر فرمایا گیا۔

انیس ذی قعدہ کو زمیندار چاندہ نے آستانہ بوسی کا شرف حاصل کر کے چار فیل اور نو راس اسپ ملاحظہء والا میں پیش کئے، دوسری محرم کو زمیندار مذکور خلعت خاصہ واسپ با ساز طلا و فیل و سر پیچ زمرد وغیرہ کے عطیات سے سرفراز فرمایا گیا، اور اس کو وطن واپس جانے کی اجازت مرحمت ہوئی۔

خان جہاں بہادر کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ خان مذکور نے قصبہ سیر اپور کو تاراج کیا۔

محمد شاہ ولد محمد علی خاں دارا شکوہی، حاجبِ گولکنڈہ مقرر ہوا، روح اللہ خاں بنکاپور کے تاراج کرنے پر مامور ہوا، شہاب الدین خاں و بندگان جلو و فتح خاں ولد دلیر خاں، روح اللہ خاں کے ہمراہ روانہ فرمائے گئے۔

کامگار خاں کے تغیر سے لطف اللہ خاں واقعہ خواں مقرر ہوا، ساتویں صفر کو عبدالرحیم خاں بخشی سوم نے وفات پائی اور اپنے باپ کے مقبرہ میں بمقام اورنگ آباد پیوند خاک کیا گیا، عبدالرحیم خاں کی خدمت پر کامگار خاں کا تقرر عمل میں آیا۔

دسویں صفر کو معلوم ہوا کہ راٹھوروں نے پرگنہء ماندل پور کو تاراج کیا اور بے شمار مال و متاع لے گئے۔

جہاں پناہ کا برہان پور سے اورنگ آباد واپس ہونا

غرۂ ربیع الاوّل کو جہاں پناہ برہانپور سے اورنگ آباد روانہ ہوئے، دوسری ربیع الاوّل کو شہزادہ معزالدین بہادر پور سے رخصت فرمائے گئے، تاکہ برہانپور میں قیام کریں، شہزادہ کو خلعت و سر پیچ و شمشیر و فیل مرحمت ہوئے، خان زماں ناظم کو خلعت عطا ہوا اور حکم ہوا کہ شہزادہ معزالدین کے ہمرکاب رہے۔

حامد خاں مریض حضور میں حاضر ہوا، جہاں پناہ نے اس کے ضعف و نقاہت پر رحم فرما کر خود ارشاد کیا کہ تا حصول صحت برہان پور میں مقیم رہے، اور کمر مبارک سے بالا بند کھول کر دست مبارک سے اس کی دستار پر باندھا، شیخ جہاں نواسہء شیخ ابراہیم قدیم قلعہ دار و فوج دار کو آسیر جانے کی اجازت مرحمت ہوئی۔

بیس محرم کو محمد اعظم شاہ اورنگ آباد سے آئے اور مقام کنوری میں پہنچ کر شرف ملازمت سے فیض یاب ہوئے۔

تیس محرم کو قبلہء عالم اورنگ آباد کے دولت خانہ میں تشریف فرما ہوئے۔

یلنگ توش خاں بہادر، ابونصر خاں کے تغیر سے خدمت توربیگی پر مامور ہوا، قبلہء عالم آب پاشی درہ و باغ فرمان باری میں تشریف فرما ہوئے باغبانوں کو انعام عطا ہوا۔

کنور کشن سنگھ کی وفات

کنور کشن سنگھ ولد راجہ رام سنگھ خانہ جنگی میں زخمی ہوا تھا، بارہ ربیع الآخر کو فوت ہوا، پندرہ تاریخ اس کا فرزند بشن سنگھ اپنے باپ کے منصب ہزاری و چہار صد سوار پر فائز ہوا۔

اٹھارہ تاریخ عنایت اللہ ولد سعد اللہ کو اخلاص خاں کا خطاب عطا ہوا، جمشید خاں ولد داؤد خاں برہانپور میں صاحب فراش تھا آخر کار راہی عدم ہوا۔

آٹھ تاریخ کو جمنا جی زمیندار کھڑک گڑھ ملازم سنبھاجی آستانہء والا پر حاضر ہو کر عطیہ خلعت سے سرفراز فرمایا گیا، مکرند سنگھ پسر پرتاپ سنگھ زمیندار کالی بھیت زر باقی کی وجہ سے خان جہاں بہادر کے پاس قید تھا، مکرند سنگھ حضور میں طلب فرمایا گیا، چونکہ ہفت سالہ طفل تھا، چودہ جمادی الاوّل کو قید سے آزاد کر کے وطن روانہ کیا گیا۔

سولہ تاریخ یادگار علی وکیل سکندر عادل دنیادار بیجاپور خلعت و دو ہزار روپیہ، و شیخ حسین وکیل سیدی مسعود بیجاپوری خلعت و ایک ہزار کے انعامات سے سرفراز فرما کر رخصت کئے گئے فیل و انگشتری فرستادۂ سکندر عادل قبول نہ فرمائی گئیں اور وکیل مذکور کو واپس کر دی گئیں۔

محمد معصوم وکیل قطب الملک دنیادار گولکنڈہ آستانہء والا پر حاضر ہو کر عطیہ خلعت سے سرفراز ہوا، دو لاکھ چوالیس ہزار روپیہ پیش کش اس نے نذر گزرانے۔

تئیس تاریخ کو شریف خاں چارہ کی تلاش میں گیا ہوا تھا کہ غنیم نمودار ہوا، غائبانہ زد و خورد واقع ہوئی، اور غیر مسلموں کی کثیر تعداد کام آئی، زاہد خاں چوراغا سبی و سیف اللہ پسر ہائے سعید خاں اس معرکہ میں جان نثاری کے ساتھ ہلاک ہوئے، قمر الدین خاں قراول بیگی نے سہ نالی بندوق سے ایک نیل گائے کا شکار کیا، جانور حضور میں پیش کیا گیا، یہ گائے تین گز ساڑھے چھ گز

لمبی اور دو گز تین گرہ اونچی تھی اس کی دم ایک گز ساڑھے تین گرہ لمبی تھی۔

تیس تاریخ روح اللہ خاں فتنہ پردازوں کی سرکوبی کے لئے احمد نگر روانہ ہوا، اس امیر کو شمشیر زرنشاں مرحمت ہوئی، حیات خاں قلعہ رام سج کی مہم پر مامور ہوا۔

محمد اعظم شاہ کی بیجاپور کو روانگی

اٹھارہ جمادی الآخر کو شاہ جم جاہ بادشاہ زادہ محمد اعظم شاہ کو بیجاپور روانہ ہونے کا حکم ہوا، جہاں پناہ نے بادشاہ زادہ مذکور کو خلعت و دو گھوڑے و فیل و کلگی و پہنچی و ادریسی کے عطیات سے سرفراز فرمایا۔

شہزادہ بیدار بخت بھی خلعت و اسپ و فیل کے عطیات سے بہرہ اندوز ہو کر اپنے باپ کی ہمراہی میں متعین فرمائے گئے، محمد پناہ کو پرخانہ زمرد عطا ہوا، شمس الدین خاں و دیگر ہمراہیوں کو بھی خلعت و اسپ و فیل مرحمت ہوئے۔

قلیچ خاں کے تغیر سے شریف خاں عنایات شاہی سے سرفراز ہو کر صدر الصدور قلمرو ہندوستان مقرر فرمایا گیا، بسونت راؤ دکنی چہار ہزاری و چہار ہزار سوار کا منصب دار مقرر ہوا، اور اس کو ادریسی مرصع مرحمت ہوئی، عبداللہ عبدالہادی و عبدالباقی پسران افتخار خاں اپنے باپ کی وفات کے بعد در دولت پر حاضر ہوئے، بادشاہ خدام نواز نے ان کو خلعت عطا فرما کر قید ماتم سے آزاد فرمایا۔

حافظ محمد امین کی وفات

غرۂ رجب کو قبلہء عالم کو معلوم ہوا کہ حافظ محمد امین صوبہ دار احمد آباد نے بیس جمادی الاوّل کو وفات پائی، یہ عمدہ اعیان دولت راستی و خودداری محبت و نیک سنجی اور نیز مالک کی وفاداری میں اپنی آپ نظیر تھا، اس امیر کا حافظہ بے حد قوی تھا، صوبہ داری احمد آباد کے زمانہ میں بیحد قلیل مدت میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔

حافظ محمد امین کی وفات پر مختار خاں کو ناظم صوبہء احمد آباد مقرر فرمایا گیا اور مختار کے بجائے خان زماں کو مالوہ کی صوبہ داری مرحمت ہوئی اور مغل خاں حسب الحکم خان زماں کے برہان پور میں مقیم ہو۔

مفتخر خاں پسر فاخر خاں قمرالدین خاں کے تغیر سے قراول بیگ ہوا، اور مفتخر خاں اپنے باپ کے ساتھ متعین ہوا، سلام خاں کے تغیر سے آتش خاں میر توزک مقرر فرمایا گیا، کانہو جی دکنی آستانہ والا پر حاضر ہوا، اور پنج ہزار کا منصب اس کو عطا ہوا۔

چوبیس شعبان کو خان جہاں بہادر ظفر جنگ کو کلتاش گلشن آباد مید ک سے قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا اور خلعت خاصہ و خنجر مرصع و چودہ قاب الوش اسے مرحمت ہوئے۔

سید منور خاں بجائے مغل خاں کے برہان پور روانہ ہوا، میر عبدالکریم پسر امیر خاں سرباری خواصان جس کا خدمت میں حاضر ہونا خود مرکوز خاطر تھا، عبدالقادر پسر حافظ ابراہیم کے تغیر سے داروغہ جانماز خانہ مقرر فرمایا گیا، ایک واقعہ نگار ملاّ عبداللہ سیالکوٹی کا شاگرد یک شنبہ کے روز اپنے استاد گرامی کے واسطہ سے شرف اسلام کے لئے حاضر ہوا جہاں پناہ نے اس شخص کو اخلاص کیش کا خطاب عطا فرما کر مشرف ابتیاع خانہ مقرر فرمایا، قبلہء عالم اس کے حال پر بے حد توجہ فرماتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا چھبیسواں سال

1093ھ/1683ء

ماہ رمضان نے اپنے قدوم حسنات لزوم سے منتظران رحمت وامیدواران خیر کو شادکام فرمایا، خدیودیں پرور نے تمام وقت خدائے ذوالجلال کی طاعت وعبادت میں صرف کیا۔

ماہِ رمضان کی دوسری تاریخ حمیدالدین ولد میرزا ابوسعید برادرزادۂ نور جہاں بیگم کو کرم اللہ خاں کی وفات کے بعد مونگی پٹن کی فوجداری مرحمت ہوئی، خان مرحوم کے ورثاء کو خلعت مرحمت ہوئے، پانچویں تاریخ یاقوت خاں وخیریت خاں فوج دار دندار اجپوری کے خلعت بہرہ مند خاں کے حوالہ کئے گئے۔

عطیات

ساتویں تاریخ خان جہاں بہادر کوکلتاش وخلعت خاصہ باکمر بند واسپ وفیل کے عطیات سے سرفراز فرما کر گلشن آباد میدک جانے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی، جگدیو رائے برادر جادو رائے دکنی آستانہء والا پر حاضر ہو کر عطیہء خلعت سے سرفراز ہوا۔

دسویں تاریخ محمد نقی ولد داراب خاں نے بہرہ مند خاں کی دختر کے ساتھ عقد کیا اور خلعت و اسپ وسہرہ مروارید کے عطیات سے فیض یاب ہوا، شہاب الدین خاں کے تغیر سے صالح خاں ولد اعظم خاں مرحوم بخشی گری احدیاں کی خدمت پر مامور ہوا۔

حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو دراز رحمتہ اللہ علیہ کے ایک فرزند مسمی سید یوسف کو مادۂ فیل بطور انعام مرحمت فرما کر گلبرگہ جانے کی اجازت مرحمت ہوئی، اہل دربار وتمام عمال صوبجات کو خلعت بارانی عطا ہوئے۔

چھبیس تاریخ شہزادہ محمد معزالدین برہان پور سے حاضر ہوکر شرف قدم بوسی سے بہرہ اندوز ہوئے۔

رن مست خاں برادر خضر خاں پنی وداؤد خاں وسلیمان برادران رن مست خاں آستانہء شاہی پر حاضر ہوکر خلعت عزت کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے۔

سید مبارک خاں قلعہ دار دولت آباد، حضور میں حاضر ہوا قبلہء عالم نے خلعت عطا فرما کر واپسی کی اجازت مرحمت فرمائی۔

لطف اللہ خاں کو داروغگی جلو خاص وچوکی خاص کی خدمت مرحمت ہوئی۔

چھ شوال کو شہزادہ معزالدین کو خلعت ومالائے مروارید واسپ عطا ہوئے، شہزادہ مذکور کے منصب میں ایک ہزار سواروں کا اضافہ ہوا، اور ہشت ہزاری وہشت سوار کے منصب دار قرار پائے، قبلہء عالم نے شہزادہ معزالدین کو احمد نگر روانہ فرمایا، رن مست خاں وداؤد خاں، غضنفر خاں وغیرہ متعینہ امیر واہل خدمات بھی اسپ وفیل کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے۔

شریف خاں کی وفات

شریف خاں صدر نے بارہ شوال کو وفات پائی، محمد عادل ومحمد صالح اس کے بیٹوں کو خلعت تعزیت مرحمت ہوئے۔

شیخ مخدوم منشی صدارت کُل کے عہدہ پر فائز ہوا، محمد صالح کنبوہ میر حسن کے تغیر سے پیش کار صدارت مقرر ہوا، سردار ترین کو سیو گاؤں کی فوج داری عطا ہوئی، عزیز اللہ خاں، محمد یار خاں کے تغیر سے خدمت میر توزکی پر مامور کیا گیا، اخلاص کیش کو مشرفی جائے نماز کا عہدہ عطا ہوا، ہدایت اللہ خاں خویش خلیفہ سلطان کو شاہجہان آباد کی دیوانی مرحمت ہوئی، شکر اللہ خاں سکندر آباد کا اور کامل خاں سہارن پور کا فوج دار مقرر فرما گیا، محمد مسیح ولد ہمت خاں، شلاخ خاں کے تغیر سے میر توزکی، کی خدمت پر متعین فرمایا گیا دوسری ذی قعدہ کو معروضہ پیش ہوا کہ عنایت خاں فوج دار اجمیر نے انتقال کیا۔

حمیدہ بانو بیگم کی وفات

بارہ تاریخ حمیدہ بانو بیگم والدۂ روح اللہ خاں نے وفات پائی، خدیو خدام نواز نے

بادشاہزادہ محمد کام بخش واشرف خان میر بخشی کوامیر مذکور کے مکان پر روانہ فرما کر روح اللہ خاں کو گوشہء ماتم سے باہر نکالا، بادشاہ زادہ فلک احتجاب نواب زیب النساء بیگم حسب الحکم روح اللہ خاں کے مکان پر تعزیت کے لئے تشریف لے گئیں۔

پندرہ ذی الحجہ کو کامیاب خاں بخش دکن مقرر فرمایا گیا، اور خان جہاں بہادر کے لشکر کو ہمراہ لے کر اپنی خدمت پر روانہ ہوا۔

سید محمد ہمشیرزادۂ حافظ محمد امین احمد آباد سے آستانہء والا پر حاضر ہو کر خلعت کے عطیہ سے سرفراز ہوا، سلیمان وردی پسر یلنگتوش خاں بہادر تخت گاہ سے آستانہ شاہی پر حاضر ہوا اور عطیہ خلعت سے فیض یاب فرمایا گیا۔

چھ محرم کو شہاب الدین خاں، مکرم خاں کے تغیر سے غائبانہ خدمت گرز برداری پر متعین فرمایا گیا، سید اوغلان کو شہاب الدین کی نیابت عطا ہوئی، محمد علی خانساماں ضعف کی وجہ سے پائین کٹہرہ سے نیچے گرا، قبلہء عالم نے بوڑھے خانساماں کو شیشہء گلاب و بید مشک و چند انار بیدانہ مرحمت فرمائے۔

اورنگ آباد کے قلعہ کی تعمیر اہتمام خاں کے سپرد ہوئی تھی، عبدالقادر پسر امانت خاں نے اس کام کو اپنے ذمہ لے کر چار ماہ میں عمارت تمام کر دی۔

عزہ صفر کو خان جہاں بہادر شرف قدم بوسی کے ارادہ سے سفر کر کے اورنگ آباد سے تین کوس کے فاصلہ پر مقیم تھا، قبلہء عالم نے اس کے فرزند نصرت خاں کی معرفت خان جہاں کو خلعت روانہ فرمایا، اور حکم ہوا کہ حضور شاہی میں حاضر نہ ہو بلکہ بیدر کی سمت روانہ ہو کر وہیں قیام کرے جس سمت کہ محمد اکبر جائے اسی جانب اس کے تعاقب میں خود بھی روانہ ہوا۔

اٹھارہ تاریخ خان جہاں بہادر کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ محمد اکبر باغی سنبھا کے حدود سے نکل کر جہاز پر سوار ہو گیا ہے۔

فرمان مبارک صادر ہوا کہ ملازمین سرکار میں جو امراء کہ دو ہزاری سے کم کے منصب دار ہیں، وہ رخصت و فاتحہ خوانی کے منتظر و امیدوار نہ رہیں مگر جب حضرت ولی نعمت از راہ خدام نوازی خود فاتحہ کے لئے دست خیر بلند فرمائیں تو امراء اختتام فاتحہ کا انتظار کریں، قاضیان ممالک جو ایک مرتبہ اپنی خدمت سے معزول کر دیئے جائیں دوبارہ ان کو عہدہ قضا نہ دیا جائے۔

شہزادہ محمد اعظم کے لئے عطیات

پانچویں ربیع الاوّل کو بادشاہ زادہ محمد اعظم شاہ کو ایک سو گھوڑے عربی و عراقی و ترکی کچھی و ایک سو اونٹ و بیس خچر و فیل کوہ شکوہ و جواہرات قیمتی اسّی ہزار و خلعت قیمتی دو ہزار آٹھ سو دیگر لباس قیمتی چودہ ہزار نو سو روپیہ کے عطیات مرحمت ہوئے اور شہزادہ بیدار بخت و گیتی آرا بیگم کو خلعت مرحمت ہوئے، تمام اعظم شاہی امراء کو بھی ان کے مراتب کے موافق خلعت عنایت ہوئے، اور یہ تمام اشیاء سلام خاں کے سپرد کی گئیں کہ بادشاہ زادہ تک پہنچادے۔

قبلہء عالم نے حکم دیا کہ سلام خاں ہر امیر کو بلا کر خلعت حوالہ کرے اور ہر خلعت یافتہ امیر آداب شاہی بجالا کر شاہ والا جاہ کی خدمت میں حاضر ہو اور تسلیمات بجالائے۔

گیارہ ربیع الاوّل کو بادشاہ زادہ محمد کام بخش نے حسب الحکم غسل خانہء مبارک میں اجلاس فرما کر بندگان شاہی و نیز اپنے ملازموں کو عنایات سے سرفراز کیا، بہرہ مند خاں کو حکم ہوا کہ جب بادشاہ زادۂ مذکور دیوان داری فرمائیں یہ امیر دربار میں مؤدب استادہ رہے۔

شہزادہ محمد کام بخش کا عقد

پندرہ تاریخ کو آرام بانو بیگم دختر سیادت خاں صفوی بادشاہ زادہ محمد کام بخش کے حبالہء عقد میں دی گئیں، قبلہء عالم نے خلعت بانیمہ آستین مروارید دوز خدمت گار خاں کی معرفت و جواہرات قیمتی دو لاکھ چھبیس ہزار خدمت خاں کے واسطہ سے شہزادہ کو مرحمت فرمائے، بادشاہ زادہ کی طرف سے پانچ لاکھ روپیہ نقد و دو راس اسپ عربی و فیل بطور نذر تسلیمات جہاں پناہ کے حضور میں پیش کئے گئے، قبلہء عالم کے حضور میں مسجد کے اندر قاضی شیخ الاسلام نے خطبہ نکاح پڑھا ایک پہر رات گزرنے کے بعد جہاں پناہ نے اپنے دست مبارک سے بادشاہ زادہ کے سر پر سہرۂ مروارید باندھا، تمام اعیان دولت و امرائے سلطنت ڈیوڑھی غسل خانہ سے فلک احتجاب نواب زیب النساء بیگم کی ڈیوڑھی تک حسب الحکم پیادہ پا بادشاہ زادہ کی سواری کے ہمراہ تھے غرض کہ جشن عقد و مجلس عیش و طرب بے حد زیب و زینت کے ساتھ انجام پایا۔

حسین میانہ بیجاپوری

بائیس تاریخ بیجاپور کے بزرگ زادوں میں سے ایک صاحب مسمی حسین میانہ اپنے طالع کی

بلندی و یاوری اقبال سے آستانہء شاہی پر حاضر ہوئے، آتش خاں نے غسل خانہء مبارک تک مہمان کا استقبال کیا اور اشرف خاں نے چبوترہ کے نیچے اُتر کر حسین میانہ سے کہا کہ خوش آمدید بہبود نمود، قبلہء عالم نے حسین میانہ کو پنج ہزار کا منصب وعلم ونقارہ وچالیس ہزار روپے نقد عطا فرما کر فتح جنگ خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا، حسین میانہ کے برادر واعزاء بھی اپنے اپنے مرتبہ کے موافق خلعت ومنصب سے فیض اندوز ہوئے۔

دلپت سنگھ کے تغیر سے مان سنگھ فوج دار ماندل پور کو بدنور کی فوج داری عطا ہوئی۔

اودت سنگھ پسر مہا سنگھ بھدوریہ اپنے باپ کی وفات کے بعد راجگی کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔

صفی خاں کی نظر بندی

بہار کا معزول صوبہ دار مسمی صفی خاں بارگاہ والا میں حاضر ہوا، اس امیر نے چھپّن ہزار روپے خزانہ شاہی سے بلا اجازت صرف کئے تھے لہٰذا اپنی خدمت سے برطرف کیا گیا۔

مغل خاں نے حسب الحکم صفی خاں کو آتش خانہ بہرہ مند خاں میں مقید کیا، اور پندرہ ربیع الآخر تک جب تک کہ روپیہ وصول نہیں ہوا، اسی طرح نظر بند رہا۔

مکرم خاں برطرفی کے بعد دوبارہ شرف کورنش سے سرفراز فرمایا گیا، اور بارہ ربیع الثانی کو اسے خلعت ملازمت حاصل ہوا، خسرو بیگ چیلہ حافظ محمد امین خان مرحوم کے اموال واسباب احمد آباد سے لے کر حضور میں حاضر ہوا، ستر لاکھ روپیہ ایک لاکھ پینتیس ہزار اشرفیاں وابراہیمی چھتر فیل، چار سو بیس گھوڑے ایک سو سترہ اونٹ ایک من سیسہ چار من باردت خان مرحوم کا تمام اثاثہ جہاں پناہ کے ملاحظہ میں گزرانا گیا۔

چار جمادی الاوّل کو معروضہ پیش ہوا کہ درجن سنگھ ہاڈہ نے بوندی پر حملہ کر کے شہر پر قبضہ کرلیا۔

آٹھ تاریخ محمد شریف ایلچی والی بخارا حضور میں باریاب ہو کر خلعت کے عطیہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

روح اللہ خاں، کوکن کی مہم سے فارغ ہو کر حضور شاہی میں حاضر ہوا، اور قبلہء عالم نے

خلعت وخنجر مرصع اور ایک سو دس اسپ عربی اسے عطا فرمائے۔

عزیز اللہ خاں اس کے برادر اور نوازش خاں رومی اور اکرام خاں دکنی ہر شخص کو خلعت و فیل مرحمت ہوئے۔

سید عبداللہ بارہہ عرف سید میاں ملازم شاہ عالم بہادر نے ضابطہ بادشاہی کے مطابق ہزاری شش صد سوار کا منصب حاصل کیا۔

سید نور محمد بارہہ کو سید خاں کا خطاب عطا ہوا۔

سید مظفر پر عنایت خسروانہ

ابوالحسن قطب الملک نے اپنے مدار المہام مادنا برہمن کے اغوا اور اپنی کم عقلی و ناقدری سے حیدر آباد کے نامور ترین شخص سید مظفر کو نظر بند کر دیا تھا، قبلہء عالم کے فرمان کے حاجب بادشاہی نے اس عالی نسب سید کو زندان اسیری سے رہائی دے کر حضور شاہی میں روانہ کیا، قبلہء عالم نے سید مظفر کو وقت ملازمت، خلعت وخنجر مرصع سے سرفراز فرمایا، سید موصوف کے ہر دو پسر صلابت خاں ونجابت خاں کے خطابات سے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے۔

بائیس تاریخ کو ہری سنگھ برادر چتر سنگھ زمیندار گڈہ بہ آستانہ پر حاضر ہو کر عطیہء خلعت سے سرفراز ہوا۔

سید احمد برادر حاکم مغرب، شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوا جہاں پناہ نے سید احمد کو خلعت مرصع و پانچ ہزار روپے نقد مرحمت فرمائے، مغل خاں، درجن سنگھ کے تباہ کرنے پر مامور ہوا۔

نرودہ سنگھ نبیرہ بھاؤ سنگھ ہاڈہ کو بودی جانے کی اجازت مرحمت ہوئی اور اس کے ساتھ خلعت واسپ وفیل نقارہ کے عطیات سے سرفراز فرمایا گیا رودر سنگھ ولد مہا سنگھ ولد مہا سنگھ بہدوریہ وسید محمد عابد علی ہمشیر زاد، حافظ محمد امین مرحوم وخواجہ بہاء الدین خویش سلیمان شکوہ وغیرہ کو خلعت و اسپ عطا ہوئے اور یہ امراء مغل خاں کی ہمراہی میں متعین کئے گئے۔

چوتھی جمادی الآخر کو ایوب بیگ ایلچی کاشغر کو خلعت وخنجر و دو ہزار روپے عطا فرما کر واپسی کی اجازت مرحمت فرمائی گئی خواجہ عبدالرحیم کو بیجاپور کی خدمت حجابت عطا ہوئی اور خلعت واسپ و ایک ہزار روپے مرحمت ہوئے۔

سید عبداللہ کو عزت خاں کے خطاب پر بحال فرما کر محمد اعظم شاہ کی فوج کی دیوانی مرحمت ہوئی۔

دلیر خاں و فتح جنگ خاں اور دوسرے امراء کو جو بیجاپور کی مہم پر متعین کیے گئے تھے، حکم ہوا کہ محمد اعظم شاہ کے ورود تک حضور میں حاضر رہیں، کشور داس ولد منوہر داس گورشولا پور کا قلعہ دار مقرر فرمایا گیا، شہاب الدین خیبر سے آستانہ والا پر حاضر ہوا، چودہ رجب کو شاہ زادہ محمد معز الدین ظفر آباد سے اور شہزادہ محمد اعظم برہان پور سے حاضر ہو کر شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوئے، شہزادہ محمد رفیع القدر نے اپنے قلم کا لکھا ہوا ایک قطعہ خط نستعلیق میں ملاحظہ والا میں پیش کیا، اور سرپیچ لعل کے عطیہ سے سرفراز ہوئے۔

تیس رجب کو حضرت شاہ عالم بہادر کی عمر گرامی کا سال چہل و یکم شروع ہوا اور قبلہ دین و دولت نے بادشاہ زادۂ مذکور کو طرۂ مرصع قیمتی ایک لاکھ پانچ ہزار ایک سو اسّی روپیہ مرحمت فرمایا۔

ملاّ عبداللہ کی وفات

جہاں پناہ کے حضور میں معروضہ پیش ہوا کہ فاضل اجل عارف الکل ملا عبداللہ پسر ملا عبدالحکیم سیال کوٹی نے رحلت فرمائی، شہریار فاضل نواز و معارف پرور نے ملائے مرحوم کے ہر چہار پسر اور ان کی زوجہ عفیفہ کے لئے خلعت تعزیت ارسال فرما کر ان کے وظائف میں بھی اضافہ فرمایا، حضرت ملائے مذکور اپنے زمانے کے مشہور فاضل و عارف اور شریعت و طریقت کے جامع تھے، آخر میں ملا صاحب پر فقر غالب آ گیا تھا اور دن کے ساتھ آخرت کے بھی سرمایہ دار ہو گئے قبلہء عالم اپنی پایہ شناسی سے ایسے جامع حضرات کی ہمیشہ قدر دانی فرماتے ہیں، جہاں پناہ نے اجمیر شریف کے زمانہ قیام میں ارادہ فرمایا کہ حضرت ملا عبداللہ کو خدمت صدارت عطا فرمائیں، قبلہء عالم نے اپنے قلم خاص سے فرمان تحریر فرما کر مقرب سلطان بختاور خاں کے جو اپنی فقر دوستی کی وجہ سے عرفا اور شاہ کے درمیان ہمیشہ واسطہ ہوا کرتا ہے حوالہ کیا اور حکم دیا کہ تحریر فرمان کے مطابق یہ امیر خود بھی ملاّ صاحب کو خط روانہ کر کے ان سے قبول خدمت کی درخواست کرے۔

ملا عبداللہ کو فرمان و خط وصول ہوئے اور اس بے نیاز عارف نے جواب میں بختاور خاں کو لکھا کہ اب زمان فراق ہے نہ کہ وقت تحصیل شہرۂ آفاق، لیکن فقیر حسب الحکم حاضر ہوتا ہے، ظاہر

ہے کہ اجمیر شریف میں حضرت خواجہ غریب نواز سلطان الہند رحمتہ اللہ علیہ کے آستانہ کی زیارت کے ساتھ حضرت قبلہء عالم وعالمیان کے در دولت پر بھی باریابی کا شرف حاصل ہو جائے گا، جہاں پناہ کو حضرت ملاّ کے جواب کی ادا بے حد پسند آئی، فاضل مرحوم اپنی تحریر کے مطابق اجمیر میں حاضر ہو کر بار ہا خدمت سلطانی میں حاضر ہوئے، ملا عبداللہ نے قدوۃ العارفین حضرت خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ کے روضہء مقدس کی زیارت حاصل کر کے جہاں پناہ سے واپسی وطن کی درخواست کی اور حسب الحکم وطن پہنچ کر چند ماہ کے بعد رحلت فرمائی، اللھم اغفر۔

کوتاہیٔ اہل بہ ہمیں عقدہ بند بود
افسانہا بہ بستنِ مژگاں تمام شد

محمد اعظم شاہ کی شجاعت

جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ شاہ جم جاہ محمد اعظم شاہ جو دریائے نیرہ کے کنارے مقیم اور حضور شاہی میں طلب کئے گئے تھے باوجود شدت برسات و کیچڑ و پانی کے جریدہ سوار ہو کر حاضر ہو گئے ہیں بار برداری کی قلّت کی وجہ سے بہت مختصر خیمہ بادشاہ زادہ کے ہمراہ ہے، جہاں پناہ نے از راہ شفقت حکم دیا کہ سرکار مبارک کا ایک خیمہ مسجد عیدگاہ کے متصل بادشاہ زادہ کے لئے نصب کیا جائے۔

آخر روز معروضہ پیش ہوا کہ شاہ والا جاہ گھوڑے پر سوار راہ طے فرما رہے تھے کہ ناگاہ فتح جنگ خاں کا ہاتھی مست ہو کر فوج پر دوڑا اور شاہ کے قریب پہنچ گیا سواری کا گھوڑا بھڑکا اور شاہ نے گھوڑے سے اتر کر ہاتھی کا مقابلہ کیا اور ہاتھی کی سونڈ پر تلوار کا ایک ہاتھ لگایا، اسی دوران میں شاہ کے پراگندہ ہمراہی ایک جا ہو گئے اور انہوں نے کاری زخموں سے ہاتھی کو ہلاک کیا۔

بادشاہزادہ محمد کام بخش و روح اللہ خاں اسی وقت روانہ فرمائے گئے اور چار ہزار روپیہ رقم تصدق سرکار والا کی جانب سے اپنے ہمراہ لے گئے، بادشاہ زادہ محمد کام بخش نے پانچ سو اشرفیاں اور روح اللہ خاں نے ایک سو اشرفیاں اور ایک ہزار روپیہ نذر بادشاہ زادہ کے ملاحظہ میں پیش کیا، بادشاہ زادہ ایک پہر چار ساعت گزرنے کے بعد واپس ہوئے۔

جو روز ملازمت میں حاضر ہونے کا تھا بادشاہ زادہ محمد کام بخش نے تمام اعیان ملک کے ہمراہ جن میں ایک ہزاری منصب دار تک داخل تھے شاہ کا استقبال کیا ہر امیر نے اپنے مرتبہ کے

مطابق نذرانہ تصدق پیش کیا اور شاہ کے حکم اقدس کے مطابق اپنے فرودگاہ سے شادیانہ بجاتے ہوئے قلعہ ارک میں داخل ہوئے، شہزادہ بیدر بخت حضور میں حاضر ہو کر سعادت قدم بوسی سے فیض یاب ہوئے، چونکہ شاہ والا جاہ کی حویلی مرمت طلب تھی اس لئے ختم تعمیر تک ان محلات میں جو خاص و عام سے متصل تھے قیام کی اجازت عطا ہوئی۔

محمد اسلم سالم کی نظم

محمد سالم المتخلص بہ اسلم نے شاہ و فیل کی معرکہ آرائی کے بیان میں ایک عمدہ مثنوی نظم کی جو مشہور زمانہ ہے۔

رشید خاں نے عرض کیا کہ حکم صادر ہوا ہے کہ باون لاکھ روپیہ کی رقم خرچ گواہٹی امیر الامراء سے بازیافت کی جائے، امیر الامراء نے عریضہ میں لکھا کہ کُل سات لاکھ روپیہ کی رقم خرچ ہوئی ہے، دیگر مصالح ملکی میں بنگالہ کی مدد بھی شامل ہے حکم ہوا اسی قدر رقم بازیافت کریں۔

گیارہ تاریخ محمد اعظم شاہ کے محل میں رانی اتم کر کے بطن سے فرزند پیدا ہوا، بادشاہ زادہ کی جانب سے ایک ہزار اشرفیوں کی نذر پیش ہوئی، جہاں پناہ نے نذرانہ قبول فرما کر مولود کو والا جاہ کے نام سے موسوم کیا۔

جو جدید ممالک کہ خان جہاں نے فتح کر کے ممالک محروسہ میں داخل کئے تھے ان کے انتظام و تشخیص آمدنی کے لئے حاجی شفیع خاں مامور ہو کر اس طرف روانہ ہوا۔

سیواجی کے منشی قاضی حیدر کی حاضری

سیواجی کا منشی قاضی حیدر آستانہ والا پر حاضر ہوا، قبلہ عالم نے خلعت و دس ہزار روپیہ نقد و منصب دو ہزاری کے عطیات سے سرفراز فرمایا، شہریار جرم بخش و خطا پوش کے فرمان کے مطابق حکیم محسن خاں خزانہ کے ہمراہ حضور میں حاضر ہو کر زندان ندامت سے آزاد ہوا، میرزا صدر الدین کو خطاب خان و رام گیر کی فوج داری عطا ہوئی۔

بارہ شعبان کو خان جہاں بہادر کے مرسلہ تحائف یعنی ہار مرصع داو ریسی مروارید و دو عدد فیل ملاحظہ شاہی میں پیش کئے گئے۔

اکیس شعبان کو قبلہ عالم بادشاہ زادہ محمد اعظم شاہ کے مکان واقع اندرون قلعہ اورنگ آباد میں تشریف فرما ہوئے محمد اعظم شاہ کو ایک انگوٹھی قیمتی دوسو پچھتر روپیہ، جہاں زیب بانو بیگم کو مالائے مروارید آویزۂ لعل قیمتی چودہ ہزار وگیتی آرا بیگم دختر بادشاہ زادہ محمد اعظم شاہ کو مالائے مروارید قیمتی انیس ہزار روپیہ اور بیجاپوری محل کو کڑہ مرصع قیمتی دو ہزار دوسو کے عطیات مرحمت فرمائے گئے حضرت شاہ کی طرف سے دو لاکھ اٹھانوے ہزار چار سو روپے بطور نذر پیش کئے گئے جن کو شرف قبولیت عطا ہوا۔

درجن سنگھ کا فرار

انیس شعبان کو مغل خاں کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ اس بہادر امیر نے برق کی طرح بوندی پر حملہ کیا اور تین پہر کامل شہر پر تیر و تفنگ کا مینہ برسایا درجن سنگھ فرار ہوا اور انرودہ سنگھ اپنی فوج و دیگر ملازمین شاہی کے ہمراہ بوندی میں داخل ہوا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا ستائیسواں سال

1094ھ/1684ء

سرچشمہء برکات الٰہی ماہ رمضان میں اہل عالم کے سر پر سایہ فگن ہوا اور قبلہء دین و دولت نے مسجد دولت خانہ میں تمام ماہ طاعت و عبادت الٰہی و خیرات و مبرات میں بسر فرمایا۔

ساتویں رمضان کو بادشاہ زادہ والا جاہ محمد اعظم شاہ کو خلعت و سرپیچ و خنجر مرصع و فیل و ایک سو گھوڑے اور دو لاکھ روپے نقد مرحمت فرما کر بیجاپور روانہ ہونے کی اجازت عطا ہوئی۔

شہزادہ بیدار بخت خلعت و سرپیچ و کلغی و خنجر و فیل کے عطیات سے سرفراز ہوئے اور حکم ہوا کہ اپنے پدر عالی قدر کے ہمراہ روانہ ہوں، سید شیر خاں و اخلاص خاں و کمال خاں وغیرہ و دیگر متعینہ امیر بھی طرح طرح کی نوازش سے سرفراز فرمائے گئے۔

صوبہء کشمیر میں اضافہ

چودہ شعبان کو عمدہ امیران دولت ابراہیم خاں ناظم صوبہء کشمیر کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ خان مذکور کے فرزند مسمی فدائی خاں کی حسن کوشش سے قصبہء تبت دلدل زمیندار کے قبضہ سے نکال کر ممالک محروسہ میں شامل کر لیا گیا، فرمان مبارک صادر ہوا کہ تمام درباری حضور میں حاضر ہو کر تسلیمات مبارک باد بجالائیں، اور فتح کے شادیانے بجائے جائیں، اس فتح نمایاں کے صلہ میں خان والاشان کے منصب میں دو ہزار سواروں کا اضافہ فرمایا گیا۔

ابراہیم خان ناظم صوبہ کشمیر کے منصب میں اضافہ

ابراہیم خاں اصل و اضافہ کے اعتبار سے اب پنج ہزاری پنج ہزار سوار و دو ہزار دو اسپہ کا منصب دار قرار پایا، قبلہء عالم نے خان مذکور کے نام ایک فرمانِ تحسین روانہ فرما کر اپنے باوفا امیر کو

ایک کروڑ دام نقد وخلعت خاصہ وخنجر مرصع پھول کٹارہ باعلاقہ مروارید قیمتی سات ہزار واسپ عربی قیمتی دوصد مہر باساز طلا وحلقہ ءخاصہ کا ایک فیل قیمتی پندرہ ہزار کے عطیات مرحمت فرمائے، ابراہیم خاں کے فرزند رشید کے اصلِ منصب ہفت صدی و چہار صد سوار میں اضافہ فرمایا گیا، اور یہ امیر ہزاری ہفت صد سوار کا منصب دار قرار پایا، فدائی خاں کو بھی خلعت خاصہ وشمشیر زرنشاں باساز مینا اور صد مہری اسپ باساز طلائی اور ایک ہاتھی قیمتی گیارہ ہزار کے عطیات مرحمت ہوئے۔

آتش خاں شاہی حکم کے مطابق محمد اعظم شاہ کے لشکر میں گیا اور محمد ہادی پسر میر خاں کو شاہی حضور میں لے آیا، محمد ہادی پہلے روح اللہ خاں کے سپرد کیا گیا، اور بعد میں صلابت خاں کی حراست میں دیا گیا، پچیس رمضان کو حکم ہوا کہ مجرم، قلعہ دولت آباد میں نظر بند کیا جائے۔

شاہ عالم بہادر کا کوکن کے مفسدوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہونا

تیسری شوال کو حسب الحکم حضرت شاہ عالم بہادر کا پیش خانہ نقارۂ شادیانہ کے ہمراہ اورنگ آباد سے کوکن روانہ ہوا، بادشاہ زادۂ مذکور کوکن ودرام درہ کے مفسدوں کی سرکوبی و نیز دیگر سرگوشوں کی گوشمالی کے لئے حسب الحکم شاہی روانہ ہوئے۔

دلیر خاں افغان کی وفات

دلیر خاں افغان نے طویل علالت کے بعد وفات پائی یہ بہادر اکثر معرکوں میں داد مردانگی و جاں نثاری دے چکا تھا، دلیر خاں قوی ہیکل و طاقت ور تھا، اس کی قوت اشتہا عجیب وغریب تھی، غرض کہ ابتدا سے انتہا تک اقبال مندی کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا۔

نواح اورنگ آباد کے حالات

ان واقعات کے ساتھ نواح اورنگ آباد کے مزارات کی کیفیت و نیز موضع آلورہ کا بھی مختصر حال تحریر کرنا ضروری ہے، واضح ہو کہ اورنگ آباد سے آٹھ کوس اور قلعہ دولت آباد سے تین کوس کے فاصلہ پر اولیائے کرام کے مزارات واقع ہیں ان مقابر میں حضرت شیخ برہان الدین، شیخ زین الحق منتخب الدین زربخش ومیر حسن دہلوی وسید راجو پدر میر سید محمد گیسو دراز و دیگر عارفان حق آرام فرما ہیں، ان میں سے اکثر حضرات سلطان اولیاء حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ کی

بارگاہ کے جاروب کش وحضرت کے مرید ہیں۔

دولت آباد

محمد شاہ تغلق نے ایک زمانہ میں قلعہ دیوگڑھ کو وسط ہندوستان سمجھ کر اس مقام کو دولت آباد کے نام سے موسوم کیا اور ارادہ کیا کہ اس شہر کو اپنا تخت گاہ قرار دے، بادشاہ نے دہلی کے تمام باشندوں کو دولت آباد میں سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا، اسی زمانہ میں یہ حضرات بھی دہلی سے دولت آباد تشریف لاکر ہمیشہ کے لئے اسی سرزمین میں آسودہ ہوئے۔

آلورہ کے غار

مقام مقابر سے تھوڑے فاصلہ پر آلورہ نام ایک مقام ہے جہاں قدیم زمانہ میں سحر کار کاریگروں نے بے حد کوشش وسعی کرکے پہاڑوں کے اندر عالی شان مکانات تراشے ہیں اور ان مکانات کی تمام چھتوں اور دیواروں پر طرح طرح کی سنگی تصویریں پہاڑوں کو تراش کر بنائی ہیں، پہاڑ کی سطح بالکل ہموار ہے اور اوپر سے مکانات کے نشان بالکل نمودار نہیں ہیں۔

قدیم زمانہ میں اس ملک پر غیر مسلم اقوام حکمراں تھیں انہیں اقوام میں سے کسی قوم نے ان مکانات کو کندہ کیا ہے غرض کہ بانی مکانات انسان ہیں نہ کہ وہ جن اور دیوتا جو ہندوؤں کے معبود ہیں۔

اس زمانہ میں یہ مقام ویران ہے، لیکن اس کی بنیادیں بے حد مستحکم ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ عاقبت بیں حضرات کے لئے جائے عبرت ہے یہ جگہ ہر موسم میں سرسبز وشاداب رہتی ہے خصوصاً موسم برسات میں کوہ وصحرا سبزہ کی شادابی وسیرابی کی وجہ سے باغ نظر آتے ہیں یہاں ایک آبشار بھی نوگز کی بلندی سے گرتا ہے اکثر سیاح یہاں سیر کے لئے آتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ مقام عجیب نظر فریب وسیر گاہ ہے جس کا لطف صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور معرض تحریر میں نہیں آسکتا۔

بادشاہ کا اورنگ آباد سے احمد نگر جانا

بادشاہ ذی قعدہ کی پہلی تاریخ موضع کرن پورہ پہنچے، شاہی سواری کے ورود سے دشمن لرزہ

برانداز ہوئے اور ملازمین بارگاہ آداب و مجرا کی سعادت حاصل کرنے کا موقع پا کر خوش اور شاداں ہوئے۔

محمد اعظم شاہ اور شہزادہ بیدار بخت جو بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے تھے سرپیچ و فیل و نیچہ و خلعت خاص کے عطیات سے سرفراز کئے گئے اور حسب اجازت انیس ذی قعدہ کو گلشن آباد روانہ ہوئے، پدم نائک زمیندار سکھر ملازمت سے بہرہ اندوز ہو کر شمشیر و خنجر اور جمدھر کے عطیہ و انعام سے معزز اور مکرم ہوا، چاندہ کی زمینداری بھی رام سنگھ کے تغیر سے کشن سنگھ کے حوالہ کی گئی۔

قاضی شیخ الاسلام کا تارک الدّنیا ہونا

تیسری ذی الحجہ کو دبیر خاں کے تعمیر کردہ قلعہ خام میں بادشاہ نے قیام فرمایا، قاضی شیخ الاسلام پسر قاضی عبدالوہاب اپنی ذاتی استعداد و سلیم فطرت کے تقاضہ سے جذبہء محبت الٰہی سے بے قرار ہوئے اور دنیا سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے، ہر چند جہاں پناہ نے ان پر عنایتیں فرمائیں اور ترک خدمت سے انہیں منع کیا اور عہدۂ قضا کو جو ایسے ہی مقدس و پاکیزہ نفوس کے لئے تھے انہیں کی ذات سے وابستہ رکھنا چاہا لیکن قاضی صاحب نے اپنے ارادوں میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کی، بادشاہ نے مجبور ہو کر خود قاضی صاحب کی رائے سے سید ابوسعید کو جو عالی نسب سید اور قاضی عبدالوہاب کے داماد تھے عہدہ قضا مرحمت فرمایا، سید ابوسعید دارالخلافت سے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے اور خلعت و شمشیر و جمدھر کے عطیہ و انعام سے خوش اور معزز کئے گئے۔

عطیات اور تقررات

دسویں ذی الحجہ کو محمد خلیل صاحب شہرنو کے حاکم، شاہی آستانہ پر حاضر ہوئے اور آداب و مجرا سے بہرہ اندوز ہو کر خلعت خاص اور ایک ہزار روپیہ کے انعام سے سرفراز کئے گئے، سری رنگ پٹن کے زمینداروں کے وکلاء مع پیش کش کے حاضر ہوئے اور ان کو دو سو روپیہ بطور انعام عطا ہوا۔

سید اوغلان بادشاہ زادہ محمد کام بخش کی معلّمی کے لئے مقرر کئے گئے، اور محمد صالح قاضی اورنگ آباد دارالخلافت کے عہدہ قضا پر مامور کئے گئے اور ان کے تغیر سے محمد اکرم مفتی لشکر اورنگ آباد کے قاضی مقرر ہوئے۔

میر عبدالکریم کو امانت ہفت چوکی کی خدمت کے ساتھ جائے نماز خانہ کی داروغگی بھی عطا ہوئی۔

سربلند خاں خواجہ یعقوب بہادر گڑھ کے شورہ پشتوں کی سرزنش و تنبیہ کے لئے روانہ ہوا کامگار خاں مغل کے تغیر ہونے کی وجہ سے آختہ بیگی کی خدمت پر مامور ہوا، شجاعت خاں پسر قوام الدین خاں میر آتش پر اور مطلب خاں احدیوں کی بخشی گری کے عہدوں پر فائز ہو کر سربلند و صاحب عزت ہوئے۔

نویں محرم کو روح اللہ خاں نے غنیم کی سرزنش کے لئے دریائے تہترا کی طرف اور بہرہ مند خاں کو آستی کی جانب کوچ کرنے کا حکم ہوا۔

معمور خاں المخاطب بہ دلیر خاں نے غنیم پر حملہ کر کے فتح پائی، اور اس کو خلعت و فرمان وطوغ وعلم دو اسپہ عطا ہوا۔

شہاب الدین خاں جنہوں نے دشمن کو بار بار کی تاخت و تاراج سے بالکل سرنگوں کر دیا تھا، پندرہویں محرم کو محمد غازی الدین خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز ہو کر بہادروں اور دلیروں کے ایک گروہ کے ساتھ ناموری حاصل کی، ان کے برادر محمد عارف مجاہد خاں اور محمد صادق جوشی صادق خاں کے خطابات سے بلند آوازہ ہوئے، دلپت بوندیلہ راجہ اودت سنگھ اور دیگر ہمراہیوں کو خلعت، ہاتھی اور گھوڑے عطا ہوئے اور ان کے وظائف ہیں ان کے مرتبوں کے موافق اضافہ کیا گیا۔

میر ہاشم اعظم شاہ کا ملازم بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا اور تولد فرزند کی عرض داشت اور ایک ہزار اشرفیاں نذرانہ کی بادشاہ کے حضور میں پیش کیں، نوزائیدہ فرزند ذی جاہ کے نام سے موسوم ہوا اور ایک کلاہ جس میں موتی جڑے ہوئے تھے، اور مرصع چشمک اور موتیوں کی لڑی اسے مرحمت ہوئی میر ہاشم خلعت خاص اور پانچ سو روپیہ کے انعام سے سرفراز کیا گیا۔

انیس صفر کو خان جہاں بہادر کی عرض داشت بادشاہ کے ملاحظہ میں گزری، جس میں مرقوم تھا کہ غنیم مقہور، دریائے کرشنا کے کنارے جمع ہوئے اور آمادہ بہ فساد تھے، خان جہاں نے تیس کوس سے ان پر حملہ کیا اور سخت آویزش اور شدید حملہ سے ان کو تاراج اور پامال کر کے بے شمار غیر مسلموں کو خاک وخون میں ملایا، اور ان کی عزت و ناموس کو تباہ و برباد کیا، جہاں پناہ نے خوشنودی کا فرمان اس سردار کے نام روانہ کیا اور اس کے فرزندوں یعنی مظفر خاں کو ہمت خاں اور نصرت خاں کو

سپہدار خاں ومحمد سمیع کو نصرت خاں ومحمد بقا کو مظفر خاں اور جمال الدین خاں کو جو اعظم خاں کو کہ کے فرزند کا داماد تھا صفدر خاں کے خطابات سے سرفراز فرمایا۔

جمدۃ الملک اسد خاں اجمیر سے بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا اور پچیسویں تاریخ کو بخشی الملک اشرف خاں غسل خانہ کے دروازہ تک حاضر ہو کر ملازمت سے سرفراز ہوا۔

ستائیس صفر کو محمد اعظم اور شہزادہ بیدار بخت نے شرف ملازمت حاصل کیا، اور ساتویں ربیع الاوّل کو دونوں شہزادے خلعت وجواہر کے عطیہ سے سرفراز ہو کر بہادر گڑھ روانہ ہو گئے۔

صلابت خاں کی حاضری

صلابت خاں نولکہ اودھ سے بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا، اور خلعت کے عطیہ سے سرفراز ہوا، اعظم شاہ کی سرکار کے دیوان لوک چند کو خلعت عنایت ہوا اور سانھ ہاتھی جو شہزادہ کو بطور انعام عطا ہوئے تھے اس کے ساتھ روانہ کر دیئے گئے۔

صوفی بہادر، شرف حضوری کی تمناول میں لے کر کاشغر سے آستانہء شاہی پر حاضر ہوا اور خلعت وخنجر بندمع ساز طلا اور تلوار اور ایک ہزار روپیہ کے انعام اور عطیہ سے صاحب عزت وجاہ ہوا۔

چوتھی ربیع الآخر کو رندولہ خاں نے دنیا سے کوچ کیا، نویں تاریخ کو عسکر اللہ تمیم ثانی کو عسکر خاں سید احسن پسر خان دوراں کو احسن خاں محمد مراد ولد مرشد قلی خاں کو محمد مراد خاں کے خطابات عطا ہوئے، چوبیسویں کو غازی الدین خاں بہادر کو پونا گڑھ دیونہ جانے کی اجازت مرحمت ہوئی، اور شاہی بندہ نوازی سے ترکش وکمان ودس ہزار روپیہ اور دومن سونے کے عطیہ سے مالا مال ہوئے، سعد اللہ خاں کے نواسہ کے فرزند مسمی قمرالدین چارصدی ایک سوسواروں کے امیر مقرر ہوئے، انیسویں کو محمد نعیم دارالخلافت کی دیوانی پر سرفراز ہوئے، پندرہویں جمادی الاوّل کو بخشی الملک روح اللہ خاں ایک جرار فوج کے ہمراہ شاہ عالم کے ساتھ روانہ ہوا، اور اس کے ہمراہ بیس ہزار اشرفیاں سوگھوڑے پانچ سو اونٹ اور شہزادوں ومقررہ امراء کے لئے فاخرہ خلعت وجواہرات واسپ وفیل روانہ کئے گئے۔

اسی تاریخ محمد اعظم شاہ اور شہزادہ بیدار بخت اور شہزادہ والا جاہ بھی خلعت فاخرہ، جواہرات

اور اسپ وفیل کے عطیہ سے مالا مال کئے گئے، صفی خاں کو اورنگ آباد کی صوبہ داری عطا ہوئی۔

سنبھا کے ملازمین کا قتل

بہرہ مند خاں نے گلشن آباد سے حاضر ہو کر بادشاہ کی ملازمت حاصل کی اور ایک ہاتھی کے عطیہ سے سرفراز کیا گیا، شجاعت خاں صف شکن کے خطاب اور خلعت و خاصہ وجیغہ وعلم وطوق کے عطیہ سے سرفراز ہو کر ہیری رنگ پٹن روانہ ہوا، سنبھا کے ایک سو بارہ ملازم جو چبوترۂ کوتوالی میں قید تھے قتل کئے گئے، محمد یار خاں پسر دلیر خاں معموری کو معمور خاں کا خطاب مرحمت فرما کر اسے اپنے والد کے پاس جانے کی اجازت مرحمت ہوئی۔

چھٹی جمادی الآخر کو سلطان والا جاہ کو اسّی روپیہ یومیہ کا وظیفہ عنایت ہوا، بارہویں تاریخ شہزادہ محمد کام بخش کے محل میں تولد فرزند کا مژدہ آیا، خواجہ یاقوت یہ خوشخبری لے کر آیا اور اسے خلعت عنایت ہوا، اور شہزادہ کو خلعت مع بالا بند وطرہ مرصع مرحمت ہوا، حاجی اسمٰعیل خاص نویس نے مادۂ تاریخ ولد محمد کام بخش نکالا اور اس کے صلہ میں خلعت سے سرفراز کیا گیا، مولود فرزند کو امید بخش کا نام عطا ہوا۔

شجاعت حیدر آبادی آستانہ شاہی پر حاضر ہوا منصب پنج ہزاری و ہزار سوار پر فائز ہو کر شجاعت خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، اعتقاد خاں ایک عمدہ لشکر کے ہمراہ ظفر آباد روانہ ہوا، میرک خاں فوج دار دوآبہ جالندھر گجرات کی فوج داری پر مقرر ہوا۔

تیرہویں تاریخ شاہ عالم بہادر کوکن سے بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے، اور خلعت و جواہرات قیمتی تین لاکھ نو ہزار روپیہ کے عطیہ سے سرفراز کئے گئے، روح اللہ خاں اور منور خاں نے آستانہ بوسی کا شرف حاصل کیا اور انہیں بیش بہا خلعت عطا فرمائے گئے، مغل خاں جونر وہ سنگھ کی مدد اور درجن سنگھ کو تباہ کرنے کے لئے مہم پر گیا ہوا تھا کامیاب واپس آیا اور خلعت تحسین کے عطیہ سے ہم چشموں میں صاحب عزت ہوا۔

محمد مظفر کا حاضر ہونا

حاجی مہتاب حیدر آبادی نے آستانہء والا کی جبہ فرسائی کا شرف حاصل کیا، رجب کی

23- تاریخ قطب الملک کا حاجب محمد مظفر بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا، یہ شخص حافظ محمد امین کا اُستاد زادہ ہے، جس وقت اکبر آباد سے کابل روانہ ہوا اس نے بختاور خاں سے سفارش کی کہ اس کو ملاحظہ والا میں پیش کیا جائے شاہی حضور میں پیش ہونے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اسے محمد اکبر کی سرکار میں ایک منصب مل گیا چونکہ اس میں قابلیت کے کچھ جوہر موجود تھے، قلیل عرصہ کے بعد شہزادہ کی سرکار میں مستقل ہو کر داروغہ کے عہدہ پر فائز ہو گیا۔ محمد اکبر کی بغاوت کے بعد یہ شخص حیدر آباد چلا گیا اور اپنے لاف وگزاف سے کہ میں ایسا اور ایسا ہوں اور فلاں فلاں امیروں کا عزیز قریب ہوں سلطان ابوالحسن اور اس کے درباریوں میں مقرب ہو گیا اور عین الملک کے خطاب سے سرفراز ہو کر صاحبِ عزت وجاہ ہوا۔

اس زمانہ میں سلطان ابوالحسن نے کسی شخص کو برسم نفانت بارگاہ سلطانی میں روانہ کرنے کا ارادہ کیا، جعفر کے باطل وعدے اس کے لئے وبال جان ہوئے اور مجبوراً سفیر بن کر شاہی آستانہ پر حاضر ہوا، محمد جعفر کی حاضری کے وقت بختاور خاں نے جہاں پناہ سے سفر کا پورا حال بیان کیا اور بادشاہ نے زبان مبارک سے فرمایا کہ ابوالحسن کی حماقت دیکھو اس نے محمد اکبر کے نوکر کو سفیر بنا کر میرے دربار میں بھیجا ہے، محمد جعفر اور اقبال نامہ کے کاتب میں رسم ملاقات تھی اور اس نے ملاقات کا پیغام دیا، شان وشوکت کے ملاحظہ اور مال ومتاع کی کثرت دیکھ کر اس سے پوچھا کہ یہاں کیوں آئے ہو اس نے کہا عزیزوں کا شوق دیدار مجھے یہاں کھینچ لایا ہے، جواب دیا کہ تم نے بہت برا کیا، دو روز کے بعد کوتوال اس کے مکان پر گیا اور اسے چبوترہ پر لے آیا اور اس کے تمام مال ومتاع کی ضبطی کا حکم نافذ کیا گیا، ایک زمانہ کے بعد سہ صدی منصب دار مقرر ہو کر صوبہء بنگال کو روانہ ہو گیا۔

زیب النساء بیگم کی آمد

ستائیسویں رجب کو نواب ثریا القاب زیب النساء بیگم اورنگ آباد سے خدمت شاہی میں حاضر ہوئیں، شہزادہ محمد کام بخش اور سیادت خاں اور کامگار خاں شہزادی کے استقبال کو گئے اور عزت اور حرمت کے ساتھ حرم سرا میں لے آئے۔

شعبان کی 12- تاریخ شہزادہ محمد اعظم کے محل میں والا جاہ کی والدہ کے بطن سے فرزند پیدا

ہونے کی تہنیت میں پانچ سو اشرفیوں کی نذر جہاں پناہ کے حضور میں پیش کی گئی، بارگاہ معلّٰی کے تمام ملازمین آداب و مجرا بجالائے اور مولود کو والاشان کے نام سے موسوم کیا گیا۔

21- تاریخ کو ایک معروضہ پیش ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ میرزا محمد دس ہزار روپیہ اور فیل و ادریسی اور بہاری داس آٹھ ہزار روپیہ اور فیل جوان کو بطور انعام قطب الملک کی سرکار سے ملے تھے حاجب کے پاس چھوڑ کر حاضر ہوئے ہیں، ان اشخاص کو شرف باریابی عطا ہوا۔

عبدالرحمٰن قلعہ دار بہادر گڑھ کے معروضہ کے ساتھ سنبھاجی کی دو بیویاں اور ایک لڑکی اور تین تین لونڈیاں بارگاہ سلطانی میں حاضر کی گئیں۔

خان جہاں بہادر ظفر جنگ کوکلتاش و دلیر خاں و غازی الدین خاں بہادر اور دوسرے نامی امراء و افسران فوج نے اس مدت میں اپنی جانکاہ کوشش و نمایاں کارگزاری سے غنیم بدبخت کے قبضہ سے جس قدر قلعے و محالات متعلقہ نکال کر قلمرو سلطانی میں داخل کئے اگر ان کی فہرست لکھی جائے، تو ایک دوسرا دفتر تیار ہو سکتا ہے بارفدایا اسلام کے حامی و شریعت و احکام کے رائج کرنے والے اور بدعت گمراہی کو مٹانے والے فرماں روا کی عمر و اقبال میں روز افزوں ترقی عطا ہوئی۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا اٹھائیسواں سال

1095ھ/1685ء

اسی دوران میں جلالِ کرامت نشان رمضان نے افق آسمان پر نمودار ہو کر اہل عالم کو صبح رحمت کی آمد آمد کی بھردی اور فلاح دارین کا مژدہ سنایا، بادشاہ دیں پناہ نے تمام ماہ گوشہ مسجد میں خالق اکبر کی طاعت وعبادت میں بسر فرما کر مخلوق خدا کو انوار عدل وشفقت سے منور فرمایا۔

مغل خاں صوبہ دار مالوہ

دوسری رمضان کو مغل خاں، خان زماں کی وفات کے بعد سلطنت کے اعلیٰ ترین عہدہ یعنی صوبہ داری مالوہ کی خدمت پر متعین ہوا قبلہء عالم نے خان مذکور کو خلعت وذوالفقار نام فیل مرحمت فرما کر اس کے منصب میں بھی اضافہ فرمایا، مغل خاں اصل واضافہ ہر دو اعتبار سے اب سہ ہزار پنصدی وسہ ہزار سوار کا منصب دار قرار پایا۔

دوسرے امراء کے مناصب میں اضافہ

پانچویں تاریخ سیادت خاں کو معظم خاں کا خطاب عطا ہوا، اور یہ امیر بجائے مغل خاں کے خدمت قوش بیگی پر متعین فرمایا گیا، صفی خاں کے تغیر سے حاجی شفیع خاں حارس اورنگ آباد و محتشم خاں کے تغیر سے صفی خاں ناظم اکبر آباد اور سیف خاں کے انتقال کرنے سے محتشم خاں ناظم الہ آباد مقرر فرمائے گئے۔

محمد تقی ولد داراب خاں ومطلب خاں ونیز مختار خاں صوبہ دار احمد آباد کے دیگر اعزا مرحوم صوبیدار کی وفات پر صف ماتم پر بیٹھے ہوئے تھے بادشاہ خدام نواز نے ان غم زدہ بندگان بارگاہ کو

خلعت کے عطیہ سے سوگواری کی قید واندوہ سے آزاد فرمایا، قبیلہ بنی مختار کے اراکین اکثر پسندیدہ عادات کی وجہ سے ممدوح ومشہور زمانہ رہے ہیں مختار خاں مرحوم خاص طور پر قابل تعریف اور ہر طبقہ میں ہر دل عزیز اور ہر شخص کا ممدوح تھا۔

اٹھارہ رمضان یوم چہار شنبہ کو سیدۃ النساء بیگم دختر میرزا رستم پسر مکرم خاں شہزادہ معزالدین کے حبالہء عقد میں دی گئی، قاضی ابوسعید نے قبلہ عالم وشاہ عالم بہادر کے حضور میں عصر کے وقت خطبہء نکاح پڑھا قاضی مذکور کو خلعت اور ایک ہزار روپے نقد مرحمت ہوئے۔

کیف خاں اور سیف خاں کی وفات

جہاں پناہ کے حضور میں معروضہ پیش ہوا کہ کفایت خاں بائیس رمضان کو اور سیف خاں ناظم الہ آباد پچیس ماہ مذکور کو فوت ہوئے۔

انتیس رمضان کو ہلال عید نے نمودار ہو کر مژدہ مسرت سنایا۔

یکم شوال کو جہاں پناہ نماز عیدالفطر ادا فرمانے کی غرض سے گھوڑے پر سوار ہو کر عیدگاہ تشریف لائے۔

چوتھی شوال کو صلابت خاں، کار طلب خاں محمد بیگ کے تغیر سے متصدی بندر سورت مقرر فرمایا گیا، اور کار طلب خاں کو احمد نگر کی فوج داری مرحمت ہوئی۔

صلابت خاں کے تغیر سے خانہ زاد خاں ولد ہمت خاں کو داروغگی بندہائے جلو عطا ہوئی۔

صالح خاں ولد اعظم خاں کو کہ کو بریلی کی فوج داری ودیوانی کا عہدہ عنایت ہوا، نورالدین پسر صالح خاں کو خلعت عطا ہوا اور حکم ہوا کہ اپنے باپ کے ہمراہ روانہ ہو، کامیاب خاں صالح خاں کے تغیر سے بخشی تیر انداز میں مقرر فرمایا گیا، پلنگ توش خاں بہادر سالانہ دار ملازم تھا دوسری شوال کو عطیہء منصب سے سرفراز ہوا، بہرام خاں برادر جعفر خاں پدر بہرہ مند خاں نے وفات پائی، عمدۃ الملک اسد خاں مرحوم کا ہمشیر زادہ تھا، جہاں پناہ نے نیمہ آستین چکن دوزا اپنے بدن مبارک سے اتار کر بطور خلعت اسد خاں کو مرحمت فرمائی، بہرہ مند خاں کو بخشی الملک اشرف خاں گوشہ ماتم سے باہر نکال کر حضور شاہی میں لایا قبلہء عالم نے اس کو خلعت مرحمت فرما کر غم و اندوہ سے آزاد فرمایا۔

شہزادہ محمد معزالدین کا عقد

آٹھ شوال کو شہزادہ محمد معزالدین کا جشن کتخدائی منعقد ہوا، شہزادۂ مذکور خلعت بالادست و جواہرات قیمتی ایک لاکھ پچاس ہزار و اسپ باساز طلا و فیل باساز نقرہ کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے۔

سیدۃ النساء بیگم کو جواہرات قیمتی سرسٹھ ہزار مرحمت ہوئے۔

نماز مغرب کے بعد حضرت شاہ عالم بہادر و دیگر شہزادے شہزادہ محمد معزالدین کو بے حد شان و شوکت کے ساتھ اپنے دولت خانہ سے کاشانہ شاہی میں لائے، قبلہء دین و دولت نے اپنے دست مبارک سے سہرۂ مروارید شہزادہ کے سر پر باندھا، شاہ عالم بہادر کے دولت خانہ سے آستانہء والا تک دور یہ چراغاں سے نمدہ و دل فریب منظر معلوم ہوتا تھا یہ جشن شادی نواب قدسیہ زینت النساء بیگم کے زیر انتظام انجام پایا، دو پہر رات گزرنے کے بعد عروس شہزادہ کے حرم میں پہنچادی گئی۔

اکیس شوال کو غازی الدین خاں بہادر قلعہ راہبری کی تسخیر کے لئے روانہ ہوئے اور خلعت خاصے پانچ گھوڑوں کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے، ممدوح کے فرزند رشید قمرالدین علی خاں کو شمشیر و دیگر ہمراہیان لشکر کو خلعت عطا ہوئے۔

نو ذی قعدہ کو محمد اعظم شاہ کو ایک سوتر کی و کوہی گھوڑے روانہ فرمائے گئے، فخرالدین خاں کو سوپہ کی اور عبدالہادی خاں کو چاکنہ کی اور مرحمت خاں پسر نامدار خاں کو کڑہ کی تھانہ داریاں مرحمت ہوئیں۔

عطیات و مناصب

چھبیس تاریخ بخشی الملک روح اللہ خاں خلعت و اسپ و فیل کے عطیات سے سرفراز ہو کر مفسدوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا، قاسم خاں محمد بدیع بلخی و الہام اللہ خاں و عبدالرحمن ملازمان شاہ عالم بہادر ایک ہزار سواروں کے ہمراہ اور حیات اباولی جو قندھار سے حضور والا میں حاضر ہوا تھا، و نیز دیگر متعینہ امیر و دار اضافہء مناصب و خلعت و فیل و اسپ و جیغہ کے عطیات سے بہرہ

اندوز فرمائے گئے، ہرکدام یداجی و اکوبی ملہار و راؤ سبحان چند، غازی الدین خاں بہادر کے فرستادہ افراد کو خلعت مرحمت ہوئے، شہزادہ دولت افزا کو سرپیچ لعل با آویزۂ مروارید عطا ہوا کفایت خاں حاتم بیگ صوبجات دکن کی خدمت دیوانی پر مامور ہوا، عنایت اللہ خاں مشرف جواہر خانہ وخلعت خانہ کو وقائع نگاری کی خدمت عطا ہوئی۔

سلطان امید بخش کی وفات

چوتھی ذی الحجہ کو سلطان امید بخش ولد بادشاہ زادہ کام بخش نے وفات پائی قبلہ عالم بادشاہ زادہ مذکور کے مکان پر تشریف لائے اور ہر قسم کی دلدہی سے بادشاہ زادہ کو تسلی و تشفی فرماتے رہے۔

رام سنگھ کی شکست

معروضہ پیش ہوا کہ افواج بادشاہی نے رام سنگھ زمیندار چاندہ کو شکست دی اور مغلوب حریف چوتھی ذی الحجہ کو اپنے اہل وعیال کو چھوڑ کر کوہستان کی طرف فرار ہوا اور اعتقاد خاں وحمزہ خاں وکشن سنگھ چاندہ میں داخل ہوئے، اس واقعہ کے بعد اکیس ذی الحجہ کو رام سنگھ قصبہ چاندہ میں وارد ہوا اور اس نے ارادہ کیا کہ اپنی حویلی میں داخل ہو مراد بیگ کا ایک ملازم جس کا نام کشن سنگھ تھا اور جو دروازہ کا محافظ تھا مانع آیا، رام سنگھ نے مراد بیگ پر جمدھر کا وار کیا اور ایک کاری زخم سے مجروح کیا دوسرے ملازمین نے رام سنگھ سے ہجوم کر کے اس کو قتل کیا ضرب کے دوسرے روز مراد بیگ بھی فوت ہوا چھ محرم کو جہاں پناہ نے خلعت وفرمان وفیل کشن سنگھ کے لئے روانہ فرمائے، ہری سنگھ زمیندار گڈہ کو خلعت ارسال فرمایا گیا۔

ہمشیرزادۂ قلیچ خاں بخارا سے آستانہ شاہی پر حاضر اور شمشیر وخنجر باساز طلاء و دو ہزار نقد و منصب شش صدی دوصد سوار کے انعام وعطیات سے سرفراز فرمایا گیا، عبدالقادر خویش مخلص خاں مرحوم جس نے قلعہء کندانہ مغلوب دشمن کے قبضہ سے نکال کر عبدالکریم کے سپرد کر دیا تھا ساتویں محرم کو دردولت پر حاضر ہوا پانصدی ایک صد سوار کا امیر تھا یک صدی پنجاہ سوار کے اضافہ سے سرفراز ہوا، سیف اللہ خاں کے تغیر سے اہتمام خاں سردار بیگ داروغہ نوارہ مقرر فرمایا گیا۔

دختر سید مظفر حیدر آبادی کامگار خاں کے حبالہء عقد میں دی گئی، اور خان مذکور کو خلعت

کنخدائی عطا ہوا۔

اعتقاد خاں چاندہ سے آستانہ والا پر حاضر ہوا اور یلنگتوش خاں کے تغیر سے خدمت توریبگی پر فائز ہو کر خلعت واسپ وفیل واضافہ پانصدی تک صد و پنجاہ سوار کے عطیات سے سرفراز ہوا اور اصل واضافہ ہر دو اعتبار سے دو ہزاری چار صد سوار کے امراء میں داخل ہوا۔

میر عبدالکریم کے بجائے حیات خاں، امین ہفت چوکی مقرر فرمایا گیا، خدمت گزار خاں نے وفات پائی، اور اس کے فرزند محمد قلی کو خلعت ماتمی عطا ہوا، خان مذکور کے انتقال سے داروغگی چیلہ و منازل نزول کی خدمت فتح محمد کے سپرد کی گئی۔

قاضی حیدر منشی رقم کو خطاب خانی عطا ہوا، شیخ مخدوم منشی وصدر فاضل خاں کے خطاب سے سربلند فرمایا گیا، سرآمد خوش نویساں حاجی اسمٰعیل جو فرامین خط گورین میں رقم کرتا تھا، روشن قلم کا خطاب مرحمت ہوا۔

قاضی شیخ الاسلام

غرۂ صفر کو قاضی شیخ الاسلام حرمین شریفین کی زیارت وطواف سے سعادت اندوز ہونے کے خواستگار ہوئے، شیخ الاسلام کو سفر کی اجازت مرحمت ہوئی اور دوشالہ پرم نرم و رسالہء آداب زیارت عطا فرمایا گیا بادشاہ دیں پناہ نے ایک عریضہء نیاز سردار دو جہاں بادشاہ کون ومکاں حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی بارگاہ شفاعت پناہ میں اپنے قلم سے لکھا اور عریضہء مذکور کو ایک صندوقچہ میں بند کر کے شیخ الاسلام کے حوالہ کیا اور ان کو حکم دیا کہ بارگاہ خیرالانام میں صلوٰۃ وسلام عرض کر کے شکہء مبارک سے یہ عریضہ روضہء اقدس کے اندر ڈال دے۔

سہراب خاں ولد رعد انداز خاں کو حکم ہوا کہ ایک توپ گولہ یک منی وتین توپیں بست آثاری بخشی الملک روح اللہ خاں کے پاس بیجاپور روانہ کرے، اعتقاد خاں پازنیر وسکیر کے سرکشوں کو پامال کرنے کے لئے روانہ فرمایا گیا، رشید خاں پیش دست دفتر خالصہ جناریزی کا مقدمہ فیصل کرنے کے لئے اندور روانہ ہوا، خان زماں کی وفات کے بعد اس کے پسر برہان پور سے دردولت پر حاضر ہوئے قبلہء عالم نے آستانہ بوس افراد کو خلعت واضافہ ومنصب سے شاد فرمایا۔

آتش خاں ایک جرار و آزمودہ لشکر اور بادشاہ زادہ محمد کام بخش کی جمعیت کے پانچ سو

سواروں کے ہمراہ گولکنڈہ روانہ ہوا۔

حمید الدین خاں ولد اہتمام خاں اپنے باپ کے نغیر سے داروغگی خاتم بند خانہ کی خدمت پر سرفراز ہوا۔

قلعہ راہیری پر قبضہ

چھبیس صفر کو معلوم ہوا کہ غازی الدین بہادر نے قلعہ راہیری میں آگ لگا دی اور اکثر سرداران کفار کو قتل کر کے ان کے مال واسباب کو تاخت وتاراج کیا، غازی الدین خاں بہادر نے بادشاہ کے اقبال سے کامل فتح حاصل کر کے حریف کے زن وفرزند ومویشی پر اپنا قبضہ کیا۔

چھبیس صفر کو معلوم ہوا کہ غازی الدین بہادر نے قلعہ راہیری میں آگ لگا دی اور اکثر سرداران کافر کو قتل کر کے ان کے مال واسباب کو تاخت وتاراج کیا، غازی الدین خاں بہادر نے بادشاہ کے اقبال سے کامل فتح حاصل کر کے حریف کے زن وفرزند ومویشی پر اپنا قبضہ کیا۔

سید اوغلان مژدہ رساں کو ایک فیل بطور انعام مرحمت ہوا شاہ محمد چوبدار غازی الدین خاں بہادر، خان مذکور کے پاس سے بہ تبدیل لباس حاضر ہوا، جہاں پناہ نے چوبدار مذکور کو خلعت اور دو سو روپے مرحمت فرمائے، غازی الدین خاں بہادر کو فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا، علم ونقارہ کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے، خان مذکور کے ہمراہیوں میں اعلیٰ وادنیٰ ہر قسم کے منصب داروں کے لئے ڈیڑھ سو سے زائد خلعت روانہ فرمائے گئے، چوتھی ربیع الاوّل کو خان زاد خاں ملکہء عصمت مآب نواب اودے پوری محل کو اپنے ہمراہ لانے کے لئے اورنگ آباد روانہ ہوا، دسویں ربیع الاوّل کو تمام بندگان دربار ونیز ملازمین صوبہ جات کو زمستانی خلعت مرحمت ہوئے۔

بختاور خاں کی وفات

15- ربیع الاوّل کو بختاور خاں داروغہء خواصاں نے رحلت کی، بادشاہ خدام نواز کو مرحوم کے، جو مصاحب رازداں اور مالک کا مزاج داں ہونے کے علاوہ صاحب فہم وفراست وبزرگ منش خادم بھی تھا اور جس نے تیس سال کامل جاں نثاری کے ساتھ خدمت کی تھی انتقال سے بے حد افسوس ہوا، فرمان مبارک کے موافق بختاور خاں کا جنازہ عدالت گاہ کی طرف لایا گیا، اور خود

قبلہء عالم نے نماز جنازہ کی امامت فرمائی اور چند قدم لاش کے ہمراہ تشریف لے گئے، جہاں پناہ نے مرحوم کی فاتحہ و نیز اس کے نام پر خیرات و مبرات جاری کرنے کے احکام صادر فرمائے، بختاور خاں کی لاش حسب الحکم تخت گاہ کو روانہ اور خود مرحوم کی تیار کردہ قبر میں پیوند خاک کی گئی، بختاور خاں مرحوم علماء و فقرا و شعرا کو بے حد عزیز رکھتا تھا اور جیسا کہ پیشتر مذکور ہوا، اہل ہنر و با کمال حضرات کا ہمیشہ معاون و مددگار رہا کرتا تھا، فن انشا و تاریخ دانی میں اچھی مہارت رکھتا تھا، مرحوم کی تصنیف و تالیف میں نسخہء مرآۃ العالم یادگار زمانہ و مقبول خاص و عام ہے، یہ امیر تہذیب اخلاق و خیر خواہی خلایق میں عدیم المثال تھا، رحمتہ اللہ علیہ۔

بختاور خاں کی وفات پر پلنکتوش خاں داروغہء خواصاں مقرر ہوا، حکیم محسن خاں کو داروغگی جواہر خانہ اور میر ہدایت اللہ کو داروغگی آلات طلائی کے خدمات مرحمت ہوئے۔

مصنف کا واقع نگار مقرر ہونا

قبلہء عالم نے خاکسار مؤلف کو جو اس سے پیشتر بختاور خاں مرحوم کا منشی اور دیوان تھا اور مرحوم کے پوشیدہ احکام کے مسودات اصلاح کے لئے جہاں پناہ کے حضور میں پیش کرتا تھا، یادفرما کر بندگان شاہی میں داخل فرمایا، اور اسی روز وقائع نگاری کی خدمت پر مامور فرمایا۔

دربار خاں ناظر کی وفات

دوسری ربیع الآخر کو دربار خاں ناظر محل نے وفات پائی، یہ امیر بھی قدیم بندگان شاہی میں داخل و بزرگ منش و خیر مجسم اور اپنے مالک کا حقیقی جاں نثار تھا، قبلہء عالم نے بختاور خاں مرحوم کی طرح اس کے ساتھ بھی سلوک فرمایا اور دربار خاں کی لاش بھی اسی طرح لائی گئی اور جہاں پناہ نے نماز جنازہ کی امامت فرما کر لاش کو تخت گاہ روانہ کرنے کا حکم دیا، خدمت خاں ناظر خدمت عریضہ کو دربار خاں کی خدمت بھی مرحمت ہوئی اور شیخ عبداللہ پسر شیخ نظام داروغہء دواخانہ مقرر فرمایا گیا، اٹھارہ ربیع الآخر کو شجاعت خاں حیدرآبادی نے وفات پائی اور اس کے فرزند ملک میران کو خلعت و منصب عطا ہوا، بیس تاریخ روح اللہ خاں مفسدان بیجاپور کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا، اس امیر کو خلعت خاص و کلگی مرصع و نقرئی نقارہ مرحمت ہوا، قبلہء عالم نے دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ نقد و جیغہ

برخانہ الماس وسرپیچ الماس شاہ خورشید کلاہ کے لئے دولڑی مروارید نواب جہاں زیب بانو بیگم کے لئے تکیہ مربع شاہزادہ بیدار بخت کے لئے، سمرنی مرصع شاہزادہ والا جاہ کے لئے دولڑی مروارید ذی جاہ کے لئے اور انہیں خلعت سرفراز خاں و فتح جنگ خاں وکھانوچی و بسونت راؤ وغیرہ امراء کے لئے روح اللہ خاں کے معرفت روانہ فرمائے۔

وفادار خاں کا سفیر بلخ مقرر ہونا

پچیس تاریخ وفادار خاں نبیرۂ سعید خاں بہادر کوز بردست خاں کا خطاب مرحمت فرما کر سفارت بلخ کی خدمت پر روانہ ہونے کی اجازت عطا ہوئی، قبلہء عالم نے خان مذکور کو خلعت و جمدھر شمشیر و سپر باساز مرصع و ترکش و کمان و اسپ و فیل و دس ہزار روپے نقد کے عطیات سے سرفراز فرما کر اس کے منصب میں پانصدی یک صد سوار کا اضافہ فرمایا، ایک عدد ہاتھی قیمتی اٹھارہ ہزار مع دیگر نفیس و بیش بہا تحائف کے خان والا شان سبحان قلی خاں کے لئے زبردست خاں کی معرفت روانہ فرمائے گئے، شفقت اللہ خاں المخاطب سردار خاں کا قصور معاف ہوا، اور میر توزک دوم کی خدمت پر مامور فرمایا۔

ستائیس ربیع الآخر کو شہزادہ جستہ اختر اورنگ آباد سے حضور میں حاضر ہوئے اور خلعت و بازو بند مرصع کی عطیات سے سرفراز فرمائے گئے، خواجہ عبدالرحیم بیجاپور کی خدمت سفارت انجام دے کر آستانہء شاہی پر حاضر ہوا، اور اس کو خلعت و فیل و پانچ ہزار روپے کے عطیات مرحمت ہوئے۔

میر عبدالکریم کو داروغگی جاکے نماز خانہ کے علاوہ نقاش خانہ کی داروغگی بھی مرحمت ہوئی، اور راقم الحروف مشرف نقاش خانہ مقرر فرمایا گیا۔

یکم جمادی الاوّل خان بہادر نواب فیروز جنگ حضور والا میں حاضر ہوئے اور جہاں پناہ نے اس امیر باتوقیر کو خلعت خاصہ اور خنجر مرصع اور پانچ عدد گھوڑے اور سات تولہ گلاب کے عطیات سے معزز سربلند فرمایا۔

بیجاپور کا محاصرہ

جہاں پناہ کے حضور میں معروضہ پیش ہوا جس سے معلوم ہوا کہ 2۔ جمادی الآخر کو بیجاپور کا

محاصرہ شروع ہوا خان جہاں بہادر ظفر جناب نے زہرہ پور کی طرف نصف کوس کے فاصلہ سے اور روح اللہ خاں وقاسم خاں نے پاؤ کوس کے فاصلہ سے مورچل بندی شروع کردی ہے۔

قلعہ سیوانہ پر راٹھوڑوں کا قبضہ

ہرکارہ کی زبانی معلوم ہوا کہ بیس جمادی الاوّل کو راٹھوڑوں نے قبضہ کرلیا اور پرول خاں ولد فیروز خاں میواتی ایک گروہ کثیر کے ہمراہ میدان جنگ میں کام آیا، دریائے تنگ بھدرا کے کنارہ بیجاپوری دستہ نے بادشاہ زادہ محمد اعظم شاہ کے لشکر پر حملہ کیا اور ایک معقول تعداد کو تہ تیغ کر کے فرار ہوا، 18- تاریخ محمد اکبر کا ملازم دو عدد گھوڑے بطور پیش کش لے کر حاضر ہوا، ایلچی کو شرف باریابی عطا نہ ہوا لیکن حضرت کے حکم کے مطابق نواب عالم بادشاہ بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوا، 29- تاریخ سربلند خاں خواجہ یعقوب خویش شاہزادہ مراد بخش نے وفات پائی۔

احمد نگر کے حالات

شہر وقلعہ احمد نگر کا مختصر حال ہدیہ ناظرین ہے، واضح ہو کہ قلعہ احمد نگر سطح زمین پر واقع ہے، اس حصار آسمان شکوہ کی بنا جو تحت الثریٰ تک پہنچی ہوئی ہے بلا مبالغہ میخ کوہ ہے جو دفع لرزہ کے لئے سینہ زمین پر قائم ہے قلعہ کے اطراف میں میدان ہے اور حصار کے اندر عالیشان عمارات و پرفضا باغات ہیں جن میں تہہ خانہ کے اندر واقع ہونے سے عجیب صنعت وکاریگری کی گئی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قلعہ کے دور میں ایک خندق ہے جو ہمیشہ پانی سے لبریز رہتی ہے، دو نہریں بیرون قلعہ سے اندر لائی گئی ہیں، شہر قلعہ سے پاؤ کوس کے فاصلہ پر آباد ہے اور اس میں کوئی حصار نہیں ہے، شہر احمد نگر عمارات وکثرت انہار وآبادی کے لحاظ سے عدیم المثال سمجھا گیا ہے۔

دانش مند خاں مرحوم جو ایک عرصہ تک بغرض تجارت اس شہر میں مقیم رہا اکثر کہا کرتا تھا کہ احمد نگر کشمیر سے بہتر ہے حوالی شہر میں باغ فرح بخش وبہشت باغ عجیب وغریب تماشہ گاہیں ہیں جن کو صلابت خاں نے مرتضیٰ نظام شاہ کے زمانہ جنوں میں بادشاہ کے نام سے نصب کیا تھا، ان ہر دو باغ کا طول وعرض اور ان کی نامدہ روزگار عمارات کا ذکر بقائے یادگار کے لئے تحریر کرتا ہوں۔

باغ فرح بخش دو ہزار گز کے طول وعرض میں جس کے دو سو اٹھتر بیگھے ہوتے ہیں واقع ہے،

اس باغ کے وسط میں ایک حوض ہے جو پانچ سو اٹھائیس گز یعنی انتیس بیگھہ کے رقبہ میں ہے، اس حوض میں پایان کوہ سے ایک پوشیدہ نہر لائی گئی ہے حوض کے وسط میں ایک بلند وعجائب روزگار دو منزلہ عمارت ہے جس میں ایک سو ساٹھ کمرے ہیں اس کے علاوہ ایک بلند وآسمان پایہ گنبد ہے، تیرانداز اس کی بلندی پر تیر پھینک کر اپنی مشاقی فن کا اندازہ کرتے ہیں۔

بہشت باغ کا طول تین سو بارہ گز یعنی سو بیگھے کے مساوی ہے اس باغ کے وسط میں بھی ایک حوض ہے جس میں اسی ترکیب سے نہر لائی گئی ہے، وسط حوض میں ایک عمارت ہے جو بالفعل ازکار رفتہ ہے، لب حوض صاف وشفاف حمام ودل کش مکانات واقع ہیں جو قابل قیام ہیں، قلعہ سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ایک مشہور مقام ہے جس کو منجر سنبہ یا منزل سبا کہتے ہیں، بیان کرتے ہیں کہ کمرکوہ میں ایک مستحکم بنیاد عمارت ہے اور فوارہ سرچشمہ کوہ سے سوگز سے زائد بلند ہوکر نہایت زور وشور کے ساتھ ہمیشہ اور ہر فصل میں حوض میں گرتا ہے، بادشاہ عالم وعالمیاں نے ان مقامات کی سیر فرمائی اور تباہ شدہ حصوں کی مرمت کا حکم دیا، صلابت خاں کا مقبرہ بھی جو بالائے کوہ واقع ہے نادر روزگار عمارت ہے اس نواح کی آب وہوا گرم نہیں اور رات کو لحاف اوڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جہاں پناہ کا احمد نگر سے غولا پور روانہ ہونا

2- جمادی الآخر کو کارپردازان سلطنت نے نیک ساعت وفرخندہ روز میں پیش خیمہء شاہی کو شہر احمد نگر سے نکال کر باغ فرح بخش کے نواح نصب کیا، پانچویں منزل پر قبلہء عالم نے قیام فرمایا۔

سید اوغلان

چھ تاریخ کو سید اوغلان کو سیادت خاں کا خطاب مرحمت ہوا، یہ عالی نسب سید جو خان فیروز جنگ کا استاد تھا اپنے شاگرد رشید کے ہمراہ ولایت سے ہندوستان آکر یاوری بخت سے ملازمت شاہی میں داخل ہوا۔

ارجو جی عم زادہ سنبھاجی خلعت واسپ ومنصب دو ہزاری ویک ہزار سوار کے عطیات سے

سرفراز فرمایا گیا، عزت اللہ خاں کو حصار احمد نگر میں قیام کرنے کی اجازت ہوئی، قبلہء عالم نے خان مذکور کو ایک مصحف مجید وخلعت خاص وبیس ہزار نقد کے عطیات مرحمت فرمائے، فیروز جنگ بہادر کے دیگر ہمراہی بھی عطیہ خلعت وخنجر سے سرفراز فرمائے گئے۔

خواجہ عبداللہ قاضی لشکر کو قضایت حضور کی خدمت عطا ہوئی، 29- تاریخ قمرالدین خاں کو مختار خاں کا خطاب عطا ہوا، قمرالدین خاں بہادر پسر نواب فیروز جنگ خطاب خانی سے سرفراز فرمائے گئے، عزۂ رجب کو جہاں پناہ شولا پور پہنچے، اور اعتقاد خاں کو ظفر آباد جانے کی اجازت مرحمت ہوئی، اور خلعت خاص وترکش وکمان کے عطیات سے سربلند فرمایا گیا، خان مذکور کے ہمراہیوں کو بھی خلعت واسپ وشمشیر مرحمت فرمائی گئیں بہرہ مند خاں حیدرآباد روانہ فرمایا گیا۔

شاہزادہ شاہ عالم پر حملہ

ساتویں رجب کو حضرت شاہ عالم بہادر گھوڑے پر سوار دربار میں آرہے تھے کہ ایک شخص شمشیر علم کر کے بادشاہزادہ کی طرف دوڑا، مجرم گرفتار کیا گیا اور بادشاہ زادہ کے حکم کے مطابق کوتوال کی حراست میں دے دیا گیا۔

شاہ عالم بہادر کا ابوالحسن کی تنبیہ کے لئے روانہ ہونا

فرمان مبارک کے مطابق محمد جعفر حیدرآبادی کے ملازمین اردوئے معلّٰی میں مقیم اور اہتمام خاں، کوتوال کے دائرہ میں فروکش تھے، جہاں پناہ کے حکم کے مطابق آقا اور ملازمین کے درمیان جس قسم کی خط وکتابت ہوتی تھی وہ اہتمام خاں کوتوال کو دکھلائی جاتی تھی اگر کوئی امر قابل گزارش ہوتا تو خان مذکور نوشتہ جات کو قبلہء عالم کے حضور میں پیش کر دیا تھا اس کے علاوہ جاسوس بھی نگرانی کے لئے مقرر فرما دیئے گئے تھے چونکہ حیدرآبادی کے استیصال کا وقت آچکا تھا اس لئے ملازمین کے نام ایک خط اس مضمون کا روانہ کیا۔

''اب تک ہم نے حریف کی بزرگی کا احترام کیا لیکن یہ معلوم کر کے کہ دشمن نے غریب سکندر کو یتیم سمجھ کر بیجاپور کا محاصرہ کرلیا ہے اور تو عمر فرماں روا کو بے حد پریشان کر رہے ہیں ہم کو پاس ادب کا لحاظ رکھنا ضروری

نہیں ہے اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ ایک طرف سے سنجاجی بے شمار لشکر کے ساتھ بے کس سکندر کی امداد کرے اور دوسری طرف مابدولت، خلیل اللہ خاں پلنگ احمد کی ماتحتی میں چالیس ہزار جنگ جو سواروں کو متعین کریں، اور پھر دیکھیں کہ حریف دکن کے کس طرف اور کن کن اشخاص کے مقابلے میں جنگ آزمائی وصف اندازی کرتا ہے جو ملازمین کہ چبوترہ کوتوالی کے قریب حریف کے پنجہ میں گرفتار ہیں ان کو اس واقعہ سے شکستہ دل نہ ہونا چاہئے اگر خدا نے چاہا تو جلد اس کا تدارک کردیا جائے گا۔''

اہتمام خاں نے حیدرآبادی کا یہ خط قبلہء عالم کے ملاحظہ میں پیش کیا اور اسی خط کی بنا پر حضرت شاہ عالم بہادر 6- شعبان کو حیدرآباد کی مہم پر روانہ ہوئے، جہاں پناہ نے بادشاہزادہ مذکور کو خلعت خاصہ وخنجر مرصع وبیس عدد گھوڑے مرحمت فرمائے، دیگر شاہ زادے اور امرائے کبار بھی خلعت وجواہر، اسپ وفیل واضافہ کے انعام وعطیات سے سرفراز ہوئے۔

30- شعبان کو روح اللہ خاں بیجاپور سے واپس آیا، اور خان بہادر نواب فیروز جنگ کو احمد نگر روانہ ہونے کی اجازت مرحمت ہوئی، خانہ زاد خاں کے تغیر سے کامگار خاں داروغہ جلو مقرر ہوا، اور کامگار خاں کے بجائے مختار خاں کو داروغہ اصطبل کی خدمت عطا ہوئی۔

27- شعبان کو قبلہ عالم نے خنجر دستہ یشم، باعلاقہ مروارید و پھول کٹارہ بادشاہ زادہ محمد اعظم کے اور مروارید کی سمرنی وفرغل بارانی شہزادہ بیدار بخت کے لئے کامگار خاں کی معرفت روانہ فرمائیں۔

22- شعبان کو مغل خاں ناظم مالوہ فوت ہوا اور 27- تاریخ تربیت خاں فوج دار جون پور نے وفات پائی، میر عبدالکریم معتوب ہوکر داروغگی جانماز خانہ کی خدمت سے معزول فرمایا گیا، اور بجائے اس کے محمد شریف کا تقرر عمل میں آیا، قبلہ عالم نے فرمایا کہ ہم نے اس میمون باز چنیا فروش بتنگ نواز کی مہم کو کسی وقت پر ملتوی کر رکھا تھا لیکن اب جبکہ مادا فروش کے بھی بانگ دی تو تاخیر کا موقع نہیں رہا۔

جہاں پناہ نے باوجود مہم بیجاپور پیش ہونے کے، شاہ عالم بہادر کو ابوالحسن کی سرکوبی اور اس

کے تباہ کرنے کے لئے روانہ فرمایا، خان جہاں بہادر ظفر جنگ جو بادشاہ زادہ محمد اعظم شاہ کے لشکر کو رسد پہنچانے کی غرض سے تھانہ ایندی میں فروکش تھا، شاہی حکم کے مطابق حضرت شاہ عالم بہادر کے ہمراہ حیدرآباد کی مہم پر روانہ ہوا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا انتیسواں سال

1096ھ/1686ء

اسی دوران کرامت نشان میں رمضان کا مقدس مہینہ جس میں نزول قرآن مجید کا آغاز ہوا ہے، اس عالم کے سر پر سایہ فگن ہوا، بادشاہ دیں پناہ نے تمام ماہ طاعت وعبادت الٰہی میں بسر فرمایا۔ قبلہء عالم نے بہی خواہاں دولت کو عطیات ونوازش سے سرفراز اور بدخواہاں ملک کو قہر وتنبیہ سے پامال فرمایا۔

سکندر جو یاوری بخت سے بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا تھا طرح طرح کی نوازش سے بہرہ اندوز ہوا، قبلہ عالم نے اس نووارد دربار کو خلعت وخنجر ودس ہزار روپے نقد کے انعام وعطیات سے سرفراز فرمایا۔

بیجاپور کی جنگ مورچال میں امان اللہ خاں پسر اللہ وردی خاں وفتح معمور خاں پسر دلیر خاں نے وفات پائی اور کمال الدین خاں پسر شیر خاں وفتح جنگ خاں میدان میں کام آئے۔

حسن علی خاں عالمگیر شاہی کو کمال الدین خاں کی وفات پر خلعت ماتمی ارسال فرمایا گیا۔

محمد اعظم شاہ کے بارود خانہ میں آگ

محمد اعظم شاہ کے بارود خانہ میں آگ لگی جس کی وجہ سے پانچ سو تھیلے اور بندوقچی ہلاک ہوئے، خان بہادر نواب فیروز جنگ احمد نگر سے خدمت والا میں حاضر ہوئے، قبلہء عالم نے خنجر دستہ شیر ماہی کمر مبارک سے کھول کر خان مذکور کو عطا فرمایا، نواب ممدوح الصدر کی نذر اپنے دست مبارک سے اٹھا کر قبول فرمائی۔

میر خاں دیواں سرکار محمد اعظم شاہ برہان پور کا نائب صوبہ دار مقرر فرمایا گیا، 4۔ شوال کو سکندر

خانی کے خطاب سے سرفراز ہوکر سہ ہزاری سہ ہزار سوار کے منصب پر فائز ہوا، ایرج خاں کی وفات پر حسین علی خاں صوبہ دار برابر مقرر ہوا، رضی الدین خان کو نائب صوبہ دار کی خدمت مرحمت ہوئی۔

لطف اللہ خاں حضرت شاہ عالم بہادر کی خدمت میں احکام شاہی لے کر روانہ ہوا اور اس کے بجائے سیادت خاں داروغہ عرض مکرر مقرر فرمایا گیا خواجہ حامد ولد قلیچ خاں کو خطاب و مادہ فیل مرحمت فرما کر ارشاد ہوا کہ خزانہ کے ہمراہ محمد اعظم شاہ کی خدمت میں روانہ ہو، 13- ذی قعدہ کو قلیچ خاں کو صوبہ داری ظفر آباد کا عہدہ مرحمت ہوا، قبلہء عالم نے اس امیر کو خلعت و زر و فیل کے عطیات سے سرفراز فرمایا، اصالت خاں و نجابت خاں پسران سید مظفر حیدر آبادی اور اکرام خاں و ناصر خاں و سید حسن خاں کو حکم ہوا کہ قلیچ خاں کے ہمراہ ظفر آباد روانہ ہوں۔

لشکر میں قحط مجلس شوریٰ سے مشورہ

شاہ عالی جاہ محمد اعظم شاہ کے لشکر میں قحط کی اطلاع جہاں پناہ کو ہوئی اور معلوم ہوا کہ ایک دانہء گندم پر انسان اپنی جان قربان کر رہے ہیں، گرانی غلہ کے علاوہ حریف سے روزانہ جنگ آزمائی ہو رہی ہے خواب و خور جو سرمایہ زندگی ہیں بالکل عنقا ہو رہے ہیں اور موت کا بازار گرم ہے قبلہء عالم نے شاہ عالیجاہ کو تحریر فرمایا کہ جب صورت حال یہ ہے تو بہتر ہے کہ بارگاہ شاہی کو واپس آ جائیں، بادشاہ زادہ نے فرمان شاہی کے ورود کے بعد مجلس شوریٰ منعقد کی اور امرائے کبار سے مشورہ طلب کیا، محمد اعظم شاہ سب سے پہلے حسن علی خاں بہادر عالم گیر شاہی سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ مہم کو انجام تک پہنچانا بندگان شاہی کی ہمت پر منحصر ہے بارگاہ جہاں پناہی سے اس مضمون کا فرمان صادر ہوا ہے، آپ حضرات تجربہ کار و نشیب و فراز زمانہ سے آگاہ و سرد و گرم روزگار کے ذائقہ سے آشنا ہیں اب صلح و جنگ، روانگی و قیام وغیرہ میں آپ صاحبوں کی کیا رائے ہے، حسن علی خاں نے عرض کیا کہ لشکر و ملازمین و فوج کی بہتری کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی مناسب ہے کہ فی الحال اس مہم سے کنارہ کشی کی جائے، عالی جاہ کا مہم سے دست بردار ہونا نیا واقعہ نہ ہوگا، حضرت فردوس آشیانی کے عہد معدلت میں بادشاہ زادہ مراد بخش بھی بلخ کی مہم میں یہ وجوہات چند محاصرہ سے دست بردار ہو کر حسب الحکم شاہی اعلیٰ حضرت کے حضور میں حاضر ہو گئے تھے خلق خدا پر جو مصیبت نازل ہے وہ ظاہر ہے، بارگاہ جہاں پناہی سے جو حکم صادر ہوا ہے وہ خود صاحب عالم کے

نام مرقوم ہے حسن علی خاں کے بعد دوسرے امراء کی نوبت آئی اور تمام حاضرین نے خان مذکور کی تائید کی۔

بادشاہ زادہ عالی جاہ نے فرمایا کہ آپ صاحب تو کہہ چکے ہیں، اب میری سنئے، محمد اعظم مع دو پسر و کے جب تک تن جان ہے اس میدان سے منہ نہ موڑے گا، اس کے بعد حضرت ولی نعمت معرکہ میں تشریف لاکر ہمارے مردہ اجسام کو پیوند خاک فرمائیں گے، رفقا کو قیام و روانگی کا اختیار ہے جو اپنے لئے مناسب خیال کریں عمل میں لائیں۔

امرائے دربار نے بادشاہ زادہ کی ہمت و جرأت دیکھ کر عرض کیا کہ ہماری جان آقا زادے پر قربان ہے جو مرضی مالک کی ہے وہی ہماری صلاح ہے سچ ہے کہ خداوندان ملک و ملت کے ارادے ایسے ہی بلند ہوا کرتے ہیں۔

رزق رسان مجازی قبلہء دین و دولت کو فرزند رشید کی حرات و عزم کی اطلاع ہوئی، اور قبلہء عالم نے 6- ذی قعدہ کو عمدہ امرائے دربار خان بہادر نواب فیروز جنگ کو بے شمار لشکر و فوج و ہزار ہا انبار غلہ کے ہمراہ اس مہم پر مامور فرمایا۔

جہاں پناہ نے حکم دیا کہ صدی و چہار صدی کے تمام حضوری و بیرونی منصب داروں کو داغ اسپ سوم و چہارم کی معافی عطا کی گئی، خدام حضور گھوڑوں کو داغ سے بری کر کے سرکار والا کی جانب خرید لیں اور اس قسم کے تمام نوخرید جانور بادشاہ زادہ عالی جاہ کے لشکر میں روانہ کر دیئے جائیں، تا کہ ان سواروں کو تقسیم کئے جائیں جن کے گھوڑے جنگ میں ضائع ہو گئے ہیں، قبلہء عالم نے نواب فیروز جنگ بہادر کو رخصت کے روز خلعت و نوازش ہا ہی مراتب و فیل بار برداری اور چار نشان مع چار شتر نشان بردار کے عطا فرمائے، نواب ممدوح الصدر کو اجازت قدم بوسی عطا ہوئی، اور جہاں پناہ نے دست مبارک امیر فرخندہ بخت کی پشت پر رکھا اور روانگی کی اجازت مرحمت فرمائی، خان بہادر نواب فیروز جنگ کے تمام ہمراہی بھی خلعت و اسپ کے عطیات و اضافہء مناصب کے انعام سے سرفراز فرمائے گئے۔

نواب فیروز جنگ بہادر جلد سے جلد بادشاہ زادہ کی خدمت میں پہنچ گئے اور بادشاہ رعایا نواز کے فضل و کرم سے درماندگان مصیبت نے بلا سے نجات پائی۔

بادشاہ زادہ عالی جاہ نے اس نو وارد لشکر کو حریف کی اس فوج کے مقابلہ میں متعین کیا جو قلعہ

سے باہر آ کر جنگ آزمائی میں مشغول تھی، نواب فیروز جنگ بہادر بیجاپور کے نواح میں رسول پور ایک مقام پر فروکش تھے، پیدنا یک نے چھ ہزار جنگی پیادے بیجاپوریوں کی امداد کے لئے روانہ کئے تھے یہ فوج رات کے وقت پوشیدہ سفر کی منزلیں طے کرتی تھی۔

نواب ممدوح الصدر کی فتح

غنیم کا لشکر نواب ممدوح الصدر کی فوج کو جو قلعہ کے قریب فروکش تھی، بیجاپوری دستہ سمجھ کر اس مقام پر وارد ہوا، جاسوسوں نے نواب فیروز جنگ بہادر کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور نواب ممدوح الصدر نے قبل اس کے کہ سپیدۂ صبح نمودار ہو اس گروہ پر حملہ کر کے حریف کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ ان میں ایک متنفس بھی زندہ نہ رہا اور غنیم کو بری طرح شکست ہوئی، نواب فیروز جنگ بہادر نے اعدا کے بریدہ سر بارگاہ جہاں پناہی میں روانہ کئے اور قبلہء عالم نے فرستادگان نواب ممدوح الصدر کو جو کل باسٹھ منصب تھے دو ہزار روپے بطور انعام مرحمت فرمائے، 22- ذی قعدہ کو اعتقاد خاں کو ایندی و نیز کنار دریائے بھیمرا کی تھانہ داری مرحمت ہوئی اور عطیہ خلعت کے بعد خدمت پر روانہ ہونے کی اجازت عطا ہوئی، اعتقاد خاں کے ہمراہیوں میں سید نوار الدھر بارہہ سیف خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا، اور دیگر اشخاص کو خلعت و اسپ و فیل مرحمت ہوئے، مرحمت خاں ظفر آباد اور حیدر آباد کے مابین یعنی مدگل کی تھانہ داری پر مامور ہوا، اور اس کے ہمراہی بھی خلعت و اسپ و فیل کے عطیات سے سرفراز ہوئے، بہار سنگھ گور نے اجین کے نواح میں فتنہ برپا کر رکھا تھا۔

ایک اور فتح

ملوک چند نائب و ملازم شاہ عالم بہادر بہار سنگھ گور کی تنبیہ کے لئے روانہ ہوا بہار سنگھ نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ملوک چند کا مقابلہ کیا شدید معرکہ آرائی کے بعد ایک تیر نے اس بد بخت باغی کا کام تمام کیا، ملوک چند نے فتح کی عرض داشت بارگاہ جہاں پناہی میں روانہ کی تمام اراکین دربار تسلیمات مبارک باد بجالائے، فضائل خاں جس نے سابق میں خفیہ نویس کے عریضہ کے مطابق اس واقعہ کی اطلاع دی تھی، اور عنایت اللہ وکیل جس نے ملوک چند کی عرض داشت بارگاہ والا میں پیش کی تھی اور عبدالحکیم ملازم بادشاہ زادہ تبہ کار باغی کا بریدہ سر بارگاہ میں لے کر

حاضر ہوا تھا خلعت کے عطیات سے سربلند فرمائے گئے، قبلہء عالم نے حکم دیا کہ بد بخت فتنہ پرداز کا سر بادشاہ زادہ کے حضور میں روانہ کر دیا جائے، ملوک چند کو رائے رایاں کا خطاب عطا ہوا اور اس کے منصب میں ہفت صدی سوار کا اضافہ فرمایا گیا۔

بادشاہ زادہ شاہ عالم بہادر کا حیدر آباد کو فتح کرنا

30-ذی قعدہ کو شاہ عالم بہادر و نواب خان جہاں بہادر کے عرائض سے معلوم ہوا کہ حیدر آباد فتح ہو گیا اور ابوالحسن والی تلنگانہ قلعہ گولکنڈہ میں پناہ گزیں ہے قبلہء عالم کو عرض داشت مذکور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابراہیم خاں سر لشکر خلیل اللہ خاں حیدر آبادی و محمد تقی و داؤد و شریف الملک و دیگر اراکین دولت حیدر آباد بادشاہ زادے کی خدمت میں حاضر ہوئے شاہ عالم بہادر نے ان حاضرین کو منصب عطا فرمانے کا معروضہ اور ابوالحسن دنیا دار حیدر آباد کی درخواست جس میں والی تلنگانہ نے بے حد عاجزی کے ساتھ عفو تقصیر کی درخواست کی تھی، میر ہاشم ملازم کے معرفت بارگاہ شاہی میں روانہ فرمائی، میر ہاشم فتح نامے کے ساتھ یہ درخواست بھی لے کر حضور میں حاضر ہوا اراکین دربار نے فتح کی مبارک باد عرض کی اور مرزا محمد حاجی المعروف بہ نعمت خاں پسر حکیم فتح الدین، عم حکیم محسن خاں نے تاریخ فتح نظم کر کے ملاحظہ عالی میں پیش کی، تاریخ مذکور مندرجہ ذیل ہے۔

نصرت بادشاہ غازی، گردید دل جہانیاں شاد، آمد بقلم حساب تاریخ، شد فتح بہ جنگ حیدر آباد 1097ھ (1687ء)

میر زا مذکور کو خلعت عنایت ہوا، بادشاہ زادہ شاہ عالم بہادر کے منصب میں اضافہ فرمایا گیا، اور شہزادۂ مذکور اصل و اضافہ کے اعتبار سے چہل ہزاری سے ہزار سوار کے امیر نامدار ہوئے، میر عبدالکریم معزول داروغہ جائے نماز خانہ کو حکم ہوا کہ خلعت و جواہر بادشاہ زادہ و دیگر شاہزادگان و سلاطین و خان جہاں بہادر و ابراہیم سر لشکر و نیز دیگر ہمراہیان شاہ عالم بہادر کے لئے ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔

محمد شفیع مشرف ڈیوڑھی والہ یار خاں مشرف قراولاں و میر ہاشم ملازم شاہ عالم بہادر و سید ابو محمد پسر منور خاں و کلیان پسر ہیرا معمار جداگانہ خدمات پر مامور ہو کر ایک ساتھ روانہ ہوئے۔

یہ قافلہ موضع منکاں میں جو حیدر آباد سے چار کوس کے فاصلہ پر واقع ہے پہنچا تھا کہ شیخ نظام

حیدر آبادی نے ایک عمدہ جمعیت کے ہمراہ ان پر حملہ کیا، ہر چند شاہی ملازمین کی تعداد کم تھی، لیکن اس میں سے ہر شخص شمشیر بکف ہو کر دشمن کے مقابلہ پر آیا، میر عبدالکریم زخم خوردہ گرفتار ہوا بقیہ سوار جنگ میں کام آئے، نجابت خاں واصالت خاں پسران سید مظفر جن کو قلیچ خاں نے ظفر آباد سے فوج شاہی کے ہمراہ کر دیا تھا، حریف سے جنگ آزمائی کے بعد سابقہ معرفت کی وجہ سے فرار ہو کر شیخ نظام سے جا ملے، ایک کثیر تعداد ہمراہیوں کی جو قافلے کے ساتھ بلاوجہ تلف ہوئے اور زر و جواہرات وخلعت غرض کہ تمام مرسلہ اشیاء پر دشمن نے قبضہ کر لیا۔

اس واقعہ کے چار روز بعد ابوالحسن کے ملازمین نے میر عبدالکریم کو گولکنڈہ سے شاہی لشکر میں پہنچا دیا اور خود علیحدہ ہو گئے، محمد شاہ مراد خاں حاجب کو اس امر کی اطلاع ہوئی، اور میر عبدالکریم کو اپنے مکان میں لے گیا چند روز میں مجروح کے زخم بھر گئے اور وہ بادشاہ زادہ شاہ عالم بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا، میر عبدالکریم نے تمام احکام جو قبلہء عالم نے زبانی اس سے فرمائے تھے بادشاہ زادے تک پہنچا دیئے، اور خان جہاں بہادر کے ہمراہ جو حسب الحکم آستانہء والا پر حاضر ہو رہا تھا روانہ ہوا۔

گیارہ ذی الحجہ کو بادشاہ زادۂ شاہ عالم بہادر کی تجویز کے مطابق جہاں پناہ نے امرائے دکن کو خطاب ومناصب کے عطیے سے سرفراز فرمایا، ابراہیم سر لشکر مہابت خاں کے خطاب سے شش ہزاری شش ہزار سوار کا منصب دار قرار پایا محمد شریف کو سہ ہزاری سے صد سوار و محمد تقی و محمد داؤد کو دو ہزاری سے صد سوار کے مناصب عطا ہوئے محمد داؤد کو اعتبار خاں کا خطاب عطا ہوا۔

پندرہ ذی الحجہ کو سرفراز خاں نے وفات پائی اور اس کے فرزند کو خلعت ماتمی مرحمت ہوا۔

نواب غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ دمدمہ بیجاپور سر ہو گیا، قبلہ عالم نے انگشتری زمرد سیادت خاں کو عطا کی کہ خان ممدوح الصدر کو پہنچا دے عمدۃ الملک اسد خاں کی والدہ نے تخت گاہ میں وفات پائی اور جہاں پناہ نے بائیس یوم کو خان مذکور کو خلعت ماتم عطا کیا۔

رحیم نے توران سے اور حاجی محمد رفیع خویش صف شکن خاں مرحوم ایران سے آستانہ والا پر حاضر ہو کر عطیہء خلعت سے سرفراز ہوئے، میرزا محمد خلف حاجی قاسم فتح نویس مصحف مجید کی کتابت کے لئے مونگی میں گیا ہوا تھا، حاضر ہوا، جہاں پناہ نے خوش نویس مذکور کو ایک ہزار روپے

بطور انعام مرحمت فرمائے۔

سیادت خاں داروغہ عرض مکرر و فاضل خاں بہادر کو سنگ لیشم کی دواتیں مرحمت ہوئیں۔

مختار خاں ترکش و کمان کے عطیہ سے سرفراز ہو کر ہیل سنگی کا تھانہ دار مقرر فرمایا گیا۔

7- سفر کو خاں جہاں بہادر حیدر آباد سے آستانہ والا پر حاضر ہوا اور جہاں پناہ خان مذکور کو خلعت عطا فرمایا سبحان قلی و دیگر نو اشخاص بھی جن کو خان جہاں بہادر اپنے ہمراہ لایا تھا خلعت کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے۔

14- صفر کو رشید خاں بعض محالات کے انتظام کے لئے مشرقی ہندوستان کی سمت روانہ ہوا، بختاور خاں کی حویلی جو تخت گاہ میں واقع تھی، سیادت خاں کو مرحمت فرمائی گئی، امیر خاں صوبہ دار کابل کے نام عطیہ خلعت خاصہ و اضافہ ہزاری ذات کا فرمان مبارک صادر ہوا، حاتم جو اس سے قبل رانا کا ملازم تھا، بھیم کی فوج داری پر متعین فرمایا گیا، برجو کھن قوام الدین خانی جو نو مسلم تھا، دین دار خاں کے خطاب سے موسوم ہوا اور اس شخص کو مشرقی جائے نماز خانہ کی خدمت عطا ہوئی۔

روشن رقم خاں کے تغیر سے خاکسار مئولف مشرف عرائض مقرر فرمایا گیا، قمر الدین خان بہادر حاضر حضور ہوئے تھے، قبلہء عالم نے خان ممدوح الصدر کو عطیہء فیل سے سرفراز فرما کر اجازت دی کہ اپنے پدر عالی قدر کی خدمت میں روانہ ہوں، جہاں پناہ نے خلعت و شمشیر ممدوح کے والد ماجد کے لئے روانہ فرمایا، احمد آقا شریف مکہ معظمہ کا ایلچی شرف ملازمت سے فیض یاب ہوا، قبلہ عالم نے سفیر مذکور کو دو ہزار روپے نقد مرحمت فرمائے۔

سولہ ربیع الاوّل کو مہابت خاں و شریف الملک آستانہء مقدس پر حاضر ہو کر شرف اندوز ہوئے خان کو خلعت خاص و شمشیر با ساز طلاء اور اکتالیس گھوڑے اور ایک ہاتھی اور پچاس ہزار روپے نقد مرحمت ہوئے، شریف الملک کو خلعت و خنجر و دستہء بلوریں اور دس ہزار روپیہ نقد اور سات تولے عطر ہوا، اس کے فرزند ہدایت اللہ و عنایت اللہ بھی عطیہء خلعت سے سرفراز فرمائے گئے۔

عبد القادر دکھنی کو دو ہزاری و ہزار سوار کا منصب اور ایک فیل مرحمت ہوا۔

اچلا جی خویش سیوا جی

اچلا جی خویش سیوا جی رونر ملازمت پنج ہزاری دو ہزار کے منصب و نقارہ و علم مرصع و فیل کے

عطیات سے ہم چشموں میں سربلند ہوا۔

صف شکن خاں داروغہ توپ خانہ بیجاپور سے حاضر حضور ہوا، قبلہ عالم نے خان مذکور کو خنجر و فیل کے عطیات سے سرفراز فرما کر واپسی کی اجازت مرحمت فرمائی۔

یلنگتوش خاں کی برطرفی

یلنگ توش خاں بہادر بدنصیبی سے خدمت سے برطرف کیا گیا، اور اس کا منصب ضبط فرمایا گیا۔

یلنگ توش خاں کے تغیر سے سلاح کاں پسر وزیر خاں شاہ جہانی کو انور خاں کا خطاب و داروغگی خواصاں کی خدمت عطا ہوئی۔

سلاح خاں کے بجائے سہراب خاں میر توزک مقرر فرمایا گیا۔

20- ربیع الثانی کو خان جہاں بہادر پرستار خاص اورنگ آبادی محل کو لانے کے لئے برہان پور روانہ ہوا، قبلہ عالم نے خان مذکور کو خنجر مرصع با پھول کٹارہ اور علاقہ مروارید دست خاص سے مرحمت فرمائے۔

اورنگ آبادی محل کے لئے سمرنی زمرد خاں بہادر کی معرفت روانہ فرمائی گئی۔

پسر خاں جہاں اور روح اللہ خاں نے باہم ایک دوسرے کو سر پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔

آداب سلام میں تبدیلی

فرمان مبارک صادر ہوا کہ آئندہ سے کوئی شخص حضور میں حاضر ہو کر ایسا نہ کرے اور اگر اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو غسل خانہ مبارک میں قدم نہ رکھے، میر جلال الدین (عبدالعزیز خاں والی بخارا کا ملازم جو مکہ معظمہ کی زیارت سے مشرف ہو کر آستانہ والا پر حاضری کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اسی متبرک مقام میں فوت ہوا) بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔

قبلہ عالم نے میر مذکور کو خلعت و خنجر دستہ طلا اور ایک ہزار روپیہ کے عطیات سے دل شاد فرمایا۔

ہدایت اللہ پسر شریف خاں اپنے والد کے فوت ہونے کے بعد حضور میں حاضر اور خلعت

ماتمی کے عطیہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

یکم جمادی الاوّل کو ابوالحسن دنیادار حیدرآباد کا ایک عزیز قریب مسمی زین العابدین سعادت آستانہ بوسی سے معزز ومکرم ہوا اس شخص نے مادنا برہمن کا سر جو ابوالحسن کی فتنہ پردازی کا اصل سبب تھا، قلم کر کے شاہ عالم بہادر کی خدمت میں روانہ کیا، بادشاہ زادۂ مذکور نے مقتول کا سر بہادر علی خاں کی معرفت حضور میں روانہ کیا۔

حمید الدین خاں فوجدار پٹن حصار قندھار کا قلعہ دار مقرر فرمایا گیا۔

رستم بیگ معزول حضور میں حاضر ہوا۔

جہاں پناہ نے حافظ محمد امین خاں مرحوم کی حویلی واقع دارالحکومت مہابت خاں کو مرحمت فرمائی۔

سید انور خاں کے انتقال سے سید زین العابدین کو شولا پور کی فوج داری وقلعہ داری مرحمت ہوئی۔

مختار خاں کو خنجر مرصع کے عطیہ سے سرفراز فرما کر بیجاپور روانہ ہونے کی اجازت مرحمت ہوئی۔

بخت بلند کو دیوگڑھ و اسلام گڑھ کی جاگیر وخلعت و آریسی و اسپ کے عطیات مرحمت ہوئے۔

بہار سنگھ کے لڑکوں کے سر

بلند افضال بادشاہ زادہ محمد اعظم شاہ کا ملازم رائے رایاں ملوک چند کے فرستادہ سر لے کر بارگاہ عالی میں حاضر ہوا، یہ سر بہار سنگھ کے فرزندوں کے تھے، جو حضور میں پیش ہوئے، قبلہء عالم نے بلند افضال کو خلعت عطا فرمایا، اور حکم دیا کہ سر، شاہ والا جاہ کی خدمت میں پہنچائے۔

فضائل خاں کے آوردے ابجاجی ونکوجی خلعت دوفیل کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے۔

رائے رایاں ملوک چند نے وفات پائی، اور اس کے بجائے بہرہ ور خاں کو صوبہء مالوہ کی نیابت عطا ہوئی۔

پرستار خاں اورنگ آبادی پائے تخت سے تشریف لائیں اور 17- جمادی الآخر کو حرم سرائے شاہی میں پہنچ گئیں، بادشاہ زادہ محمد کام بخش دروازہ قلعہ تک جو ڈیوڑھی کی سمت واقع ہے استقبال

کے لئے تشریف لے گئے۔

خان جہاں بہادر نے شرف قدم بوسی حاصل کیا جہاں پناہ نے خان مذکور اس کے بیٹوں اور سید منور خاں کو خلعت عطا فرمائے۔

ہمت خاں پسر کلاں خان جہاں کو خلعت و فیل عطا ہوئے، اور حکم ہوا کہ بیجاپور روانہ ہو۔

جسونت سنگھ بندیلہ کو خلعت و فیل مرحمت ہوا۔

فاضل بیگ برادر بادشاہ قلی خاں باغی کو تہور خاں کا خطاب مرحمت ہوا اور خان مذکور کی جمعیت میں متعین فرمایا گیا۔

سید مبارک خاں قلعہ دار دولت آباد کو مرتضٰی خاں کا خطاب مرحمت ہوا، مرحمت خاں بیجاپور کا خزانہ روانہ کرنے کے لئے مقرر فرمایا گیا۔

نہچل کے دو فرزندوں کا اسلام قبول کرنا

فاضل خاں کے منشی رام رائے کے برادر مسمی نہچل کے دو فرزندوں کو خواجہ عبدالرحیم نصف شب کے وقت حضور میں لے آیا۔

ہر دو شخص مشرف بہ اسلام ہوئے ایک سعادت اللہ اور دوسرا سعد اللہ کے نام سے مشہور ہوا۔

دوسرے روز کے آخر حصہ میں خواجہ عبدالرحیم نے ہر دو مسلم افراد کو ہاتھی پر بٹھایا اور حسب الحکم ان کی سواری کے آگے نقارہ بجاتا ہوا تمام شہر میں پھرا اور اس طرح ان کے اسلام لانے کا اعلان کیا۔

29- تاریخ خان جہاں بہادر مفسدان ہندوستان کی سرکوبی کے لئے روانہ فرمایا گیا، قبلہء عالم نے خان جہاں کو خلعت خاصہ و شمشیر مرصع و اسپ با ساز طلا و فیل و دو کردر دام بطور انعام مرحمت فرما کر اکبرآباد کی سمت جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

ہمت خاں کے سوا دیگر پسر و نیز منور خاں بھی عطیہء خلعت سے بہرہ اندوز ہو کر خان مذکور کے ہمراہ روانہ ہوئے۔

عبدالعزیز خاں قلعہ دار خیبر نے وفات پائی اور اس کا فرزند اپنے باپ کا جانشین مقرر فرمایا گیا۔

وسعت ترقی پذیر ہے اور خدام سلطنت اپنے آقائے عادل کی مرضی کے مطابق قلعہ کشائی میں مصروف اور اپنے ارادوں میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

بیجاپور کے مختصر حالات

سکندر عادل دنیادار بیجاپور کے مقدمہ میں مرتبہء فرمانروائی نہ تھا، سکندر کے اراکین دربار یعنی سیدی مسعود وعبدالرؤف وغیرہ نے اس کو شاہ شطرنج بنا رکھا تھا ان امراء میں خودسری وخودرائی کا اس قدر مادہ موجود تھا کہ باہم دگر بھی نفاق وریا سے کام لیتے تھے، سکندر عادل شہر سے باہر قدم نہ نکال سکتا تھا، اہل شہر والی ملک کی ناہنجاری وبدکرداری سے بے حد آزردہ تھے، سکندر عادل سنبھاجی کے قابو میں آ گیا تھا، اور اس کی رائے ومشورہ کے مطابق برابر سرکشی کر رہا تھا، عادل شاہ اس مرہٹہ سردار سے اس قدر مغلوب ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں بھی اس کا شریک کار بنا ہوا تھا اور حصار بیجاپور کو قلعہ کی حفاظت سمجھ کر بادشاہ عالم کے مقابلہ میں سرکشی کر رہا تھا، اس کو اس امر کی خبر نہ تھی کہ صاحب اقبال سے دست وگریباں ہونا ادبار کو سر پر چھپانے کی دعوت دیتا ہے اور تقدیر سے جنگ آزمائی کرنا اپنی عزت کو خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنا ہے۔

غرض کہ مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر بادشاہ عالم نے حصار بیجاپور کی تسخیر پر کمر ہمت باندھی۔

ایک روز حضرت شیخ محمد نقش بندی سرہندی رحمتہ اللہ علیہ بادشاہ دیں پناہ کی ملاقات کے لئے آئے حضرت شیخ نے دوران گفتگو میں قبلہ عالم سے عرض کیا کہ فقیر نے سنا ہے کہ حضرت شاہ بیجاپور تشریف لے جا رہے ہیں قبلہء عالم نے جواب دیا کہ ہم سلاطین دنیا حصول نام کے شیفتہ و فریفتہ ہیں میری تمنا یہ تھی کہ یہ نام آوری میرے کسی فرزند کو نصیب ہو، لیکن ایسا نہ ہوا اب میں خود جاتا ہوں دیکھوں کہ یہ دیوار حصول مقصد میں کس طرح حائل ہے جو کسی طرح زمین کے برابر نہیں ہوتی مختصر یہ کہ جہاں پناہ 2- شعبان کو شولاپور سے بیجاپور روانہ ہوا۔

14- شعبان کو بادشاہ زادہ عالی جاہ وشاہزادہ بیدار بخت شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوئے۔

بہادر خاں وراؤ انوپ سنگھ ولد راؤ کرن کو خلعت ملازمت عطا ہوئے، 21- تاریخ خان بہادر نواب فیروز جنگ لشکر شاہی کے پہنچنے پر رسول پور میں جو بیجاپور سے تین کوس کے فاصلہ پر

جاں سپار خاں فوج دار ظفر آباد حضور میں حاضر ہوا تھا، اپنے مستقر پر روانہ ہوا، خدمت خاں کے تغیر سے فاضل خاں میر منشی وصدر داروغہ عرائض مقرر فرمایا گیا۔

میر حسن ولد روح اللہ خاں نے امیر خاں کی دختر سے عقد کیا، قبلہء عالم نے نوشہ کو خلعت و اسپ با ساز طلا کے عطیات سے شاد کام فرمایا۔

خدمت خاں کے تغیر سے اہتمام خاں حرم سرائے شاہی کی خدمت نظارت پر سرفراز فرمایا گیا۔

بہرہ مند خاں تھانہ ایندی کو روانہ ہوا اور اس کا نائب محمد مطلب بہرہ مند خان کا قائم مقام مقرر فرمایا گیا۔

بادشاہ زادہ شاہ عالم بہادر 25- رجب کو حاضر حضور ہوئے قبلہء عالم نے شاہزادہ کو خلعت با گوش پیچ پہنچی مرصع عطا فرمائی تمام شاہزادوں اور بادشاہزادوں کو خلعت عطا ہوئے۔

شاہ عالم کی سالگرہ

حضرت شاہ عالم کو ان کی سالگرہ یعنی 30- رجب کو اربسی نگین لعل قیمتی چالیس ہزار مرحمت ہوئی۔

مومن خاں حضرت شاہ عالم کا ملازم ابوالحسن کے ایک سو ہاتھی لے کر بارگاہ عالی میں حاضر ہوا۔

محمد معصوم ابوالحسن کے حاجب کو خلعت مرحمت ہوا، قلیچ خاں ظفر آباد سے حاضر ہو کر سعادت ملازمت سے بہرہ اندوز ہوئے۔

سیف اللہ خاں کے انتقال کی وجہ سے محمد مطلب کو خدمت میر توزک عطا ہوئی، محکم سنگھ چندراوت اپنے وطن سے بارگاہ عالی میں حاضر ہوا، قبلہء عالم نے چندراوت کو خلعت عطا فرمایا۔

جہاں پناہ کا شولاپور سے قلعہ بیجاپور کی طرف روانہ ہونا

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے اپنے فضل و کرم سے عظیم الشان فتوح عطا فرمائے ہیں اور روزانہ ایک نئی اقلیم ممالک محروسہ میں داخل ہو رہی ہے، بادشاہ دین و دولت کے دائرہ حکمرانی کی

واقع ہے آستانہ ءشاہی پر حاضر ہوئے، جہاں پناہ نے خان والا شان کو تیس ہزار روپے نقد اور دو عدد گھوڑے قیمتی نو ہزار و فیل با ساز طلا و خلعت خاصہ کے عطیہ و انعام سے سرفراز فرما کر بجائے شاہزادہ بیدار بخت کے روانگی کا حکم دیا، نواب عالی منزلت قمرالدین خاں بہادر فرزند رشید خاں ممدوح الصدر کو خنجر مرصع با علاقہ ءمروارید مرحمت ہوا، 22- شعبان کو جہاں پناہ نے حکم دیا کہ حصار کے مقابلہ میں توپیں نصب کر کے برج و بارہ کو خاک زمین کے برابر کریں۔